(معنویت کی بازیافت)

مرتب

ڈاکٹر شباب الدین

صدر شعبۂ اردو

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج

اعظم گڑھ، یو پی

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

علامہ شبلی نعمانی

(معنویت کی بازیافت)

مرتب

ڈاکٹر شباب الدین

صدر شعبہ اردو

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ (یوپی)

ALLAMA SHIBLI NOMANI

(MANVIYAT KI BAZYAFT)

نام کتاب	:	علامہ شبلی نعمانی (معنویت کی بازیافت)
مرتب	:	ڈاکٹر شباب الدین
سنہ اشاعت	:	۲۰۰۸ء
تعداد	:	۵۰۰
صفحات	:	۳۹۹
کمپوزنگ	:	معروفی کمپیوٹر، اعظم گڑھ۔ 9889036799 موبائل
طباعت	:	پرنٹ آرٹ، دہلی
قیمت	:	Rs. 300/=

تقسیم کار

- شعبۂ اردو، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
- فلاحی بکڈپو، مسافر خانہ روڈ، تکیہ، اعظم گڑھ
- البلاغ پبلیکیشنز، این۔۱، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
- شمیم بک ڈپو، نزد پولیس چوکی، سرائے میر، اعظم گڑھ
- فہیم بکڈپو، ریحان مارکیٹ، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن

انتساب

کالج کے عزیز طلبہ

کے

نام

خدا رکھے، انھیں سے ظلمتوں میں کچھ اجالے ہیں

•••

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

شبلی

ооо

ترتیب

پیش گفتار

۲۰۰۷ء علامہ شبلی کا ایک سو پچاسواں سال ولادت تھا، موقع کی مناسبت سے شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج نے اپنے عالی مرتبت بانی کی علمی وادبی خدمات کا نئے سرے سے معروضی انداز میں جائزہ لینے کے لئے ۲۴ر۲۵ر فروری ۲۰۰۷ء کو ایک دوروزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا، خوشی کی بات یہ تھی کہ اس سمینار میں پاکستانی اور ایرانی مندوبین نے بھی شرکت کی، لیکن افسوس ہے کہ ابھی اس خوشی کا خمار اترا بھی نہ تھا کہ ہمارے تین معزز مندوب دارِ جاودانی کو کوچ کر گئے، اس میں سے پہلا اور سنگین ترین سانحہ دارالمصنّفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی کے انتقال کا ہے، حج سے واپسی کے بعد مع اہلیہ سرائے میر رشتہ داروں سے ملنے جارہے تھے کہ کار حادثہ کا شکار ہوگئی، زخم شدید تھا جس نے ۲ر فروری ۲۰۰۸ء کو ان کا چراغ زندگی گل کر دیا۔ اسی سلسلہ کا دوسرا حادثہ پروفیسر افغان اللہ خاں کا سانحۂ ارتحال ہے، یکم مارچ ۲۰۰۸ء کو دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ سمینار میں ان پر اتنا شدید قلبی دورہ پڑا کہ طبی امداد بھی بہم نہ پہنچائی جاسکی۔ ہمارے پاکستانی مندوب پروفیسر صابر کلوروی کا ۲۲ر مارچ ۲۰۰۸ء کو اچانک انتقال ہوگیا، انھوں نے اپنا مقالہ ''شبلی کی تنقید نگاری'' کے عنوان سے پڑھا تھا، قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اپنے مقالے کو چھپا ہوا دیکھ سکیں، ہم دست بہ دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ان تینوں مقالہ نگاروں کی بشری کمزوریوں کو معاف فرمائے اور ان سب کو اعلیٰ مراتب سے نوازے۔ آمین۔

اس دوروزہ سمینار میں بڑے اہم اور گراں قدر مقالے پیش کئے گئے اور ان پر کھل کر بحث بھی ہوئی، تمام مقالوں کو سننے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس مشک کو جتنی بار رگڑا جائے اس کی خوشبو اتنی ہی دوبالا ہوجاتی ہے، علامہ شبلی کے اختیار کردہ جن موضوعات پر مستقل کتابیں لکھی جاچکی ہیں ان پر بھی سمینار کے مقالہ نگاروں نے کوئی نہ کوئی نیا اور چونکا دینے والا پہلو ضرور نکال لیا ہے، ہمارے لئے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم ہر مقالہ کا شرح وبسط کے ساتھ تجزیہ کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور کمیوں کی نشاندہی کریں، اگر ایسا کیا جائے گا تو زیر نظر کتاب کی ضخامت دوگنی ہوجائے گی اور قارئین کا ذوق

تجسس بھی ماند پڑ جائے گا، تاہم سمینار میں پڑھے جانے والے مقالوں میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی طرف خصوصی توجہ دلانا اور اپنے خیالات کا بھی اظہار کر دینا مناسب ہی نہیں ضروری بھی معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہم پاکستانی مندوبین کے مقالوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، ان مقالہ نگاروں کا ایک مشترک وصف یہ ہے کہ یہ سب کے سب تقسیم ہند کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور منقسم ہندوستان کے کسی صوبے سے جا کر پاکستان میں آباد نہیں ہوئے ہیں، اس کی وجہ سے شبلی شناسی کے موضوع پر ہمارے اور پاکستانی ناقدین کے نقطۂ نظر میں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے جس کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ اس بات کی خوشی ضرور ہے کہ تمام پاکستانی مندوبین نے علامہ شبلی کا مطالعہ احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمدردانہ انداز سے کیا ہے اور ان کے کسی بیان میں کوئی جارحیت نظر نہیں آتی۔

پروفیسر صابر کلوروی نے شبلی کی تنقید نگاری کو اپنے مطالعہ کا ہدف بنایا ہے، ان کے مقالہ کا خلاصہ ان کے درج ذیل جملوں میں آ گیا ہے:

> ''شبلی کے نقادوں میں بیشتر وہ لوگ ہیں جن کے دماغ انگریزی لال ٹینوں کی بدولت روشن ہیں، گذشتہ سو برسوں میں علوم وفنون میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی بدولت تنقید میں بھی مغربی تصورات داخل ہو گئے ہیں، ایسے میں یہ توقع رکھنا کہ شبلی کی تنقید جدید مغربی تصورات سے بھی معمور ہونی چاہئے تھی، درست مطالبہ نہیں ہے، ان نقادوں میں احسن فاروقی اور کلیم الدین احمد بھی شامل ہیں، وہی کلیم الدین احمد جو اپنے باپ عظیم الدین احمد کو اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں، ایسے نقادوں کی رائے اور بصیرت پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے۔''

واحد پاکستانی خاتون مندوب ڈاکٹر رابعہ سرفراز (لکچرر، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد) نے علامہ شبلی کی اردو شاعری پر اظہار خیال فرمایا ہے، ان کے مقالے کا لب لباب ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''مولانا شبلی کی شاعری ان کے نثری خدمات کے مقابلے میں دبی رہی اور کم کم

زیر جائزہ رہی، بہت سے ناقدین نے تو اسے ان کی نثر کے مقابلے میں درخور توجہ ہی نہیں سمجھا، چند ایک نے اس پر گفتگو بھی کی تو سرسری انداز میں، آج ایک صدی گزرنے کے بعد شبلی کی شاعری کا مطالعہ ان کے شعری سرمائے کو کیا اعتبار بخشتا ہے؟ اس سوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے ان کی اردو شاعری کا مطالعہ کیا، یہ ایک صدی جوان کی شاعری میں زندہ عناصر اور میرے طالب علمانہ مطالعے کے درمیان پھیلی ہوئی ہے کم سے کم اردو کی تین نسلوں کے تاثرات پر مشتمل ہے، ان تاثرات میں مولانا شبلی کے حوالے سے معاندانہ جذبات کا عمل دخل بھی بہ آسانی نظر آتا ہے۔ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی کچھ ناقدین شبلی کی شعری حیثیت کو ان کی کردار کشی کے لئے موضوع بحث بنائے ہوئے ہیں، یہ مختصر مطالعہ شبلی کی اردو شاعری میں ان زندہ عناصر کی تلاش ہے جو ان کے سچے تخلیقی جوہر کے آئینہ دار ہیں اور ایک صدی گزرنے کے بعد جن کی لو مطالعۂ شعر کے نئے قارئین کو متاثر کرتی ہے، فن جس کی تخلیق کے لئے اخلاص کو اساس کا درجہ حاصل ہے، اس اثاثۂ شعر کا حسن ہے اور اسی سبب اس میں تاثیر آج بھی............ایک صدی گزرنے کے بعد............موجود ہے، شبلی کا یہ حصۂ شعر دو بنیادی جذباتی دھاروں سے عبارت ہے، ایک دھارا ان کے ملی جذبات سے پھوٹتا ہے اور دوسرا ان کی ذاتی وقلبی واردات کا آئینہ دار ہے۔''

تیسرے پاکستانی مندوب ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد سے تشریف لائے تھے، انھوں نے اپنے مقالہ کا موضوع ''عہد جدید میں شبلی نعمانی کی معنویت'' منتخب کیا تھا، ہم ان کے مضمون کا خلاصہ اگر ان ہی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو ان کے یہ جملے نقل کر دینے کافی ہوں گے:

''شبلی نعمانی کے فکر و فرہنگ کا ہر زاویہ اپنی خیال افروز صداقت احساس سے منعکس ہوتا ہے، وہ شعر کہہ رہے ہوں، یا نثر میں محو کلام ہوں، ان کے ہاں حقائق کی دنیا............ تخیل کی افسانوی فضا سے متاثر نہیں ہوتی، لیکن حقائق کی ترسیل اور ابلاغ کا جو قرینہ وہ اختیار کرتے ہیں، وہ خاص طور پر ان ہی سے مخصوص ہے............اگر ان کے تمام فکری اور ادبی آثار سے ایک کا انتخاب کریں، جو ان کی معنوی اور فکری رعنائی کا ترجمان بھی ہے

اور جس کی بدولت ان کی معنویت ہر دور میں موجود بھی ہے تو وہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے .... اور سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو فکر اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی رعنائی خیال کو خیال حسن کی تعبیر کا قرینہ عطا کرتا ہے اور یہی قرینہ ان کی معنویت کی دلیل بھی ہے اور ان کی تازگی اور توانائی پر گواہ بھی۔''

چوتھے مندوب پروفیسر ریاض مجید صاحب تھے، جنھوں نے علامہ شبلی کی مشہور نظم '' حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک'' کا تجزیہ کرتے ہوئے موجودہ سیاسی حالات پر اس طرح منطبق کیا تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ علامہ شبلی نے انھیں حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نظم تحریر کی تھی، پروفیسر ریاض مجید کے انداز تجزیہ نے علامہ شبلی کی فکر کے'' پیمبرانہ رخ'' کو اس طرح واضح کیا تھا کہ خود ان کے انداز نظر کا حسن ابھر کر سامنے آ گیا تھا، افسوس ہے کہ ہماری متعدد درخواست کے باوجود انھوں نے اپنا مقالہ ارسال نہیں کیا اور یہ کتاب ان کے مقالے کے بغیر شائع ہو رہی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی کتابوں میں'' سوانح مولانا روم'' کو بھاری پتھر گردانتے ہوئے چوم کر چھوڑ دیا گیا ہے، اس کتاب کا مطالعہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم اپنے طویل مقالے'' علامہ شبلی کے بعض جاوداں کارنامے'' میں پیش کیا ہے جو اس لحاظ سے انتہائی اہم ہے کہ شاید یہ ان کی حیات مستعار کا آخری مقالہ ہو، اس مقالے میں علامہ شبلی کے افکار و خیالات کی تلخیص بہت سہل اور آسان انداز میں پیش کر کے ضیاء الدین صاحب نے علامہ شبلی کی اس اولیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا اصلاً شاعر نہیں بلکہ علم کلام کے ماہر اور اسلامی اقدار کے شارح اور مبلغ تھے۔

اس کتاب میں'' سوانح مولانا روم'' پر ایک اور مقالہ شامل ہے جو پروفیسر کبیر احمد جائسی کا تحریر کردہ ہے شبلی سمینار کے ایرانی مندوب رجب نژاد صاحب کی موجودگی کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے جائسی صاحب نے اپنا مقالہ فارسی زبان میں لکھا تھا جو شعر العجم کی موجودہ عہد میں معنویت پر تھا، چوں کہ رجب نژاد صاحب افتتاحی اجلاس کے بعد اعظم گڑھ سے چلے گئے اس لئے جائسی صاحب نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنے مقالے کا خلاصہ اردو میں بیان کر دیں، ہماری خواہش تھی کہ وہ اپنے فارسی مقالے کو اردو میں منتقل کر دیں، مگر وہ اس کام کو انجام نہ دے سکے اور انھوں نے سوانح مولانا روم پر ایک مختصر سا نوٹ لکھ کر ارسال فرما دیا، ہم شکریے کے ساتھ اس کو نہ صرف قبول کر رہے

ہیں بلکہ اس کتاب میں شائع بھی کرر ہے ہیں، اس مضمون کا مطالعہ خاص طور سے طالب علموں کے لئے مفید ہے، اس کو پڑھ کر ان کو اندازہ ہو جائے گا کہ ایجاز واختصار کس کو کہتے ہیں؟ اور کس طرح طول طویل بات کو چند جملوں میں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ہر پہلو بیان بھی ہو جائے اور طول بیانی بھی نہ آئے، علامہ شبلی کی تحریروں کا ایک وصف ایجاز واختصار بھی قرار دیا گیا ہے جس کو مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی اپنی تحروں میں برقرار رکھا، پھر اطناب کا دور آیا اور صرف تمہید ہی پچاس پچاس صفحات کی لکھی جانے لگی، معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے متبعین پھر ایجاز و اختصار کی طرف لوٹ رہے ہیں، جس کی مثال پروفیسر کبیر احمد جائسی کا ''سوانح مولانا روم'' پر یہ مضمون ہے۔

پروفیسر عبدالحق صاحب ہر موقع پر ہماری حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں اور رہنمائی بھی، چاہے سمینار کا انعقاد ہو یا توسیعی خطبہ یا پھر زبانی امتحانات، ہماری ہر گزارش کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اپنی شرکت سے ہم کو ذہنی آسودگی بھی فراہم کرتے ہیں، ان کا مقالہ ''شبلی کی انتقادی فکر کا ثقافتی مطالعہ'' بڑی اہمیت کا حامل ہے، عبدالحق صاحب فکر وفن کی صداقتوں کو ادبی لطافتوں کے ساتھ پیش کرنے کی زبردست مہارت بھی رکھتے ہیں اور فکر ومعنی کے نئے پس منظر میں ادب کے نئے گوشوں کو بے نقاب کرنے والی تنقیدی نظر بھی، ان کے اس مقالے کی اصل روح ان کے ان الفاظ میں جلوہ گر ہے جو انھوں نے شبلی کے اس جملے ''شعر اگر چہ غیر مادی چیز ہے، لیکن وہ مادیت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔'' کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے، فرماتے ہیں:

> ''ان کی انتقادی فکر میں اسے ایک خاص معنویت حاصل ہے، جس کے تجزیہ میں ان کی انتقادی بصیرت کارفرما ہے، اس مسلمہ کلیہ کا اعتراف شبلی کی حیرت خیز مثال ہے، یہ وہ زمانہ ہے کہ مارکسی طرز تنقید سے مشرق متعارف بھی تھا اور نہ ہی انقلاب روس کی پیشن گوئی سامنے تھی، مادیت کی بنیاد پر تخلیق کا متاثر ہونا تنقید کی دنیا میں پیغمبرانہ بشارت تھی، جو شبلی جیسے عبقری کی تحریر یا صریر خامہ سے سنی گئی۔

شبلی کے بعد خیال اور مادے کے مباحث شروع ہوتے ہیں اور ایک مکتب فکر کی حیثیت سے ادب وانتقاد میں متعارف ہوتے ہیں اور اس کی اساس پر تنقیدی دبستان کی

پرشکوہ عمارت تیار کی جاتی ہے۔شبلی عالم دین تھے اور روحانیت کے قائل مگر مادے کے بھی
حامل تھے، مادے سے خیال کا پیدا ہونا قانون فطرت ہے، مرئی اشیاء ہی تخلیقات کی بے
کرانی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔شبلی نے جگہ جگہ فن کے مادی متعلقات پر بحث کی ہے،
فن کی اس تخلیقی دروں بینی میں شبلی کو دیدہ وری حاصل ہے، یہی ژرف نگاہی ان کے انتقادی
افکار و آرا کو دوش و امروز سے الگ فردائے فن کی نقد ستانی کے لئے ہمہ گیر اصول فراہم کرتی
ہے،اس موہوب شرف پر خود شبلی کو حیرت ہے۔''

دارالمصنفین کے رفیق مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب کا مقالہ ''شبلی کی معنویت'' مختصر
مگر فکر انگیز اور ان کے وسعت مطالعہ کا نچوڑ ہے، انھوں نے اپنے اس مقالہ میں شبلی کی کثیر الجہات
شخصیت اور کارناموں کے حوالے سے عصر حاضر میں علامہ شبلی کے موثرات کا جائزہ لیا ہے اور اس
نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''شبلی کی ہر تحریر اور ہر قول و عمل کو اگر وہ معنویت حاصل ہوئی ہے جس کے اثرات کا
اندازہ کل سے پڑھے جانے والے مقالات سے ہوتا ہے تو یہ کہنا حق بجانب ہے کہ گذشتہ صدی کی
اسلامی دنیا پر صرف اور صرف علامہ شبلی کے اثرات کی عملداری ہے، ابوالکلام آزاد ہوں، محمد علی
جوہر ہوں، سید سلیمان ندوی اور ان کا دارالمصنفین ہو یا مولانا مودودی اور مولانا علی میاں ہوں،
گذشتہ صدی کے ہر سنگ میل پر شبلی موجود ہیں، ان کی معنویت نے خود کو عملاً ثابت کیا ہے اور آج
بھی ضرورت اسی معنویت کی اہمیت کو تسلیم کرنے کی ہے۔'' پروفیسر فضل امام رضوی نے اپنا مقالہ
''علامہ شبلی اور عملی تنقید کے مطالبات'' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، اس مقالہ میں موازنۂ انیس
و دبیر کی روشنی میں علامہ شبلی کے تنقیدی رویے کا جائزہ لیا گیا ہے، موازنہ علامہ شبلی کی وہ تنقیدی کتاب
ہے جس کے منظر عام پر آتے ہی ادبی دنیا میں شدید ردعمل ظاہر کیا گیا اور اس کے جواب میں کتابوں
اور مقالوں کی اشاعت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے، اس موضوع پر کوئی نئی بات کہنا
آسان نہیں ہے، لیکن فضل امام صاحب کی کاوش فکر و نظر نے موضوع زیر بحث کا محاکمہ نئے انداز
سے کیا ہے اور علامہ شبلی کی اس گراں قدر تصنیف کو عملی انتقادیات کے سفر میں پہلا قدم قرار دیا ہے۔

ہمارے مخلص دوست مشہور و معروف ادیب شمیم طارق صاحب نے اپنی تصنیفی زندگی کی
ابتدا صحافت سے کی اور برسوں کرنجیا کے مشہور اخبار بلٹز (اردو) میں لکھتے رہے، وہاں سے جب

جرأت و بے باکی کا سبق لے کر تصنیف و تالیف کے میدان میں آئے تو اسی جرأت و بے باکی سے مصنف کے فرائض ادا کرنے لگے، اس بات کی شاہد ان کی تصانیف ہیں، انھوں نے ''شبلی کی عصری معنویت'' کے عنوان سے اپنا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے، یہ مقالہ اس لحاظ سے اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی بات کی ابتدا اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور شاعر مصحفی کے ذکر خیر سے کی ہے، ان کا یہ جملہ مصحفی کی بازیافت کی شاہ کلید ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ غور و فکر اور ہمدردی سے مصحفی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے، شمیم طارق صاحب نے لکھا ہے ''مصحفی ہی وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنے تمام پیش رووں اور ہم عصروں کے مقابلے فرنگی استعمار کے خلاف زیادہ قوت و شدت سے آواز بلند کی۔'' مصحفی کے عہد حیات کے سیاسی حالات سے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ وہ عہد شبلی تک آ جاتے ہیں اور اپنے مضمون کے اصل راز ہائے سربستہ کھولنا شروع کر دیتے ہیں، ان کے یہ چند جملے بار بار پڑھنے کے لائق ہیں:

''آج پھر مسلمانوں کے مذہب و طریقہ تعلیم، تاریخ و ادب اور عورتوں کی تعلیم کے بارے میں غیر متوازن باتیں کہی جا رہی ہیں اور ایسا کرنے والوں میں مستشرقین و مستشرقین کے جملوں کو بے سیاق و سباق دوہرانے والے ہندوستانی مصنفین کے علاوہ وہ مسلمان بھی ہیں جنھوں نے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح تعصب کے زہر سے بھری ہوا کو اپنا محسن سمجھ لیا ہے، ایسے میں کسی کی شخصیت مشعل راہ بن سکتی ہے تو وہ شبلی ہی کی شخصیت ہے، ان کی فکر اور لائحہ عمل کی جو معنویت ان کے جیتے جی تھی وہی معنویت آج بھی ہے جب ان کی پیدائش کو ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں اور صرف سات سال بعد موت کو بھی سو سال مکمل ہو چکے ہوں گے، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہی مسائل آج بھی ہمیں درپیش ہیں جو ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تھے، ان مسائل کو نہ تو علماء کی طرح دنیا کی مختلف قوموں یا برادران وطن کے مختلف طبقوں سے الگ تھلگ رہ کر حل کیا جا سکتا ہے نہ ۱۸۸۵ء کے بعد کے سرسید کی طرح حکمراں طاقتوں کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر کے، اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو عورتوں کی تعلیم، مغربی تعلیم، تاریخ و نصاب کی غیر متوازن کیفیت اور برادران وطن کے درمیان پلنے والے دہشت گرد ٹولوں کی صورت میں جو خطرات درپیش

ہیں، انھیں شبلی کی ہی فکر ونظر کی روشنی میں سمجھنے اور ان ہی کے لائحہ عمل کے مطابق دور کرنے کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر خلیق انجم کسی تعارف کے محتاج نہیں، انھوں نے ''علامہ شبلی'' کے عنوان سے اپنا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے، جو علامہ شبلی کی مجموعی شخصیت اور علمی خدمات سے بحث کرتا ہے، مضمون میں خلیق انجم صاحب کا ایک اہم بیان یہ ہے:

''سرسید نے شبلی سے درخواست کی کہ وہ سیرۃ النبی پر ایک کتاب لکھیں، انھوں نے ایک مختصر سی کتاب لکھی لیکن سرسید کی کتاب ''خطبات احمدیہ'' جو ولیم میور کی کتاب LIFE OF MOHAMMAD کے جواب میں لکھی جا رہی تھی، بڑی ضخیم اور مدلل کتاب تھی، شبلی کو بھی اس کتاب کو پڑھ کر یہ خیال آیا کہ انھیں بھی ایسا کام کرنا چاہئے، سیرۃ النبی کے لئے مواد جمع کرنے کے مقصد سے شبلی قسطنطنیہ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔''

افسوس ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بیان قلمبند کرتے وقت اپنے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی، ورنہ ممکن ہے اس ماخذ سے کچھ اور مفید معلومات حاصل کی جا سکتیں، خلیق انجم صاحب اردو کے مایہ ناز ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے محقق بھی ہیں مگر افسوس ہے کہ زیر نظر مقالہ میں انھوں نے جتنے اقتباسات دیے ہیں ان کے حوالے ناقص ہیں، یعنی نہ مطبع کا نام لکھا گیا ہے نہ ہی سنہ اشاعت اور ایڈیشن کا، ہو سکتا ہے کہ یہ تمام معلومات مقالے کے آخر میں رہی ہوں جو یا تو کمپوز نہیں ہوئیں یا مقالہ سے منسلک نہیں کی جا سکیں۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی ہمارے ان قلم کاروں میں ہیں جو بڑی سرعت کے ساتھ علمی دنیا میں اپنا نام پیدا کر کے مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شہرت میں اضافہ کر رہے ہیں، انھوں نے ایک اچھوتے موضوع ''مکاتیب شبلی میں عربی زبان وادب'' کو اپنے مطالعہ کا ہدف بنایا ہے، کسی کے ذہن میں بھی نہ رہا ہوگا کہ مکاتیب شبلی کے مطالعے کی مدد سے علامہ شبلی کے اس پہلو پر بھی کوئی مضمون لکھا جا سکتا ہے، ان کا مضمون صرف پڑھنے ہی کی چیز نہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

اس کتاب کے قارئین کو کچھ ایسے مقالات کے بھی مطالعے کا موقع ملے گا، جن میں

ادبیات شبلی کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن پر اب تک لوگوں کی نظر کم یا بالکل نہیں پڑی ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا مقالہ ''ادبی تحقیق کی روایت میں شبلی کی اولیات'' کا ذکر ضروری ہے، یہ مقالہ جس محنت اور عرق ریزی سے لکھا گیا ہے اسی قدر غور و فکر سے اس کو پڑھنے کی ضرورت ہے، کاش اس کی اشاعت رشید حسن خاں کی زندگی میں ہوئی ہوتی تو ان کو بھی شبلی کی ''تحقیق'' کا حال معلوم ہو جاتا۔

ڈاکٹر غضنفر علی غضنفر نے شبلی کو ''جمالیاتی نقاد'' قرار دیتے ہوئے ان کے سماجیاتی و تاریخی شعور'' کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، قابل توجہ بات یہ ہے کہ جمالیات کے موضوع پر درجن بھر سے زیادہ کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی یہ بات طے نہیں ہو پائی کہ جمالیات ہے کیا؟ کوئی قرآن کی جمالیات پر کتاب لکھ رہا ہے، کوئی فارسی سے نابلد حافظ و رومی کے اشعار کو تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے، ڈاکٹر غضنفر صاحب نے شبلی کے سماجی اور تاریخی شعور کو سمجھنے کے لئے شبلی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

> ''ایران کی خاک فنون لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا، اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف، لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی اور کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بہ عہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں؟ قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے؟ خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟ شعراء کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعراء کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیے ہیں، شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں، اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا۔''

ڈاکٹر غضنفر کا مقالہ حوالوں سے مکمل طور سے عاری ہے۔

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے بھی ایک نئے موضوع ''علامہ شبلی اور اسلامی کتب خانے'' پر اپنا اصل مطالعہ پیش کیا ہے اور علامہ شبلی کے اقتباسات کے ذریعے اپنی بات کی وضاحت کی ہے، ان

کے مضمون کی آخری سطروں سے ان کے انداز کار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ کتب خانوں کے حوالے سے علامہ شبلی کی انفرادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی کو کتب خانوں کے تذکرے کے حوالے سے جو چیز مابہ الامتیاز کرتی ہے وہ کتب خانوں کی کتب کی تفصیلات ہیں، سفرنامہ روم ومصر وشام کے صفحہ ۷۸ پر انھوں نے قسطنطنیہ کے کتب خانوں کی فہرست دی ہے اور اس فہرست کے ساتھ ساتھ نسخوں کی صحت اور عمدگی کے عنوان سے نسخوں کے خط کے بارے میں بتایا ہے۔''

اس مقالہ میں بھی حوالے نامکمل ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور مقالہ ''علامہ شبلی بحیثیت مخطوطہ شناس اور منتظم کتب خانہ'' بھی ہے اس کے مقالہ نگار ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی ہیں جو آج کل رضا لائبریری رام پور میں برسرکار ہیں، انھوں نے علامہ شبلی کو ''علم کتب خانہ کا ایکسپرٹ'' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اس سلسلے میں اس رپورٹ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو انھوں نے جنرل عظیم الدین خاں، مدارالمہام ریاست رام پور کی درخواست پر ۱۸۸۸ء میں کتب خانہ رام پور کے سلسلے میں تیار کی تھی، اس رپورٹ میں انھوں نے الماریوں کی ترتیب، فہرست سازی کا طریقہ، نادر ونایاب کتابوں کا انتخاب اور ان کے تحفظ کے علاوہ دیگر ضروری مشورے اور تجاویز درج کی تھیں، کیٹلاگنگ، کلاسیفکیشن اور لائبریری ایڈمنسٹریشن پر مولانا کو کس قدر گہری واقفیت تھی، اس رپورٹ سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔''

''شبلی کے نظریہ شعر کی معنویت'' ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے مقالہ کا عنوان ہے، جس میں انھوں نے شبلی کی دو کتابوں موازنۂ انیس ودبیر اور شعرالعجم کے حوالے سے ان کے شعری نظریات پر بحث کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ''شبلی کے نزدیک شعر کی اصل حقیقت مصوری یا تخیل ہے، مصوری میں خارجی مظاہرے کے ساتھ جذبات کی مصوری بھی شامل ہے، چنانچہ اس بنیاد پر غزل اور قصیدے کو جذباتی شاعری قرار دیتے ہیں اور مثنوی کو مظاہر قدرت کی مصوری سے عبارت بتاتے ہیں، تخیلی شاعری سے مراد شاعری کی وہ قسم ہے جس کو واقعیت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا اور اس میں موضوع اور اسلوب دونوں میں تخیلی پہلو غالب رہتا ہے۔'' ڈاکٹر منظر حسین کا مقالہ

''عہد حاضر میں علامہ شبلی کی معنویت'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں انھوں علامہ شبلی کے افکار ونظریات کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''شبلی آزادئ رائے کے قائل تھے، اگر ان کے فکر ونظر کی آزادی کے تصور پر عمل کیا جائے تو ہماری زندگی کا کوئی بھی گوشہ تاریک نہیں رہ سکتا، بلکہ ترقی کے نت نئے راستے ہموار ہو سکتے ہیں، ان کے نزدیک نظم وضبط اور توازن فکر کی بڑی اہمیت ہے اندھی اور کورانہ تقلید کو انھوں نے کبھی برداشت نہیں کیا، شبلی نے ان ہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ملت ومذہب، ادب واداروں کی خدمت کی جو آج بھی ہمارے لیے باعث ناز ہے اور اس کی افادیت ومعنویت آج بھی مسلم ہے۔''

پروفیسر عبدالقادر کا مقالہ ''عہد حاضر میں علامہ شبلی کی فارسی نگارشات کی معنویت'' میں علامہ شبلی کی فارسی تحریروں خاص طور سے اشعار سے استدلال کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے اس اقتباس سے ان کے انداز فکر کو سمجھا جا سکتا ہے:

''شبلی جس طرح قدیم تاریخ وادب کے جامع ہیں، جدید فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ مذاق ان میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ ان کے پیش کردہ مسائل اس حد تک کامل ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آئندہ بھی غالباً ان پر کوئی معتد بہ اضافہ نہ ہو سکے گا، اسی طرح ان کے اجتہادات کا (جن کو تاریخی الہامات کہنا زیادہ موزوں ہوگا) کوئی حصہ صدیوں بعد بھی متروک نہ ہو سکے گا، اس سے زیادہ شبلی کی تصانیف کا عصر حاضر میں معنویت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔''

ایک مقالہ ''علامہ شبلی کی فارسی غزل'' کے عنوان سے بھی ہے، جس کو ڈاکٹر عمر کمال الدین نے تحریر فرمایا ہے، اس مقالے کی تمہید اتنی طویل ہوگئی ہے کہ اصل موضوع پر جو کچھ اظہار خیال کرنا تھا وہ صرف اشعار نقل کر کے اطمینان کر لیا گیا ہے، مزید برآں دوسروں کے اشعار سے موازنہ کرنے کی وجہ سے شبلی کے اشعار کی تعداد بھی کم ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری کا مقالہ ''عصر رواں میں شبلی کی معنویت'' پر ہے، عبدالباری صاحب ایک مخصوص نقطۂ نظر سے ادب کا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں، اس لئے ان کے مقالے کا انداز بیان

بھی دوسروں سے جداگانہ ہے اور مواد بھی، اس مضمون میں بھی تمام حوالے نامکمل ہیں، معروف ادیب ونقاد ڈاکٹر فخر الاسلام نے اپنا مقالہ ''علامہ شبلی کی تعلیمی سرگرمیاں'' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، اس مقالہ میں انھوں نے علامہ شبلی کے تصور تعلیم کی افادیت کے ساتھ ساتھ ان کی ان خدمات سے بھی بحث کی ہے جو انھوں نے تعلیمی اداروں کے سلسلے میں انجام دی ہیں، ان کا یہ مقالہ مختصر مگر جامع اور نقطۂ نظر کی انفرادی شان سے بہرہ ور ہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ وثقافت کے ریسرچ اسکالر احمد صاحب نے ''مولانا شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار اور عہد حاضر میں ان کی معنویت'' پر اپنا مقالہ تحریر کیا ہے، انھوں نے تلاش وجستجو کی بڑی بھرپور کوشش کی ہے، لیکن ابھی ان کے علمی تجربے میں ایک آنچ کی کسر ہے، وہ نوجوان ہیں، ان میں تصنیفی صلاحیت موجود ہے، توقع ہے کہ آگے چل کر وہ اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے۔

علامہ شبلی کی تصنیفی زندگی کا آغاز ''اسکات المعتدی انصات المقتدی'' نام کے ایک عربی رسالے سے ہوا اور اسی رسالے کی بدولت علامہ شبلی عرب ممالک میں پہلی بار متعارف ہوئے لیکن علامہ شبلی کے علمی کارناموں کے ذکر میں اس رسالے کا نام بہت کم لیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اردو کا عام قاری اس کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں رکھتا، ڈاکٹر الیاس اعظمی نے اس کتاب کا مطالعہ پیش کر کے علامہ شبلی کی ایک فراموش شدہ کتاب کی یاد تازہ کردی ہے۔ شعبۂ تاریخ کے استاد ڈاکٹر علاء الدین خاں نے اپنا مقالہ ''علامہ شبلی کی تاریخی بصیرت'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر تعظیم نے بھی اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے، دونوں مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے علامہ شبلی کے مورخانہ شعور کا محاکمہ کیا ہے اور دونوں ہی نے ان کی شہرہ آفاق کتاب ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' کو اپنے مطالعے کی بنیاد بنایا ہے، ڈاکٹر علاء الدین کے مطابق علامہ شبلی نے اورنگ زیب یا اس کے عہد کی کوئی مربوط تاریخ ترتیب نہ دے کر محض الزامات کا جائزہ لیا ہے اور کذب وافتراء کا جواب دیا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے، ڈاکٹر تعظیم کا خیال ہے کہ علامہ شبلی نے اس کتاب میں تقابلی اور تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ اورنگ زیب کی نئی شبیہ پیش کی ہے اور اس پر عائد کردہ الزامات کا پوری تاریخی بصیرت کے ساتھ تاریخی تناظر میں جواب دینے کی کوشش کی ہے، اس کتاب کے یہ دونوں مقالے بڑے اہم ہیں۔

علامہ شبلی نے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا، مگر دنیا میں رونما ہونے والے سیاسی انقلابات پر ان کی گہری نظر تھی، ان کا اپنا ایک الگ سیاسی نظریہ بھی تھا، بالخصوص مسلم سیاست کے تمام پہلوؤں پر وہ بڑی عالمانہ رائے رکھتے تھے، ان کی سیاسی فکر سے ملک کے بعض مقتدر رہنماؤں نے اپنی اپنی فکر کے چراغ روشن کیے، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے سیاسی مسلک پر علامہ شبلی کے فکر کی گہری چھاپ نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے، علامہ شبلی نے سیاست کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی، لیکن ان کی نظموں، مقالوں اور خطبوں میں ان کے سیاسی افکار جگہ جگہ ملتے ہیں، عربی ادب کے استاد ڈاکٹر محی الدین آزاد نے علامہ مرحوم کے بکھرے ہوئے ان سیاسی افکار ونظریات کا مطالعہ بڑی عرق ریزی سے کیا ہے، ان کا مقالہ ''علامہ شبلی کے سیاسی افکار ونظریات'' اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس میں علامہ شبلی کی سیاسی بصیرت کو نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، انگریزی ادب کے استاد اور اردو کے شاعر وادیب سرفراز نواز صاحب نے اپنا مقالہ ''علامہ شبلی کی اردو نظمیں'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے، انھوں نے تاریخی، سماجی اور سیاسی حالات کو بہ طور خاص پیش نظر رکھتے ہوئے شبلی کی نظموں کا محاکمہ کیا ہے، سرفراز صاحب نے اپنے اس مقالہ میں نئے انداز سے شاعر شبلی کی بنیادی فکر کو چھونے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب علی اور عمیر منظر صاحب نے اپنے مقالوں کے لیے ''سفرنامۂ روم ومصر وشام'' کا عنوان منتخب کیا ہے، چونکہ ابھی تک اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے اس لیے یہ دونوں مقالے خاص اہمیت کے حامل ہیں، ڈاکٹر صاحب علی اور عمیر منظر صاحب نے علامہ شبلی کے اس دلچسپ اور معلومات سے پر سفرنامہ کا مطالعہ اپنے اپنے انداز سے کیا ہے، عمیر منظر صاحب کے نزدیک سفرنامے کے آئینے میں علامہ شبلی کی جو شخصیت نمایاں ہوتی ہے وہ ایک وسیع النظر اور حمیت پسند مسلمان کی ہے جو اپنے تعلیمی اور تہذیبی ورثے پر فخر ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی بازیافت کے لیے کوشاں بھی نظر آتا ہے، اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب علی نے زبان وبیان کے اعتبار سے سفرنامے کی نثر کی سحر انگیزی پر خاص طور سے اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے، امید ہے یہ دونوں مقالے شوق سے پڑھے جائیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس کتاب میں پروفیسر افغان اللہ خاں، پروفیسر محسن عثمانی، پروفیسر محمد

زاہد، پروفیسر نسیم احمد، پروفیسر خورشید نعمانی، پروفیسر عبدالباری، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر منور انجم، ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی اور محمد شارق (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے مقالے شامل نہیں ہیں، فاضل مقالہ نگاروں نے نظر ثانی کے بعد اپنے مقالے ہم کو نہیں بھیجے، ان کے علاوہ پروفیسر جگر محمد، ڈاکٹر سرفراز اور ڈاکٹر جاوید علی خاں کے مقالے انگریزی میں تھے اس لئے ان کو بھی اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے، علاوہ ازیں زیر نظر کتاب میں علامہ شبلی کی مذہبی خدمات پر بھی کوئی مقالہ شامل نہیں ہے حالانکہ علامہ شبلی کی تمام تصانیف ان کی مذہبی فکر کے گرد گردش کرتی ہیں، ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ کم از کم سیرت النبیؐ پر ایک مقالہ ضرور ہونا چاہئے تھا، جس میں علامہ شبلی سے پہلے اور بعد میں اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا علامہ شبلی کی سیرت سے تقابلی مطالعہ کیا جاتا، بالخصوص بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کا جائزہ لیتے وقت اس بات پر نظر رکھی جاتی کہ وہ علامہ شبلی کے طرز تحریر اور فکر و تحقیق سے کس حد تک متاثر ہیں، ہمارا یہ رویہ اس بات کا غماز ہے کہ ہم نے مذہبی کتابوں کو ادب کی دنیا سے بن باس دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اردو زبان کی کوئی ایسی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکی ہے جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاتا کہ قرآن پاک کے اولین ترجموں، تفسیروں، صوفیائے کرام کے ملفوظات اور قصص الانبیا، جیسے موضوعات پر لکھی گئی کتابوں سے اردو زبان کے ارتقائی مراحل پر کیا اثرات پڑے ہیں۔ سیرت النبیؐ کے علاوہ علامہ شبلی کی الفاروق، زبان کی دروبست، انداز بیان کی ندرت، سادگی و سلاست اور اپنے جوش بیان کی وجہ سے اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کا مطالعہ ادب کی ایک کتاب کی حیثیت سے بھی کیا جائے، اس حیثیت سے الفاروق کا مطالعہ کر کے نئے نئے ادبی نکات حاصل کئے جاسکتے ہیں، اس کے باوجود زیر نظر کتاب شبلیات کے موضوع پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اردو کے ممتاز نقادوں اور ادیبوں نے فکر شبلی کے بہت سے نئے گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔ توقع ہے اس کے مطالعے سے شبلی شناسی کے نئے امکانات روشن ہوں گے۔

سمینار کے انعقاد میں جن حضرات نے قدم قدم پر ہماری رہنمائی فرمائی ان میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم، پروفیسر محمود الہی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر عبدالحق، مولانا عمیر الصدیق ندوی اور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ

ان کی وجہ سے یہ بین الاقوامی سمینار کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ کالج کی مجلس انتظامیہ کا میں بے حد ممنون ہوں کہ ان کے تعاون کے بغیر سمینار کا انعقاد ممکن نہ تھا۔ کالج کے تمام اساتذہ، سمینار کمیٹی کے تمام ممبران، طلباء، غیر تدریسی عملہ اور ان تمام مندوبین کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہماری دعوت قبول فرمائی اور ایسی جگہ قدم رنجہ ہوئے جہاں عیش و آرام کا کوئی سامان مہیا نہ تھا۔

زیر نظر کتاب کی اشاعت اور سمینار کے انعقاد میں میرے رفقائے کار ڈاکٹر فخر الاسلام، ڈاکٹر جاوید علی خاں، ڈاکٹر ظہور عالم، ڈاکٹر علاء الدین خاں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر محی الدین آزاد، ڈاکٹر محمد خالد، ڈاکٹر شمس عالم، ڈاکٹر کلیم احمد، ڈاکٹر حکیم الدین، ڈاکٹر الطاف احمد، ڈاکٹر آصف زہری، ڈاکٹر محمد طاہر، ڈاکٹر سرفراز نواز، ڈاکٹر عبدالحفیظ، ڈاکٹر عقیل احمد اور ریحان راشد وغیرہ نے میری ہر طرح کی معاونت فرمائی جس کے لئے میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر شباب الدین

صدر

شعبۂ اردو

اسلام کا گہر بار بادل ایک ہزار سال سے برابر ہندوستان کی اقلیم پر مصروفِ بارش ہے، کتنی بار بادل ابر نیساں بن کر برسا اور عجائب زار ہند کا دامن لعل و گہر سے بھر گیا، لیکن ۱۸۵۷ء میں سارے ملک پر ایک خونی بادل نے تراوش کی، جس سے ہر جگہ تو خون برسا، لیکن کہیں کہیں خون کے قطروں کے بجائے سرخ یاقوت کے دانے برسے، جن میں سے ایک کو قدرت نے شبلی کے نام سے موسوم کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی

خطبۂ استقبالیہ

ڈاکٹر افتخار احمد☆

محترم جناب صدر، لائق احترام مہمان خصوصی، معزز مندوبین اور سامعین!

دل مسرت اور شکر کے جذبات سے لبریز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آج شبلی نیشنل کالج کے دامن کو علم و فضل اور فکر و دانش کے گراں قدر جواہر سے مالا مال کر دیا ہے، ہم دل کی گہرائیوں سے آپ کے خیر مقدم کی سعادت حاصل کر رہے ہیں لیکن علامہ شبلیؒ کے ادارے میں ان کے علم و فن کے مرتبہ شناسوں کو دیکھ کر حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کیفیت کے اظہار سے قاصر ہیں جو ہمارے دل و دماغ میں موج زن ہے۔

یہ کشش علامہ شبلیؒ ہی کی ذات والا صفات کی ہے کہ مرکزی شہروں سے دور ایک ایسے خطہ میں جہاں اب بھی وسائل کی بڑی کمی ہے، آپ حضرات دور دراز سے تشریف لائے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء میں جب علامہ شبلیؒ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تو ان کے مخلص شاگرد و شیدائی علامہ اقبال سہیلؒ نے اپنے فارسی مرثیہ میں کہا تھا کہ:

آں نیشنل کہ ہمتِ تو دادہ اش وجود

سچائی یہی ہے کہ شبلی نیشنل کالج کی خشت اول میں علامہ مرحوم کی پاک نیت اور بلند ہمت شامل تھی، ۳۰ر جون ۱۸۸۳ء میں انھوں نے اس کالج کی بنیاد نیشنل اسکول کے نام سے رکھی، اس زمانہ کے علامہ کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مدرس اور تین طالب علموں سے شروع ہونے والے اس اسکول کے لیے وہ کتنے فکر مند تھے، اپنے عزیزوں کو اس اسکول کی بقا اور ترقی کے لیے مسلسل آمادہ کرنا، خاندان کی ملکیت سے زمین دلوانا، اعزہ و احباب سے چندہ لینا، جس فکر و شوق

☆ پرنسپل، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ۔
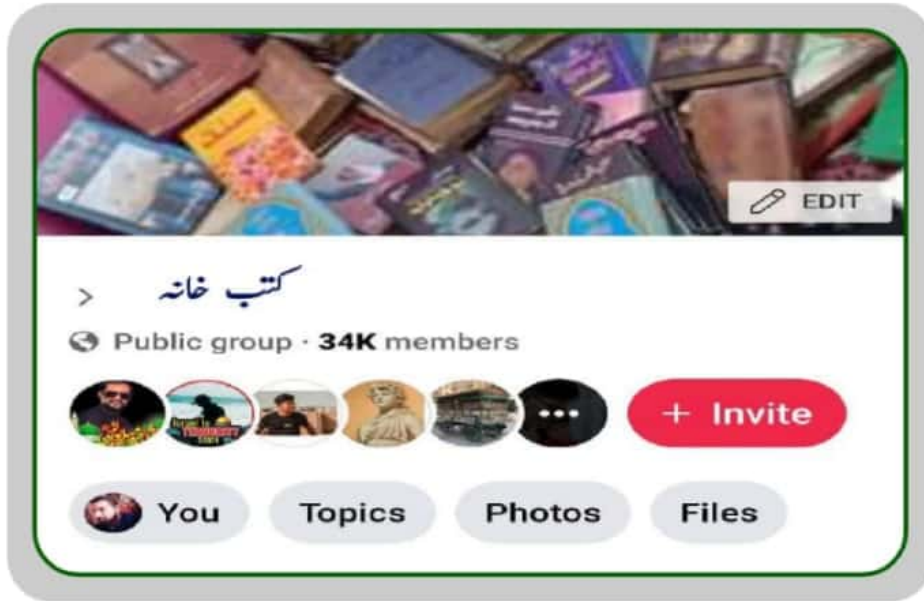
ڈاکٹر افتخار احمد (پرنسپل) خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے۔

پروفیسر ریاض مجید (قرطبہ یونیورسٹی، پاکستان) افتتاحی تقریر کرتے ہوئے۔

ڈائس پر (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر شباب الدین (کنوینر سمینار) جناب رجب نژاد صاحب (ایران) ڈاکٹر افتخار احمد (پرنسپل) اور دارالمصنفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب دیکھے جا سکتے ہیں

جناب رجب نژاد صاحب (ایران) خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے ڈائس پر موجود ہیں
(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر شباب الدین، پروفیسر ریاض مجید اور ڈاکٹر افتخار احمد (پرنسپل)

تقریر کرتے ہوئے پروفیسر کبیر احمد جائسی

ڈائس پر بیٹھے ہیں (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر شباب الدین، پروفیسر ریاض مجید

جناب رجب نژاد، ڈاکٹر افتخار احمد اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی

تقریر کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق ڈائس پر (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر شباب الدین
پروفیسر ریاض مجید، جناب رجب نژاد صاحب اور ڈاکٹر افتخار احمد (پرنسپل) دیکھے جاسکتے ہیں۔

تقریر کرتے ہوئے سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر شباب الدین۔

سامعین کا ایک منظر

سامعین کا ایک منظر

سے وہ اسکول پر ملتفت ہوئے اور اپنے عزیزوں کو متوجہ کیا اور جس کے نتیجے میں صرف چار سال میں یہ مڈل اسکول اور ۱۸۹۵ء میں ہائی اسکول اور اب ان کی پاک نیت اور جذبۂ خالص کے طفیل آج موجودہ شکل میں یہ آپ کے سامنے ہے، اس کی تفصیل یہاں مقصود نہیں، عرض یہ کرنا ہے کہ اس وقت علامہ مرحوم علی گڑھ میں سرسید کے ساتھ تھے، صرف ۲۶ سال کی عمر میں وہ مدرسۃ العلوم کے پروفیسر ہی نہیں سرسید مرحوم کی امیدوں کا مرکز بھی تھے، چنانچہ یہ کہا گیا کہ نیشنل اسکول کا قیام، علی گڑھ تحریک کا دوسرا سب سے بڑا اثر تھا کہ انگریزی تعلیم یا دوسرے الفاظ میں جدید تعلیم کی ضرورت اور اہمیت ان پر واضح ہوگئی تھی، اس دوسرے اثر سے پہلے علی گڑھ تحریک کے پہلے اثر کا ذکر ضروری ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں "یہ ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے" یعنی اصلاً یہ شبلی کالج اسی درد کا درماں اور اسی احساس کا ایک نتیجہ تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ علامہ کی زندگی اور ان کی خدمات کی تہہ میں ہمیشہ یہی جذبہ کارفرما رہا، علی گڑھ، ندوہ، اصلاح تو ان کی کتاب زندگی کے سب سے نمایاں باب ہیں، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن ترقی اردو، نظارۃ المعارف بھوپال، سررشتۂ علوم وفنون حیدرآباد کی ذمہ داریاں ہوں یا شملہ، ڈھاکہ، آسام، الہ آباد اور ناگپور کی سرگرمیاں ہوں، ترکی کے طبی وفد کی تیاری اور واپسی ہو، مسجد کانپور کا واقعہ ہو یا مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد کا معاملہ ہو، ہر جگہ صرف ایک جذبہ کی کارفرمائی ہے اور وہ ہے ملت کی بربادی کا درد اور احساس۔

ان کی تصنیفی کاوشوں اور کارناموں کے مقصد سے آپ سے زیادہ کون واقف ہوسکتا ہے، تاریخ اسلام اور علوم اسلامیہ کے احیاء کے لیے جن نقوش کو انھوں نے تابدار کیا تھا، اس کے جاری رہنے اور اپنے مشن کو زندہ رکھنے کے لیے انھوں نے دارالمصنفین کا خواب دیکھا اور اس موقع پر ہم یہ فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ دارالمصنفین کی دیوار و در کے سائے ہم کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ علامہ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد آج بھی زندہ ہے اور زبان حال سے کہتا ہے کہ اس شکوے کی ضرورت نہیں ہے کہ "ہندوستان میں اور ہر کام کے لیے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن خالی ہے اور یہ سب سے بڑا کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے" دارالمصنفین نے اگر مسلمانوں کے مذہب، علوم اور قومی تاریخ کو زندہ رکھا تو اس پر شبلی کالج کو بھی فخر ہے اور یہ

جائز و بجا بھی ہے کہ دونوں کا سرچشمۂ فیض ایک ہی ہے۔

حضرات: یوں تو ہر سال پابندی سے ۱۸ر نومبر کو ہم یوم شبلی مناتے ہیں جس میں ملک وقوم کی ممتاز شخصیتیں علامہ مرحوم کے کام اور پیام کو تازہ کرتی ہیں لیکن عرصے سے کالج کے ذمہ داروں کو شدت سے یہ احساس تھا کہ علامہ مرحوم کے شایانِ شان ایسا نمائندہ سمینار ہو جو علامہ مرحوم کے افکار، خیالات، نظریات اور ان کے تمام علمی و عملی کارناموں کے باب میں کارِ تجدید کا فریضہ انجام دے، بے شبہ دارالمصنفین اور ملک کے دوسرے ممتاز اداروں میں علامہ مرحوم کی شخصیت پر متعدد وقیع سمینار ہوئے، کتابوں اور مضامین کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں جن شخصیات پر سب سے زیادہ توجہ کی گئی ان میں علامہ کا نام نمایاں ترین ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے کارناموں کی نوعیت اور اس کی اہمیت کو محدود بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ستاون برس کی عمر مستعار میں جس ہستی نے بتیس سال تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی دنیا کو ''اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پُرشور رکھا'' جس ہستی کو اس معنی میں عہد جدید کا معلم کہا گیا کہ ان کی زندگی عہد جدید کے سب سے پہلے اور بڑے عالم کی زندگی ہے، جس میں قدیم کے ساتھ جدید رجحانات پہلو بہ پہلو موجود ہیں، جو وقت کے ایسے موڑ پر سامنے آئے جب ایک نئے عہد کی بنیاد پڑ رہی تھی اور جن کو قدرت نے قدیم و جدید کا سنگم بنا دیا تھا، ایسی ہستی کے متعلق ہم گذشتہ صدی کے سب سے بڑے عالم و محقق کے اس قول پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی بازخوانی ضروری سمجھتے ہیں کہ:

> ''علامہ شبلی کے حریف تلوار کا صرف ایک ہی وار جانتے تھے یا فقیہ و محدث یا متکلم و فلسفی تھے یا فقط انشاپرداز یا زبان آور خطیب یا سخن فہم و سخن سنج لیکن یہ یگانہ روزگار مجموعہ ہر علم و فن تھا، جس رستے پر قدم رکھا، میدان میں سب سے آگے نظر آیا علوم دینی و مشرقی میں جو تبحر ان کو نصیب تھا، اس سے یہ جدید ارکان یکسر خالی تھے اور قدیم علماء جدید مسائل سے بے خبر تھے، تاریخ کا وہ اس بازار میں تنہا جوہری تھا، فلسفہ و کلام کا وہ امام تھا، شاعری کا کہنہ مشق استاد تھا، انشاپردازی کے پامال کوچہ میں بھی اس کی راہ الگ تھی، انشاپردازی و زبان آوری ان دونوں کشوروں میں یکساں صرف اسی کا سکہ رواں تھا، سخن سنجی اس کے طائر کمال

کے شہپر تھے۔

اس میں دوسری جامعیت یہ تھی کہ وہ صرف دماغ نہ تھا، ہاتھ بھی تھا، قومی تحریکوں کے عواقب پر جہاں اس کی نظر پہنچی، حریف اس کے دیکھنے سے قاصر تھے، اس کا دماغ جن دینی ولی کارناموں کا تماشا دیکھتا اور دکھانا چاہتا تھا، بہت سی آنکھیں اس کے دیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھیں، قومی، تعلیمی، اجتماعی، سیاسی ادبی مذہبی غرض عمل کا کوئی گوشہ نہ تھا جس کی طرف اس کا ہاتھ نہ بڑھا ہو۔''

علامہ مرحوم کی زندگی کو ڈیڑھ سو سال ہو گئے، یہ عرصہ انقلاب بلکہ انقلابات کا ہے، جس میں عالم کے عالم زیر و زبر دیکھے گئے، سائنس اور ٹکنالوجی نے دنیا کو ایسے عجائب خانہ میں بدل دیا جس کی مثال شاید پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن ایک حقیقت اپنی جگہ رہی اور یہ وہی سچائی ہے، جس کا سامنا علامہ شبلیؒ اور ان کے دور نے کیا تھا یعنی حق و باطل اور عدل و ظلم کا معرکہ، خصوصاً اسلام اور مسلمانوں پر استعماری حملوں کی شدت نے صلیب و ہلال کی کشمکش کو پھر سے تازہ کر دیا تھا، ایک صدی گزرنے کے بعد بھی آج سامراجی نظام کی سیہ کاریاں لامحدود ہیں جس نے مذہب کے فرق و اختلاف کو تہذیبوں کے تصادم سے دانستہ بدل دیا، امن و سلامتی اور انسانیت کی کامیابی کے ربانی پیام اور پروگرام کے مقابل اگر تب باطل قوتیں الگ الگ خانوں میں تھیں تو اب عالمی نظام کے نام سے شر و فساد کی یہ طاقتیں ایک بن چکی ہیں، طاغوتی قوتوں کا نشانہ اس وقت بھی ایک ہی تھا اور باوجود تمام علمی و صنعتی انقلابات کے یہ نشانہ آج بھی وہی ہے، اس وقت بھی حریف ہوش مند تھا اور آج بھی اس کی ہوش مندی میں شبہ نہیں لیکن تب کہا گیا کہ:

''ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلے کے لیے ساری دنیائے اسلام سے جو شیر دل، اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ علامہ شبلی ہی تھے۔''

لیکن آج شاید ہم یہ جملہ کسی اور شیر دل کے لیے کہنے کے لائق نہیں۔

حضرات: یہی وہ احساس ہے جس نے ہمارے اس سمینار کے موضوع کی راہ ہموار کی یعنی ''عہد حاضر میں علامہ شبلی کی معنویت'' علامہ شبلی کی تمام کتابوں، مضامین اور عملی جدوجہد سے جو بات بالکل واضح ہے وہ شاید یہی ہے کہ انہوں نے ضرورت کے تحت ہی قلم اور قدم اٹھایا، ان کو اپنے

دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کا بخوبی علم تھا، ان کی یہی خوبی آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے کہ موجودہ دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر ہمارے اصحاب فکر ونظر اور صاحبان علم وقلم کو اپنے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے، اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ علامہ مرحوم کے زمانے میں علمائے کرام کا ایک بڑا مشغلہ مناظرہ تھا، بہ قول سید صاحب ''گویا یہی طرز سخن وری تھا'' علامہ شبلی نے بہ ظاہر اس مشغلہ کو اپنی تالیفات کے لیے اختیار نہیں کیا لیکن ان کی تمام تالیفات کا مطالعہ کرنے پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیرۃ النعمان ہو، الفاروق ہو، الکلام ہو یا سب سے بڑھ کر سیرۃ النبیؐ ہو، انہوں نے سب جگہ مناظرے کی بدنما شکل کو بدل کر حق کے اثبات اور باطل کے رد کے لیے زمانے کے مطابق ایک دل نشیں شکل پیدا کر دی، کیا خوب کہا گیا کہ ''انھوں نے لڑائی کے میدان کو نہیں بلکہ جنگ کے نقشے کو بدل دیا'' الزام اور رد الزام کی بجائے دعووں کو دل چسپ اور تحقیقی اسلوب دے کر بیان کو ندرت، تعبیر کو سنجیدگی اور دلائل کو کثرت کی خوبیوں سے آراستہ کر کے مخالف کو جواب کے قابل ہی نہ رکھا۔

یہی وہ احساسات تھے جس نے ہم کو اس علمی مذاکرے کے انعقاد کی توفیق دی اور تائید ایزدی سے ہم اس لائق ہوئے کہ آپ جیسے اہل علم وفضل کو خوش آمدید کہہ سکیں۔

خوش قسمتی سے ہمارے درمیان جناب رجب نژاد بھی موجود ہیں، شبلی کالج اور اس کی ترقیات سے ان کا خاص تعلق ہے لیکن ہم اس سیمینار میں ان کی موجودگی کو شعر العجم کے پیکر مجسم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، شعر العجم کے بارے میں کہا گیا کہ:

> ''یہ پہلا مجموعہ ہے جس کے ذریعہ ایک دانا اور روشن بین شخص نے فارسی ادب کے خزانۂ جاودانی کے گراں قدر جواہر پاروں کے تجزیہ وتحلیل کی کوشش کی۔''

پروفیسر سعید نفیسی نے بھی کہا تھا کہ:

> ''یہ نہایت حیرت انگیز امر ہے کہ ایران سے دور ایک شخص جس نے سرزمین ایران پر کبھی قدم نہ رکھا ہو اور جو اہل ایران سے کسی طرح کا اختلاط نہ رکھتا ہو، وہ اس زبان کے رموز سے ایسا آشنا ہو اور اس کے بارے میں اس کی رائے ایسی صائب ہو۔''

یہ شعر العجم کی تالیف کی دلکش تاثیر ہے کہ ایران کی نمائندہ ہستی آج خود ایران اور ادب

ایران کے عاشق کے گھر میں رونق افروز ہے۔

حضرات: اس سمع خراشی کے لیے میں معذرت خواہ ہوں، شبلی کی معنویت کی تفہیم وترسیل کے لیے واقعہ ہے کہ ہم آپ کے منتظر اور استفادے کے متمنی ہیں، قدیم وجدید تعلیم، نئے نصاب، نئے رجحانات، نئے تقاضے اور ملک وملت کے احیاء نو کے لیے اتنا تو یقین ہے کہ علامہ شبلی آج بھی ہمارے لیے منارۂ نور ہیں اور ان کی معنویت کو پرت در پرت تلاش کرنے اور جہت در جہت عام کرنے کے لیے ہم آپ کے مشکور ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ کوشش بار آور ثابت ہو اور اس پاک ہستی کا ورد عام ہو جس کے متعلق کہا گیا کہ:

دل نہ تھا پہلو میں اس کے پارۂ سیماب تھا
یا سراپا زخم خوردہ درد کی تلوار کا
عالم اسلام میں تھا اک وہی روشن دماغ
آہ! اس تاریک خانہ کا وہی تھا اک چراغ

ہم آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس کررہے ہیں کہ آئندہ سال اپنے کالج کی ۱۲۵ ویں سالگرہ پورے اہتمام کے ساتھ منانے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس موقع پر کالج کے بانی علامہ شبلی نعمانی'' اور ان کے رفقائے کار کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے، ساتھ ہی کالج نے علم کے فروغ واشاعت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ اس کی ایک جامع تصویر پیش کردی جائے، ساتھ ہی آئندہ کالج کی ترقی کے لیے جو منصوبے ہمارے ذہن میں ہیں اور تعلیم کے جو نئے میدان ہیں، ان کا بھی ایک جامع منصوبہ انشاءاللہ پیش کرنے کا ارادہ ہے، اس کے لیے ہم کو آپ کے مشوروں کی ضرورت ہے ساتھ ہی آپ کی دعاؤں کی بھی کہ ہم اس موقع کو بہتر، کارآمد اور کالج کے لیے فائدہ مند بناسکیں۔

ایک بار پھر کالج کے تمام ذمہ داروں اور تعلیمی اور انتظامی عملے کی جانب سے آپ کا تہہ دل سے خیر مقدم ہے۔

☆☆☆

علامہ شبلی کے بعض جاوداں کارنامے

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ ☆

علامہ شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے، اس سال کو ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل سمجھا جاتا ہے کیوں کہ انگریزوں کی سیاسی بساط الٹنے کے لئے مرحوم بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں اسی سال ہندوؤں اور مسلمانوں نے بغاوت کی تھی مگر وہ ناکام ہوگئی اور مغلیہ سلطنت کا آفتاب ہندوستان کے افق سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگیا اور انگریز پورے ملک پر قابض ہوگئے، جس کے بعد انھوں نے یہاں کے تمام باشندوں اور خاص طور پر مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے، مسلمانوں کے جان و مال کے اتلاف کے ساتھ ان کی دینی و ملی شناخت ختم کرنے اور تاریخی و تہذیبی روایات اور ان کے تمام آثار و نقوش کو مٹا دینے کے بھی درپے ہوگئے۔

اس وقت مسلمان تین طرف سے نرغے میں آگئے تھے، ایک تو عیسائی مشنریاں اور ان کے مبلغین اسلام کا قلع قمع کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، دوسرے آریوں نے مسلمانوں کو کم زور اور بے بس دیکھ کر شدھی کی تحریک تیز کردی تھی، ان دونوں گروہوں کی یورش کو اس زمانے کے علمائے حق نے ناکام بنا دیا تھا کیوں کہ وہ ان کے اعتراضات کی تکنیک اور ان کے حربوں سے بہ خوبی واقف تھے۔

لیکن تیسرا حملہ زیادہ خطرناک اور ضرر رساں تھا، یہ مستشرقین کر رہے تھے، ان کے اعتراضات و شبہات کا جواب دینا آسان نہیں تھا کیوں کہ وہ بڑے عالمانہ اور سائنٹفک انداز کے ہوتے تھے جن کی تکنیک سے قدیم تعلیم پائے ہوئے علما واقف نہیں تھے، مستشرقین عربی زبان کے ماہر تھے اور انھوں نے اسلامی علوم کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کیا تھا، مسلمانوں کی جو کتابیں عرصے سے نایاب تھیں مستشرقین نے انھیں تلاش کر کے محنت و عرق ریزی سے پڑھا اور تحقیق و تحشیہ کے بعد

☆ سابق ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

شائع کیا، اس لحاظ سے وہ مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں، مولانا شبلی نے بھی ان کی علمی کدوکاوش کا جابجا اعتراف کیا ہے، رقم طراز ہیں:

''اخیر اٹھارہویں صدی میں جب یورپ کی سیاسی قوت اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوئی جس نے اورینٹلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنہ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کئے، اور عربی تصنیفات کا ترجمہ شائع کیا۔'' (۱)

لیکن ظاہر ہے اسلام نہ ان کا مذہب تھا اور نہ اسلامی علوم وفنون اور کتب اسلامی ان کی اپنی تھیں، اس لئے انھیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی تھی وہ انھیں اس لئے پڑھتے تھے کہ غلط اور غیر مستند روایات وواقعات کو ڈھونڈ کر اور صحیح ومستند روایات وواقعات میں تدلیس اور ملمع سازی کر کے اسلام کی تصویر مسخ کریں۔ اور علمی وتحقیقی انداز میں اسلام، اسلامی تاریخ وتہذیب پر اعتراضات کی بوچھار لگائیں، چنانچہ انھوں نے اسلام اور اسلامی تاریخ وروایات کو اس قدر بدنما انداز میں پیش کیا کہ خود مسلمانوں کو ان سے نفرت اور گھن آنے لگی، قرآن مجید، احادیث نبوی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کوئی بھی مستشرقین کے اعتراضات کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔

علامہ شبلی نے مستشرقین کی علمی واقفیت، مطالعہ کی وسعت، تحقیق وتلاش میں کدوکاوش اور اسلامی علوم سے شغف وغیرہ کا اعتراف کیا ہے، اسی طرح ان کی بدنیتی، خباثت اور غلط انداز فکر ونظر کی پردہ دری بھی کی ہے، مشہور جرمن فاضل سخاؤ جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کرسکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا۔''

جرمنی ہی کے مستشرق نول دیکی نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا تھا مولانا لکھتے ہیں کہ

انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۶ میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بہ جا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

پامر صاحب یا مارگولیتھ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ:

ع دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیتھ نے مسند احمد کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کر سکتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہم سری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی کوئی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب وافترا اور تاویل وتعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے (۲) جس دور کا ذکر ہو رہا ہے اس میں سائنس اور قوانین فطرت کے انکشاف سے مذہب کے بارے میں گونا گوں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے، انھیں مستشرقین اتنے پرفریب انداز میں پیش کر کے اسلام کا استیصال اور تاریخ اسلام کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے تھے جن کا ازالہ کرنا اور جواب دینا قدیم علما کے بس کی بات نہیں تھی، سرسید اور ان کے رفقا جدید علوم وخیالات اور نئے افکار ورجحانات سے واقف تھے اور انھوں نے اسلام کا دفاع بھی کیا، سرسید نے سر ولیم میور کے جواب میں خطبات احمدیہ جیسی بے نظیر کتاب لکھی، مگر مذہب اور اس کے امور ومسائل کی تعبیر وتشریح میں انھیں ٹھوکر لگی جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہیں تھے، اس میدان کو سر کرنے کے لئے جس طرح کی دینی روح اور اسلامی حکمت وبصیرت درکار تھی وہ ان میں نہیں تھی، علاوہ ازیں یہ لوگ مغربی افکار وخیالات اور یورپ کے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے مرعوب تھے، وہ اپنے زمانے کی طبیعی تحقیقات، سائنسی تجربات اور ان کے ظنی وقیاسی نتائج کو قطعی اور یقینی مانتے تھے اور دینی وشرعی مسائل کو ان ہی کے مطابق ڈھالتے تھے اور جب اعتراضات کا جواب بن نہیں پڑتا تھا تو اسلامی عقائد اور دینی حقائق واصول کی دور از کار تاویل وتوجیہ کرتے تھے۔

دراصل بدلے ہوئے حالات میں مستشرقین کے اعتراضات کا جواب وہی علماء دے سکتے تھے جو دینی علوم میں مہارت و پختگی اور اسلامی تاریخ و روایات سے واقفیت کے ساتھ ہی اصلی اسلامی روح اور گہری دینی بصیرت بھی رکھتے ہوں اور جدید تحقیقات و مسائل، نئے فلسفہ و کلام اور عصر حاضر کے افکار و میلانات اور نئے زمانے کے تقاضوں اور ضرورتوں سے بھی باخبر ہوں، ان کو نئے علمی اور سائنٹفک انداز، تلاش و تحقیق اور نقد و نظر کے جدید طریقوں اور مغربی تصنیفات کا پتہ ہو۔

قدرت نے مولانا شبلی کو یہ خوبیاں اور خصوصیات ودیعت کی تھیں، انھوں نے قدیم مدارس میں تعلیم پائی تھی لیکن ان کے روابط جدید تعلیم یافتہ طبقے سے بھی تھے، ان کو دونوں گروہوں کی صحبتوں اور مجلسوں میں شریک ہونے اور ان کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا، ان میں اصلی دینی روح اور صحیح دینی بصیرت تھی اور وہ اسلامی علوم پر مکمل عبور رکھتے تھے اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر ان کی نظر گہری تھی، ان کے ساتھ ہی نئے حالات و رجحانات تازہ افکار و خیالات اور جدید مسائل و تحقیقات بھی ان کے لئے انوکھے اور نامانوس نہ تھے اس لئے مستشرقین کے اعتراضات کی تہوں تک پہنچنے اور ان کے مدلل و محققانہ جوابات دینے میں انھیں دشواری نہیں ہوئی، اسلام، اسلامی علوم و تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدن کو ایسے پراثر اور دل نشیں انداز میں پیش کیا کہ مخالفین بھی ان کی عظمت و برتری تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو گئے، مسلمانوں کے جاہ و جلال، شان و شکوہ اور شاندار کارناموں کا مرقع اس باوقار اور باعظمت انداز سے سجایا کہ مسلمانوں میں ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا ہوگئی اور ان کی مایوسی و افسردگی امنگ و حوصلہ میں تبدیل ہوگئی مولانا نے مستشرقین کے حوالوں، استنباطات اور نتائج و تحقیقات کی غلطیاں اور جعل و فریب دکھا کر اور ان کی تدلیس اور ملمع کاری کا پردہ چاک کر کے واقعات و روایات اور حقائق کو اصل شکل اور صحیح صورت میں اس طرح سامنے لا دیا جس سے ان کی ساری بدنمائی اور عیب دور ہو گیا۔

مولانا شبلی نے یورپ کے علماء مستشرقین کی عیاری اور فریب دکھانے اور ان کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کے ازالے کے لئے جو معرکہ آرا مضامین لکھے ان کی تازگی و معنویت اب بھی برقرار ہے اور انھیں لونی نہیں لگی ہے، پہلے ہم ان میں سے چند کا ذکر کرتے ہیں:

کتب خانہ اسکندریہ: عیسائی اہل قلم نے مسلمانوں کی علم دشمنی کو بڑی شہرت دی ہے، اس کے

ثبوت میں منجملہ اور باتوں کے ایک بہت بڑا الزام یہ تراشا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں جب مصر واسکندریہ فتح ہوا تو ان کے حکم سے فاتح مصر حضرت عمرؓ بن عاص نے اسکندریہ کے کتب خانے کو جلا دیا۔

مولانا شبلی نے اصل مبحث شروع کرنے اور الزام کا جواب دینے سے پہلے قابل لحاظ امر کا ذکر کیا ہے کہ یورپ کو اس کتب خانے کے ساتھ اس قدر ہم دردی کیوں ہے، جب کہ اس کو کتب خانے سے کچھ واسطہ نہیں، اسے شاہان مصر نے قائم کیا تھا جو بت پرست تھے اور حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے گزرے تھے، اگر یہ یورپ کی عام قدر دانی اور ہمدردی کا اثر ہے تو کتب خانہ اسکندریہ کی تخصیص کی کیا وجہ ہے، ان ہی ممالک میں اور بھی بہت بڑے بڑے کتب خانے برباد ہوئے۔ ان پر یورپ میں یہ شور وغل کہاں ہوا؟ اسکندر نے ایران کے کتب خانے جو برباد کیے، ان کی تشہیر کس نے کی؟ اسپین میں خود عیسائیوں نے مسلمانوں کی تمام علمی یادگاروں کو مٹا دیا اور کئی لاکھ کتابیں برباد کردیں، کس نے اس کا ماتم کیا، مولانا کے دروغ شکن قلم نے اس مضمون میں یہی بتایا ہے کہ خود عیسائیوں نے اپنی علمی تاریکی اور جہالت کے دور میں اس شرم ناک فعل کا ارتکاب کیا تھا اور اس بربادی میں ان کے بڑے بڑے پیشوایان مذہب بھی شریک تھے اور اس وقت تو ان کے لئے یہ امر نہایت باعث فخر تھا لیکن جب تہذیب وشائستگی کے دور میں یہ ان کے دامن پر بڑا بدنما داغ بن گیا تو اس کو مٹانے کے لئے یہ تدبیر کی کہ کتب خانے کی بربادی کا الزام فاتحان اسلام کے سر منڈھ دیا حالانکہ اسلامی فتح کے وقت اس کتب خانے کا وہاں نام ونشان نہیں تھا (۱)

مولانا نے بہ تحقیق ثابت کیا کہ اس بے بنیاد وبے اصل واقعہ کو یورپ میں سب سے پہلے ابوالفرج نے مشہور کیا جو ایک یہودی کا بیٹا تھا اور ۱۲۲۶ء میں پیدا ہوا تھا مگر باپ کے ترک مذہب کی وجہ سے خود اس نے عیسائی مذہب کی تعلیم پائی تھی، اس زمانے میں مسلمانوں کے خلاف یورپ میں نفرت انگیز خیالات پھیلائے جارہے تھے، چنانچہ یورپین مصنفین نے ابوالفرج کے اس کذب کو اس بلند آہنگی سے مشہور کیا کہ وہاں کی تمام فضا گونج اٹھی۔

مولانا شبلی نے بتایا کہ تاریخی واقعات کی تحقیق اور ان کی صحت و[illegible]احت معلوم کرنے کے دو طریقے ہیں، پہلا طریقہ روایت کا ہے جس کا سلسلہ اس شخص تک قطعی طور سے پہنچنا چاہئے

جو واقعہ کے وقت موجود رہا ہو اور پھر اس کے بعد جن جن لوگوں نے سلسلہ بہ سلسلہ یہ روایت کی ہے وہ بھی متصل ہونا چاہئے اور درمیان میں کہیں منقطع نہ ہوا ہو پھر تمام رواۃ پر نقد و جرح کی نظر ڈال کر دیکھا جائے کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے، قابل اعتبار ہیں یا نا قابل اعتبار، واقعات کے صدق و کذب کو پرکھنے کا دوسرا طریقہ ان کے نزدیک درایت ہے یعنی یہ دیکھنا کہ جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے از روئے عقل صحیح ہے یا نہیں، قیاس و قرینے سے اس کی تصدیق ہو رہی ہے یا تکذیب۔

مولانا شبلی ایک دقیق النظر مورخ تھے، انھوں نے ان دونوں اصولوں سے کام لے کر اسے ایک فرضی اور من گھڑت قصہ بتایا اور ثابت کیا کہ مسلمانوں کی فتح کے وقت اسکندریہ میں کوئی کتب خانہ ہی نہیں تھا جسے برباد کیا جاتا، اسے تو عیسائی ہی بہت پہلے برباد کر چکے تھے، اور اپنا الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا، مولانا نے بڑی تحقیق و جستجو اور کمال دقیقہ سنجی و نکتہ سنجی سے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یورپ کے مورخین نے اس بے اصل قصہ کے متعلق تاریخی کتابوں سے استناد کرنے میں دیدہ و دانستہ کس فریب اور ملمع کاری سے کام لے کر اسلام کے ایسے حکمراں کو بدنام کیا جس کا عدل و انصاف اور حق پسندی بے مثال تھی۔

الجزیة

مخالفین اسلام نے جزیہ کے متعلق بھی متعدد غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، ان کے خیال میں یہ لفظ اسلام ہی کا ایجاد کردہ ہے اور اسی نے سب سے پہلے اس ظالمانہ اصول کو قائم کیا، مخالفین کے نزدیک اس ظلم و جبر سے بچنے کے لئے لوگ اسلام قبول کر لیتے تھے، گویا جزیہ اسلام کے دائرے کو وسیع کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔

مولانا شبلی نے اس پر تین حیثیتوں سے عالمانہ و محققانہ بحث کر کے اس کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں، ان کے نزدیک جزیہ دراصل فارسی لفظ 'گزیہ' کا معرب ہے، جس کے معنی خراج کے ہیں، اسی کو گزیہ بھی کہا جاتا ہے، اسلام سے پہلے ہی یہ لفظ رائج اور مستعمل ہو چکا تھا، نوشیرواں نے اس کے اصول و قواعد منضبط کئے تھے، یہ دراصل جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ تھا جو غیر مسلم رعایا سے لیا جاتا تھا، اس کو جبراً اسلام کی اشاعت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ایسے معمولی ٹیکس سے کوئی شخص اپنے عزیز دین و مذہب کو ترک کر سکتا تھا، پھر جزیہ سے عورتیں، استطاعت نہ رکھنے والے اور سن

دراز لوگ مستثنیٰ تھے۔

اپنے مدعا کے اثبات کے لئے مولانا نے جزیہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طرزِ عمل اور اس ضمن میں ان کے فرامین اور معاہدے کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔

جزیہ کو اکثر اہل لغت نے جزا کا مشتق بھی بتایا ہے، اسی لئے مخالفین کو یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا کہ یہ لفظ اسلام کی وضع وایجاد ہے۔ جس کی تردید مولانا نے مدلل کی ہے، مولانا کا یہ مضمون بھی معرکہ آرا ہے جو عربی اور اردو میں ان ہی کے قلم سے ہے اور پھر اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا تاکہ معترضین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا مکمل ازالہ ہوجائے اور یہ واقعہ ہے کہ آج تک کسی کو اس کی تردید کی جرأت نہیں ہوئی۔

حقوق الذمیین: یہ مبسوط ومدلل مضمون بھی الجزیہ ہی کا حصہ ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جزیہ وغیرہ کی بنا پر غیر مسلموں پر اسلام کے خلاف جس ظلم وجبر کا افسانہ گڑھا گیا ہے اس کا سارا طلسم ذمیوں کے حقوق بیان کر کے توڑ دیا جائے، کیوں کہ مولانا کا دعویٰ ہے کہ اسلام نے غیر مسلم رعایا کو جس قدر حقوق دیئے ہیں ان سے زیادہ دنیا کی کوئی حکومت اپنی محکوم رعایا کو نہیں دے سکتی اور یہ صرف کاغذی نہیں ہیں بلکہ تیرہ سو برس سے اس پر برابر عمل بھی ہو رہا ہے۔

مولانا نے مخالفین کے خاص خاص اعتراضات کی تردید کے لئے مستند تاریخی دلائل وشواہد پیش کر کے قطعی طور پر اپنے دعوے کو ثابت کر دیا ہے کہ ذمیوں کو اسلام نے ہر قسم کے تمدنی، معاشرتی، سیاسی، ملکی اور مذہبی حقوق دیئے ہیں اور کسی حیثیت سے بھی ان کی تحقیر وتذلیل نہیں کی ہے، بلکہ تمام معاملات میں ان سے مساویانہ اور عادلانہ برتاؤ کیا ہے، سرکاری مناصب اور عہدوں پر بھی ان کو فائز کیا، ان کی عبادت گاہوں سے کوئی تعرض نہیں کیا، ان کو اپنے مال وجائے داد سے فائدہ اٹھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی، رعایا ہونے کے باوجود ان سے رحم وانصاف کا سلوک کرنے اور ان کی ترقی وبہبود میں کوئی کمی نہیں کی جو لوگ اسلام پر تعصب اور تنگ نظری اور ذمیوں کو غلام بنا کر رکھنے اور ان کے تمام حقوق کو پامال کر دینے اور انھیں حقیر وذلیل سمجھنے کا الزام عائد کرتے ہیں، ان کا مسکت جواب دینے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات نقل کئے ہیں:

۱- کوئی دشمن ذمیوں پر حملہ کرے گا تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔

۲- ذمیوں کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا۔

۳- ان کی جان محفوظ رہے گی۔

۴- ان کا مال محفوظ رہے گا۔

۵- ان کے قافلے اور کارواں (یعنی تجارت) محفوظ رہیں گے۔

۶- ان کی زمین محفوظ رہے گی۔

۷- تمام چیزیں جو ان کے قبضے میں تھیں بحال رہیں گی۔

۸- پادری، رہبان، گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے۔

۹- صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

۱۰- ان سے عشر نہیں لیا جائے گا۔

۱۱- ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے گی۔

۱۲- ان کا جو عقیدہ و مذہب پہلے سے تھا وہ تبدیل نہیں کیا جائے گا۔

۱۳- ان کا جو حق انھیں پہلے سے حاصل تھا زائل نہیں ہوگا۔

۱۴- جزیہ ادا کرنے کے لئے انھیں محصل کے پاس خود جانا نہیں پڑے گا۔

۱۵- جو لوگ اس وقت حاضر نہیں ہیں، یہ احکام ان کو بھی شامل ہوں گے۔ (۱)

غرض اسلام کے نظام عدل و مساوات کے زیر سایہ رہ کر وہ نہ کسی قسم کے ظلم واستحصال کا شکار ہوں گے اور نہ کسی طرح کی ذلت وتحقیر محسوس کریں گے۔

مضامین کے بعد ہم مولانا کے دو رسائل پر گفتگو کرتے ہیں جن کی حیثیت مستقل تصنیف سے کم نہیں ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر: یورپ کے متعصب اور تنگ نظر مورخین نے اورنگ زیب عالم گیر کے خلاف دروغ بیانیوں اور افتراپردازیوں کا جو طومار باندھا تھا اور اصل واقعات میں رنگ آمیزی اور ان کی غلط تعبیر وتاویل کر کے اورنگ زیب کو جن جرائم کا مرتکب قرار دیا تھا مولانا نے ان کا جائزہ لے کر ان کی قلعی کھول دی ہے مگر افسوس ہے کہ اب بھی طوطی صفت ہندو مورخین اور بعض مسلمان اہل قلم بھی استاد ازل کا پڑھایا ہوا سبق رہ رہ کر دہراتے رہتے ہیں، اور رنگ زیب کے

جرائم کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں زیادہ اہم حسب ذیل ہیں:

باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹادیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھائے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری سلطنت کے ارکان متزلزل کردیئے وغیرہ۔

مولانا نے ان سب الزامات کے متعلق پہلے امور تنقیح طلب قائم کئے ہیں، اور پھر معترضین کے بیان کردہ ثبوت وواقعات کی تحلیل وتنقید کی ہے اوران تمام تہمتوں اور شبہات کو رفع کیا ہے جو ان کے پرفریب طرز تحریر سے پیدا ہوگئے تھے، اور ایک عادل ومنصف مورخ کی حیثیت سے ان کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے جو عہد عالم گیری میں لکھی گئی تھیں، واقعات کی تحقیق اور چھان بین اور الزامات کی تفتیش وتنقید کے وقت انھوں نے اپنے کو قومی ومذہبی گرفت سے آزاد رکھا ہے، اور کسی ایک فریق کے جانب دار یا وکیل ہوکر اس کے غلط اور بے بنیاد بیان کو صحیح ثابت کرنے کی سعی بے جا نہیں کی ہے، بلکہ ایک غیر جانب دار حاکم عدالت کی طرح یہ دیکھا ہے کہ واقعہ فی نفسہ صحیح ہے یا نہیں، انھیں اورنگ زیب اور شاہجہاں دونوں سے ہم دردی اور تعلق ہے اور دونوں کے لئے ان کے دل میں احترام ہے، اس لئے شاہ جہاں کی قید کا منظر انھیں کشمکش اور خلجان میں ڈال دیتا ہے مگر فوراً ہی سنبھل بھی جاتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''شاہ جہاں اور عالم گیر دونوں قابل ادب ہیں، لیکن دونوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے حق اور راستی اور مجھ کو اسی اعلاتر چیز کے سامنے گردن جھکا دینی چاہئے۔'' (۲)

عالم گیر کے دامن پر بھائیوں کے خون کی چھینٹیں انھیں تڑپا دیتی ہیں مگر اس وقت بھی انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ رقم طراز ہیں:

''بے شبہ ہم کو ٹھنڈے دل سے بے رورعایت ان جرائم کی تحقیقات کرنی چاہئے اور نہایت احتیاط رکھنی چاہئے کہ میزان عدل کا پلہ طرف داری کے رخ پر نہ جھک جائے۔'' (۳)

طوالت کے خوف سے پوری کتاب کے مباحث کا جائزہ لینے کی گنجائش نہیں، ہم اپنے ہم وطن بھائیوں کے بیجا شک وشبہ کے ازالے کے لئے صرف دو باتوں کا ذکر کردینا کافی سمجھتے ہیں، ان سے خود ہی واضح ہوجائے گا کہ اور الزامات بھی کس قدر لغو اور توڑ مروڑ کر بیان کئے گئے ہیں۔

عالم گیر پر ایک چھوٹا الزام یہ ہے کہ تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی اس نے ہندوؤں کو سرکاری

ملازمتوں سے برطرف کر دیا، اس کذب وافترا کی تردید کے لئے یہاں وہ فہرست نقل کی جاتی ہے جو مولانا شبلی نے مآثر عالم گیری کے حوالے سے ان ہندوؤں کی سرسری طور سے نقل کی ہے جو اورنگ زیب کے زمانہ حکومت میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے، عام عہدے داروں اور اہل فوج کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو مرہٹوں کی لڑائی میں شریک تھے، ملاحظہ ہو

نام عہدے دار	ولدیت وغیرہ	سنہ تقرر یا اضافہ عہدہ یا عطائے منصب (سنہ جلوس عالم گیری مراد ہے)
راج بھیم سنگھ	راج سنگھ مہارانا اودے پور کا بیٹا اور مہارانا جے سنگھ کا بھائی تھا۔	سنہ ۳۱ جلوس عالم گیری میں دکن سے آیا اور برہان پور کی مہم میں شریک ہوا، سنہ ۳۸ میں پنج ہزاری کے منصب تک پہنچ کر مر گیا۔
اندر سنگھ	جے سنگھ مہارانا اودے پور کا بھائی تھا۔	سنہ ۴۳ میں دو ہزاری ہوا اور سنہ ۴۸ میں سہ ہزاری پر اضافہ ہوا۔
بہادر سنگھ	جے سنگھ مہارانا اودے پور کا بھائی تھا۔	سنہ ۴۳ میں یک ہزار و پان صدی ہوا۔
راجہ مان سنگھ	پسر راجہ روپ سنگھ۔	سنہ ۲۶ میں ماندل پور بدھنور (۱) کا فوج دار مقرر ہوا، سنہ ۴۳ میں سہ ہزاری تک پہنچا۔
اچلاجی	شیواجی کا داماد تھا	سنہ ۲۹ میں پنج ہزاری منصب اور علم و نقارہ وغیرہ ملا
ارجوجی	سنبھاجی (پسر شیواجی) کا عم زادہ بھائی	سنہ ۳۸ منصب دو ہزاری
مانکوجی	سنبھا کے نوکروں میں تھا	سنہ ۳۱ منصب دو ہزاری
راؤ انوپ سنگھ	پسر راؤ کرن	سنہ ۳۱ میں خلعت ملازمت ملی۔
راجہ انوپ سنگھ	....	سنہ ۳۱ میں لشکر کا قلعہ دار مقرر ہوا
راجہ دویت سنگھ	....	سنہ ۳۶ میں ایرج کا فوج دار اور دو نیم ہزاری ہوا
اودے سنگھ	قلعہ کھیلنا کا قلعہ دار تھا	سنہ ۴۷ میں شش ہزاری و پان صدی ہوا

نام عہدے دار	ولدیت وغیرہ	سند تقرر یا اضافہ عہدہ یا عطائے منصب (سنہ جلوس عالم گیری مراد ہے)
باسدیو سنگھ	جندن کرا کا زمیں دار تھا	سنہ ۴۹ میں سہ ہزاری ہوا
کاتھوجی	....	پہلے پنج ہزاری تھا سنہ ۴۹ میں ایک ہزار کا اضافہ ہوا
ستر سال بوندیلہ	....	سنہ ۴۴ میں قلعہ تارا کا قلعہ دار ہوا
بشن سنگھ	پسر کنور کشن سنگھ	سنہ ۴۵ میں ہزاری و چار صد سوار ہوا
رام چند	پسر راجہ رام سنگھ کھنالوں کا تھانہ دار تھا	سنہ ۴۰ میں دو نیم ہزاری ہوا
لوک چند	نائب وملازم شہزادہ اعظم شاہ	سنہ ۲۹ میں بہار سنگھ کے شکست دینے کے صلے میں رائے رائیاں کا خطاب ملا۔
بھاگو بنجارا	....	سنہ ۴۲ میں پنج ہزاری منصب ملا۔
جکیا	نصرت آباد کا دیس مکھ تھا	سنہ ۵۰ میں سہ ہزاری ہوا
درگا داس راٹھور	....	سنہ ۲۹ میں سہ ہزاری کا منصب پھر بحال ہوا
سروپ سنگھ	ولد راجہ ادوت سنگھ	سنہ ۴۱ میں ایک ہزاری منصب پر ترقی ہوئی۔
سوبھان	ستارہ کا قلعہ دار تھا	سنہ ۴۳ میں پنج ہزاری منصب مع خلعت ونقارہ وغیرہ
شیو سنگھ	راہیری کا قلعہ دار تھا	سنہ ۴۷ میں یک ونیم ہزاری ہوا
مان دھاتا	پسر راؤ کا تھو متعینہ فوج نصرت جنگ	سنہ ۵۱ میں قلعہ مہمت کی تسخیر پر مامور ہوا
کشور داس	ولد منوہر داس گور	سنہ ۲۶ میں شولا پور کا قلعہ دار ہوا
راجہ کلیان سنگھ	بھدا ورکا زمین دار تھا	سنہ ۴۰ میں حاضر دربار ہو کر ہفت صدی پر دو صدی کا اضافہ ہوا

اس فہرست میں مولانا نے مزید بعض قابل لحاظ باتوں کی نشان دہی کی ہے:

۱- سب سے مقدم یہ کہ اسی میں مہارانا اودے پور کے بیٹے اور بھائی بھی موجود ہیں

اوراس سے عجیب تر یہ کہ شیواجی کے متعدد عزیز اور رشتہ داروں کے نام نظر آتے ہیں اور یہ صرف نام کے عہدہ دار نہ تھے بلکہ معرکوں میں حیرت انگیز جاں فشانیاں دکھاتے تھے۔

۲- ان میں فوجی بھی ہیں، ملکی بھی، فوجوں کی افسری، قلعوں کی قلعہ داری، اضلاع کی نظامت و فوج داری، ان سے بڑھ کر ذمہ داری اور اعتماد کے کیا عہدے ہو سکتے ہیں، یہ سب عہدے ہندوؤں کو حاصل تھے، ان واقعات کے بعد لین پول صاحب کے اس قول پر ایک دفعہ اور نظر ڈالو کہ ''راجپوتوں نے عالم گیر کی حمایت میں ایک انگلی بھی ہلانی نہ چاہی تھی۔''(۱)

اسی طرح اورنگ زیب پر بت شکنی اور مندروں کے انہدام کا الزام بھی سراسر غلط ہے، معترضین اورنگ زیب سے ہندوؤں کی ناراضگی اور اس کے خلاف بغاوت کا اصل سبب اسی کو بتاتے ہیں لیکن مولانا شبلی قطعی دلائل و شواہد پیش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ بت خانے وہیں کے توڑے گئے جہاں ہندو بغاوت اور خوں خرابہ پر آمادہ تھے اور کسی طرح اپنی شورشوں سے باز نہیں آرہے تھے، اس میں کسی انتقام اور تعصب کا کوئی دخل نہیں تھا، وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ عالم گیر نے ۲۵ برس تک دکن میں قیام کیا جہاں سیکڑوں اور ہزاروں بت خانے تھے مگر تاریخوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ اس نے کوئی بت خانہ توڑا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب سے نہ صرف الزام لگانے والوں کے الزام و اتہام کی تردید ہو جاتی ہے بلکہ یہ بھی پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ الزام عائد کرنے والے خود ہی بدنیت، فتنہ جو اور متعصب ہیں، یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کہ ایک روزنامہ کی اس سرخی پر نظر پڑی ''اورنگ زیب نے چترکوٹ میں عالی شان مندر بنوایا تھا، مندر کے خرچ کے لئے ۳۳۰ بیگھے زمین اور سرکاری فنڈ سے ایک روپے روزانہ دینے کا فرمان جاری کیا تھا'' اور اصل خبر میں یہ درج تھا ''بت شکن اور مندر منہدم کرنے کی اپنی شبیہ کے برخلاف مغل بادشاہ اورنگ زیب نے اتر پردیش کے چترکوٹ میں بالا جی کا ایک عالی شان مندر بنوایا تھا، شدت پسند سمجھے جانے والے اورنگ زیب نے اس مندر میں بھوگ کی رسم کے لئے مستقل طور پر مندر کی آمدنی کا انتظام کیا تھا جو آج بھی سرکاری امداد کے طور پر بہ دستور جاری ہے، اورنگ زیب نے آج سے ۳۲۳ برس پہلے تعمیر شدہ اس مندر میں راج بھوگ پوجا کی خاطر درکار رقم کے لئے آٹھ گاؤں کی ۳۳۰ بیگھہ زمین اور سرکاری فنڈ سے ایک روپیہ دینے کا

فرمان جاری کیا تھا، بادشاہ کی طرف سے جاری کردہ یہ فرمان آج بھی مہنت بلرام داس کے پاس موجود ہے، اورنگ زیب کے اقتدار کے ۳۵ویں برس میں رمضان کے مہینے کی ۱۹ویں تاریخ کو تامبے کے پتر پر جاری کردہ فرمان پر تحریر ہے، بادشاہ کا شاہی حکم ہے کہ الٰہ آباد صوبہ کالنجر پرگنہ کے تحت چترکوٹ پوری کے سنت مالک داس جی کو مسٹر ٹھاکر بالاجی کے اعزاز میں ان کی پوجا اور بھوگ کے لئے آٹھ گاؤں ہنوتا، چتروکٹ، دیوکھری، رودرا، سریامدری، جبروا اور دوہر بادان میں دے دیا گیا ہے، ۳۳۰ بیگھ بغیر لگان کی قابل کاشت زمین کے ساتھ ساتھ کوری پروشٹھا پرگنہ کے لگان سے ایک روپیہ روزانہ دیا جائے، اس فرمان پر چترکوٹ کے اس وقت کے سربراہ نریش مہاراج ہندو پتر نے بھی عمل کیا تھا، اس کے بعد انگریزی حکومت نے بعض تحریری دستاویز کے توسط سے اسے برقرار رکھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رادھا کرشن سنگھ کے مطابق ملک کو آزادی ملنے اور زمین داری کی روایت کے خاتمہ کے بعد بھی حکومت کے ہاتھوں ۲۲۶۰ روپئے فی ایکڑ کے حساب سے دیا جاتا رہا ہے جو آج بھی جاری ہے۔ (۲)

الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی

جرجی زیدان مصر کا مشہور عیسائی فاضل ہے، جو عربی علوم وآداب کی خدمت کے لئے ممتاز سمجھا جاتا ہے مگر تاریخ التمدن الاسلامی کے نام سے اس نے جو کتاب چار جلدوں میں لکھی تھی وہ نہایت مسموم تھی، اس میں بہ ظاہر تو اس نے اسلام اور مسلمانوں کی مدح سرائی کی تھی لیکن اس کے پردے میں اس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سخت متعصبانہ حملے کئے تھے، اس کی کتاب کی سمیت اور زہرناکی ہر عامی اور سطحی نظر تو درکنار اچھے اچھے اہل علم واصحاب نظر سے مخفی رہی اور وہ اس کتاب کے حوالے یہ سمجھ کر دیتے تھے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کی تعریف میں لکھی گئی ہے مگر علامہ شبلی کی نگاہ سے جرجی زیدان کے مکائد اور دسائس اوجھل نہیں رہے چنانچہ وہ جرجی زیدان کے فریب وعیاری اور حق وباطل کو گڈمڈ کردینے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”اس نے اسلامی عہد حکومت کو تین دور میں تقسیم کیا ہے، خلفائے راشدین، بنوامیہ اور بنوعباس اور حقیقتاً نہیں بلکہ نمائشی اور ظاہری طور پر دور اول اور دور ثالث کی تعریف کی ہے کیوں کہ خلفائے راشدین کی مدح وستائش سے مسلمان اس لئے خوش ہوں گے کہ وہ ان

کے رہنما اور پیشوا ہیں، اسی طرح بنی عباس کی تعریف میں اس لئے رطب اللسان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم خاندان ہونے کی بنا پر ان سے مسلمانوں کا جذباتی اور والہانہ لگاؤ ہے، اس کے علاوہ انھوں نے اسلامی حکومت کی شان وشوکت بڑھانے اور مسلمانوں کے تمدن کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا، رہے بنوامیہ تو وہ ہر قسم کی خوبیوں سے عاری اور دینی واخلاقی عیوب سے پُر تھے، جرجی زیدان نے ان کی مذمت اس لئے کی ہے کہ بنوامیہ نے خالص عربیت کو ختم نہیں ہونے دیا اور اسے عجمی اثرات سے محفوظ رکھا۔"(۱)

مولانا کا یہ مضمون ہندوستان میں بھی اور پھر مصر میں المنار میں چھپا جس کے اڈیٹر علامہ رشید رضا تھے انھوں نے مولانا شبلی کے نام اپنے گرامی نامہ میں لکھا:

"میں خود بھی تردید کرنا چاہتا تھا مگر جرجی زیدان کے مکائد اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو سمیٹ کر یک جا کرنا اور ان کی تردید کرنا قابو میں نہ آتا تھا، آپ نے اس پر قابو پالیا اور تردید کردی۔"(۲)

اس کتاب کی غرض وغایت دراصل عربوں کی تحقیر ومذمت اور خصوصاً بنوامیہ کے مثالب دکھانا ہے، اس نے الزام لگایا ہے کہ اہل عرب دوسری اقوام کو کم تر اور ذلیل سمجھتے تھے، انھیں کوئی عہدہ ومنصب نہیں دیتے تھے، بنوامیہ بڑے ظالم وسفاک تھے، شعائر اسلام کی توہین کرتے تھے، عیش پرستی، لہو ولعب اور شراب خواری میں ڈوبے ہوئے تھے، مفتوح قوموں کے مال چھین لینے میں کوئی برائی نہیں سمجھتے تھے، خراج وغیرہ وصول کرنے میں رعایا پر بڑی سختی کرتے تھے، خلافت کو نبوت سے افضل سمجھتے تھے وغیرہ۔

جرجی زیدان نے اپنے ان مفروضہ الزامات کے اثبات کے لئے جو طریقے اختیار کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

[۱] صریح دروغ وکذب [۲] روایتوں کی نقل میں خیانت، تحریف، تلبیس اور تدلیس [۳] واقعہ میں اس کی نوعیت وصورت تبدیل کرنے کے لئے اپنی طرف سے اضافہ [۴] غلط استنباط واستدلال۔

مولانا نے اصول تحقیق وتنقید کے مطابق تاریخ التمدن الاسلامی کے مصنف کی ساری

عیاریوں اور مکائد کی حقیقت حق پسند اہل نظر کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عبدالملک بن مروان کا قرآن مجید کو الوداع کہنا

خلفائے بنوامیہ میں عبدالملک بن مروان پر جرجی زیدان نے کئی الزام تراشیاں کی ہیں، ایک الزام یہ ہے کہ جس وقت اسے اپنے خلیفہ ہونے کی اطلاع ملی اس وقت وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، یہ خبر سن کر اس نے قرآن پاک کو بند کر کے ھذا افراق بيني وبينك کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب میری آپ سے جدائی ہے۔ (۱)

مولانا نے اس کے جواب میں معتبر حوالوں سے تحریر فرمایا کہ عبدالملک خلیفہ ہونے سے پہلے ہی نہایت زاہد و عابد تھا، اس کا شمار مدینہ کے بڑے فقہا میں ہوتا تھا، خود مصنف کا بیان ہے کہ اسے جب اپنے خلیفہ مقرر کئے جانے کی خبر ملی تو وہ تلاوتِ قرآن مجید میں مشغول تھے مگر خلافت کا بارگراں سنبھالنے کے بعد جو نہایت اہم ذمہ داری ہے اب اتنی یکسوئی اور انہماک سے قرآن مجید پڑھنے کا موقع کہاں ملے گا اس لئے درد بھرے انداز میں بہت حسرت وافسوس سے قرآن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب اطمینان وانہماک سے آپ سے تعلق اور وابستگی کا موقع نہیں ملے گا، اور نہ اپنے عبادت وتلاوت کے پہلے معمول کو قائم رکھ سکوں گا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عبدالملک نے جس پیرائے میں بات کہی تھی اس کی اصل نوعیت یہی تھی جس کو دین کی توہین سے متعلق کوئی واسطہ نہیں تھا اسی بناپر ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالملک بارخلافت سنبھالنے کے بعد بھی فرائض وسنن میں مشغول رہتا، روزہ رکھتا تھا، نماز پڑھتا تھا، حج کرتا تھا۔ (۲)

عبدالملک پر جرجی زیدان نے خانہ کعبہ کی توہین کا الزام بھی لگایا ہے، وہ کہتا ہے کہ جو شخص قرآن کی حرمت کو پامال کر سکتا ہے، اس سے خانہ کعبہ کی توہین کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہوسکتی، اس نے اپنے گورنر حجاج بن یوسف کو چھوٹ دے دی تھی کہ وہ خانہ کعبہ پر منجنیق سے سنگ باری کرے اور عین اسی کے اندر عبداللہ بن زبیر کا سران کے تن سے جدا کر دے، چنانچہ حجاج کی فوجوں نے تین روز تک قتل عام اور خانہ کعبہ کو جو مسلمانوں کے نزدیک اللہ کا گھر ہے مسمار کیا اور اس کی عمارتوں میں

آگ لگادی۔

مولانا شبلی واقعہ کی صحیح تصویر پیش کر کے اس الزام کا یہ جواب دیتے ہیں کہ:

''واقعہ اجمالاً یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر خلافت کے مدعی تھے، حرمین اور عراق پر ان کا قبضہ ہوگیا تھا اور قریب تھا کہ شام پر بھی ان کا قبضہ ہوجائے، ان کی فتوحات کا دائرہ روز بہ روز وسیع ہوتا جارہا تھا، ان کے مدمقابل اور حریف بنو امیہ تھے جب خلافت کی باگ ڈور عبدالملک کے ہاتھ میں آئی تو اس نے حجاج کو ابن زبیر کا محاصرہ کرنے کے لئے بھیجا، جنھوں نے مکہ میں پناہ لے رکھی تھی، اس لئے حجاج نے کعبہ کے اس حصہ پر منجنیق نصب کردی جو حضرت ابن زبیر نے اس میں اضافہ کیا تھا۔ (۳)

تاریخ پر جن لوگوں کی معمولی نظر بھی ہوگی وہ جانتے ہیں کہ حجاج کا مقصد صرف عبداللہ بن زبیر سے قتال کرنا تھا اور چونکہ وہ خانہ کعبہ میں پناہ گزیں ہوگئے تھے، اس لئے کعبہ پر منجنیق نصب کرنے کے لئے وہ مجبور ہوگیا تھا تاہم اس نے کعبہ پر سنگ باری کرنے میں احتیاط برتی بلکہ اس اضافہ کو ڈھایا تھا جو حضرت ابن زبیر نے کیا تھا مگر مصنف نے اصل واقعہ میں تغیر کردیا اور باب کا آغاز قرآن اور حرمین کی اہانت سے کیا ہے اور یہ لکھا کہ عبدالملک نے قرآن سے مخاطب ہوکر یہ کہا کہ ھذا افراق بینی وبینک اور حجاج کو چھوٹ دی کہ وہ منجنیق سے کعبہ پر سنگ باری کرے اور اسے ڈھادے، مصنف کی عبارت پڑھ کر آدمی کو وہم ہی نہیں یقین بھی ہوجاتا ہے کہ عبدالملک شروع ہی سے دین، قرآن مجید اور حرمین کی حرمت کی توہین کرتا رہا ہے اور حضرت ابن زبیر کو یا تو اس لئے قتل کیا کہ وہ مکہ کی مدافعت کررہے تھے یا عبدالملک کا یہ قتل کرانا بھی حرم کی توہین ہی کے ضمن میں شامل ہے۔

مولانا واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ظلم کی ابتدا ابن زبیر کی جانب سے ہوئی تھی، انھوں نے حرمین پر قبضہ کرنے کے بعد بنی امیہ کو مدینہ سے نکال دیا، مروان اور اس کے بیٹے عبدالملک نے جو بیمار تھے، شام پر قبضہ کرلیا، اس اثنا میں ابن زبیر نے متعدد ایسے کام کیے جن کی وجہ سے وہ لوگ ان سے ناراض ہوگئے اور حجاج نے ان ہی امور کو لے کر لوگوں کو ابن زبیر کے خلاف بھڑکا دیا تھا مگر غالباً ابن زبیر ان اقدامات کے لئے مجبور تھے لیکن انصاف کا تقاضا تو یہی ہے

کہ ہم ہر شخص کو اس کا جائز حق دیں، اگر ہم عبداللہ بن زبیر کی طرف سے عذر و تاویل کر سکتے ہیں تو عبدالملک ان سے زیادہ عذر و تاویل کا مستحق ہے، کیوں کہ ابتدا حضرت ابن زبیر کی طرف سے ہوئی تھی۔

مولانا لکھتے ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ عبدالملک نے نہ کعبہ کی شان و عظمت میں کمی کی اور نہ اس کی حرمت پامال کی البتہ وہ ابن زبیر سے جنگ کرنے کے لئے ضرور مجبور ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں ان کے قتل کا سانحہ پیش آیا جو بذاتہ اس کا مقصود نہ تھا، اسی طرح حجاج نے کعبہ پر سنگ باری نہیں کی تھی بلکہ اس کا اصل نشانہ وہ اضافہ تھا جو ابن زبیر نے کیا تھا، فقہ کا یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر باغی خانہ کعبہ میں پناہ لیں تو اس کی بنا پر ان سے جنگ سے نہیں رکا جا سکتا، ابن زبیر اہل شام کے نزدیک باغی تھے۔

اگر حجاج کا مقصد حرم کی توہین ہوتا تو حضرت ابن زبیر کے قتل کے بعد وہ حرم کی اصلاح و مرمت اور اس کی نئی تعمیر کیوں کراتا اور اسی کی تعمیر آج تک موجود ہے جسے اہل اسلام کا کعبہ اور مسلمانوں کا قبلہ کہا جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ خانہ کعبہ کے اندر حضرت زبیر کا سر ان کے تن سے جدا کیا گیا یہ ابن عبدربہ کی العقد الفرید سے منقول ہے، مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ اس طرح کے واقعات میں ایسی کتابوں سے استناد کرنا مصنف کی ایسی دسیسہ کاری ہے جس کا وہ عادی ہے ورنہ ابن زبیر کے قتل کا واقعہ تاریخ کی متداول اور قابل وثوق کتابوں طبری اور ابن اثیر وغیرہ میں موجود ہے اور وہی معتبر ہے لیکن چونکہ ان میں واقعہ کی نوعیت مصنف کی خواہش کے مطابق نہیں ہے اس لئے اس نے ان کو نظر انداز کر کے ایک ایسی کتاب کا سہارا لیا ہے جو محاضرات کے سلسلے کی کتاب ہے، اس طرح کی کتابوں کا حوالہ اسی وقت دیا جاتا ہے جب اور کوئی مستند ماخذ نہ ہو اور واقعہ اصول عام کے خلاف نہ ہو، طبری وغیرہ میں صراحتاً مذکور ہے کہ عبداللہ بن زبیر کے قتل کا واقعہ مقام حجون میں پیش آیا تھا اور انھیں قبیلہ مراد کے ایک شخص نے قتل کیا تھا، اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ کعبہ کے اندر قتل کئے گئے تھے۔

خانہ کعبہ کے انہدام کے متعلق پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حجاج کا یہ نشانہ نہیں تھا بلکہ اس

نے ابن زبیر کے اضافہ کو نشانہ بنایا تھا لیکن چونکہ اضافہ شدہ حصہ خانہ کعبہ سے ملحق تھا اس لئے وہ بھی زد میں آ گیا مگر جب معاملہ رفع دفع ہو گیا تو حجاج نے پہلا کام خانہ کعبہ کی صفائی اور مرمت کا کرایا۔ (۱)

طوالت مانع نہ ہوتی تو ہم اور بھی مثالیں پیش کرتے لیکن مولانا نے بنی امیہ کے ظلم وجور کا جواب دینے کے بعد خاتمہ بحث کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اسے نقل کرتے ہیں۔

"اگر ہم وہ ساری تفصیل بیان کریں جو جرجی زیدان نے بنی امیہ اور ان کے حکام وعمال کے ظلم وجور، رعایا کے اموال زبردستی غصب کر لینے اور اسراف وفضول خرچی وغیرہ کے سلسلے میں بیان کیا ہے اور پھر اس کی تحریف وتدلیس کو واضح کریں اور معنی میں جو تصرفات اور تبدیلیاں کی ہیں اور عبارتوں کے نقل میں جو بددیانتی، ہیر پھیر اور خیانت کی ہے ان سب کی نشان دہی کریں، تو اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہوگی، اس بنا پر اختصار سے کام لیا ہے۔

جب مصنف نے یہ کتاب تمدن اسلام پر لکھی ہے تو اس میں بنی امیہ کے عیوب اور برائیوں کے بیان کا کیا موقع تھا؟ ممکن ہے تم یہ کہو کہ تمدن اسلام کی تاریخ میں اس حد تک سیاسی رویے کا ذکر آنا ضروری تھا کہ وہ ظلم واستبداد پر مبنی تھا یا عدل وانصاف پر، اس کی وجہ سے ضمناً بات بنی امیہ کے مثالب بیان کرنے تک جا پہنچی تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا کسی بھی اموی حکمراں میں کوئی خوبی نہ تھی اور نہ ان میں سے کسی نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیا، اور اس کی سیاست وتدبیر نے ملک میں کوئی منفعت بخش اور لوگوں کے انصاف عام کا کام کیا ہو، بلاشبہ بنوامیہ کا موازنہ خلفائے راشدین سے نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بنی امیہ کے لئے کوئی ننگ وعار کی بات ہے اور نہ اس سے ان کے مرتبے میں کوئی کمی آتی ہے کیوں کہ خلفائے راشدین کے مرتبہ بلند تک پہنچنا آدمی کے بس کی بات نہیں، بنی امیہ کا موازنہ بنو عباسیہ سے کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ بادشاہ تھے، ان میں اچھے بھی تھے اور برے بھی، ظالم بھی تھے اور عادل بھی، متبع شریعت بھی تھے اور آزاد بھی محتاط بھی تھے اور بے پرواہ بھی، بلکہ ان لوگوں میں جو زیادہ عادل اور سب سے بہتر اور اچھا تھا وہ بھی لغزشوں سے اور خرابیوں سے یکسر خالی نہ تھا، اس لئے اگر مصنف جادۂ عدل وانصاف پر قائم رہتا اور ہر شخص کو اس کا جائز حق دیتا تو خود بھی راحت سے رہتا اور ہم کو بھی راحت ملتی، لیکن وہ تو جس فریق کی طرف میلان رکھتا ہے اس کی مدح سرائی میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتا ہے اور جس سے بیزار ہوتا اور نفرت کرتا ہے

اس کی دھجی بکھیر دیتا ہے اور اس مدح وذم ہی کی بنا پر وہ اصل کتاب کے موضوع سے تجاوز کر گیا ہے اور عربوں کی مذمت اور تحقیر کرنے لگا ہے، بنی امیہ کی مذمت اس نے اس لئے کی ہے کہ وہ خالص عرب تھے اور عباسیوں کی مدح اس لئے نہیں کرتا کہ وہ عرب اور ہاشم کی نسل سے ہیں یا نبیؐ کے عزیز وقریب ہیں بلکہ اس لئے مدح کرتا ہے کہ ان کی سلطنت عجمی تھی، اس پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں۔

اب موقع آ گیا ہے کہ بعض خلفائے بنوامیہ کے محاسن اور کارنامے بیان کئے جائیں (۱)

یہ رسالہ عربی میں تھا اس لئے اس کے ذکر میں کسی قدر تطویل سے کام لینا پڑا۔ مولانا کے اور مضامین ورسائل بھی معنویت کے حامل تھے لیکن مضمون کی طوالت کی بنا پر ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور اب ہم مولانا کی تین جاوداں تصانیف کا ذکر کرتے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ

علامہ شبلی نے اگر یہی چند مقالات ورسائل لکھے ہوتے تو وہ ان کی شہرت دوام کے لئے کافی تھے لیکن انھوں نے متعدد بلند پایہ تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں اور ان کا دائرۂ تصنیف وتالیف بہت وسیع تھا، سیرۃ النبیؐ ان کی مایہ ناز تصنیف اور لازوال کارنامہ ہے جس کی طرف وہ سب سے آخر میں متوجہ ہوئے اور اسی پر خاتمہ بالخیر ہوا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی ☆ مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم ☆ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

گو سیرت کی تصنیف ان کے پروگرام میں پہلے سے شامل تھی، خود فرماتے ہیں:

''میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرۃ نبوی کی خدمت انجام دیتا لیکن یہ ایک ایسا نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ ضرورتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔'' (۱)

اس فرض کی ادائیگی سے وہ کبھی غافل نہیں رہے مگر روز بروز ان کو اس کی شدید ضرورت کا احساس بڑھتا ہی جاتا تھا بالآخر وہ سیرت لکھنے کے لئے مجبور ہو گئے، تحریر فرماتے ہیں:

''کیوں کہ اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی

حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن موجودہ زمانے کے معترضین کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن جب اقرار نبوت بھی جزء مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق و عادات کیا تھے، یورپ کے مورخین آں حضرت کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو ان ہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔" (۲)

ان واقعات و حالات نے مولانا کو مجبور کیا اور انھوں نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا فرماتے ہیں کہ یہ کام بہ ظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دل چسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔" (۳)

ایک خط میں اس کی جامعیت اور وسعت کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

"سیرت نبوی جو زیر تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے، اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تا کہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کئے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بد دیانتیاں کی ہیں نہایت زور و قوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔

اسی بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں۔" (۱)

مولانا نے بڑے روحانی جوش و سرور میں سیرت لکھنا شروع کیا اور اس کی مختلف جلدوں کا پلان بنایا اور ان کا خاکہ بھی مرتب کیا، اس خاکے میں رنگ بھی بھرنا شروع کیا تھا مگر اب ان کی زندگی کی شام آ پہنچی تھی اور طرح طرح کے امراض نے ان کو گھیر لیا تھا، اس لئے دو ہی حصے لکھ سکے تھے کہ پیام اجل آ گیا۔

مولانا شبلی کا مقصد فن سیرت میں ایک ایسی جامع اور محققانہ کتاب لکھنا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، واقعات اور کارنامے مستند طریقے پر بیان کئے گئے ہوں اور آپ کے پیغام، آپ کی ہدایت و شریعت اور اسلام کی دعوت و تعلیم صحیح اور معتبر مآخذ کی مدد سے موجودہ دور کے مذاق کے مطابق موثر اور دل کش زبان اور اسلوب میں پیش کی گئی ہو تا کہ دنیا کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ پیغمبر اسلام کتنا جامع و مکمل انسان تھا، اس کی بعثت کا مقصد کیا تھا اور وہ نوع انسانی کو کیا پیغام دے گیا ہے، اپنے ایک والا نامہ میں لکھتے ہیں:

"چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب سیرت میں آ جائیں، یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا، گو لمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔" (۱)

اس بے مثال کارنامے کے پر عظمت، دیرپا اور جاوداں ہونے کا اندازہ بھی انھیں تھا ایک اور گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

"ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔" (۲)

خاص طور پر یہ خیال ان کے دل میں اس لئے پیدا ہوا تھا کہ اس زمانے میں مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کی طرح اس کی ذہنی غلامی میں بھی گرفتار ہو گئے تھے اور مغرب کے نظر فریب تمدن و تہذیب کی چمک دمک نے ان کی نگاہیں اس قدر خیرہ کر دی تھیں کہ اپنی تاریخ کے لازوال کارنامے اور پیغام محمدی کے تابناک نقوش ان کو دھندلے اور ماند نظر آنے لگے تھے، مولانا شبلی نے سیرت و اخلاق نبوی اور محمدی تعلیم و ہدایت کو اس آب و تاب سے پیش کیا کہ اس کے سارے داغ دھبے دور ہو گئے۔

سیرۃ النبی صرف سیرت کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ جدید علم کلام کی اساس بھی ہے، یہاں

اس کے مباحث کے تجزیہ و تحلیل کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے ہم صرف اس کی چند نمایاں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱- مجموعی حیثیت سے اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان میں بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب موجود نہیں۔

۲- اردو میں سیرت پر لکھی گئی کتابوں میں صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سادہ حالات و واقعات، مغازی، شمائل و اخلاق مذکور ہوتے ہیں اور وہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات پر مشتمل ہوتی ہیں، ان میں نہ روایات و واقعات کی تحقیق و تنقید اور ان کی صحت و وثوق کا پتا لگایا گیا ہے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے الزام و اتہام خصوصاً مستشرقین کے بے سروپا اعتراضات کا کوئی جواب دیا گیا ہے۔ اس کی بنا پر موجودہ ذخیرہ سیرت سے جدید مذاق و رجحان کے لوگوں کی تشفی نہیں ہوسکتی، مولانا شبلی کی سیرت النبی میں ان سب باتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے اس لحاظ سے وہ آپ کی محض سوانح عمری ہی نہیں بلکہ اسلامی دائرۃ المعارف ہے۔

۳- سیرۃ النبی کا اکثر مواد قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ماخوذ ہے، روایات کے رد و قبول میں بڑی چھان بین اور مکمل احتیاط کی گئی ہے اور ان پر بڑی ناقدانہ و محققانہ بحث کی گئی ہے، آیات اور احادیث صحیحہ کی موجودگی میں کتب سیرت کی روایات نظر انداز کردی گئی ہیں اور ان ہی کو قابل حجت بنایا گیا ہے جو تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اتری ہیں، کیوں کہ مصنف سیرت کے ذخیرے کو کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں مانتے۔

۴- اعتراضات کا مدلل جواب اور شکوک و شبہات کا مکمل ازالہ کیا گیا ہے، مگر کہیں مناظرانہ رنگ اور بحث و جدال کا انداز نہیں آنے پایا ہے بلکہ خود معترضین کی تحقیقات اور ہتھیاروں سے ان کی کاٹ کی گئی ہے، بعض جدید متکلمین اور سیرت نگاروں کی طرح نہ تو صحیح روایات و واقعات کا انکار کیا گیا ہے اور نہ ان کی غلط تاویل و توجیہ کی گئی ہے، ہر مبحث میں صحیح نقطہ نظر اور اسلامی طرز فکر کو مدنظر رکھا گیا ہے اور قرآن مجید اور احادیث نبوی سے اس کی وضاحت کی گئی ہے اور نفس واقعہ کو تحقیق و تدقیق کے بعد ایسے موثر اور دل نشیں پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ اعتراضات خود بہ خود رفع ہوگئے ہیں۔

۵- صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کی وجہ سے قدیم طرز کے روایت پرست علما کو بھی اس پر حرف گیری کا موقع کم ملا ہے اور تلاش و تحقیق کے جدید انداز، عقلی و نقلی دلائل اور سائنٹفک طرز نیز سلیس زبان اور دل کش اسلوب تحریر کی بنا پر جدید تعلیم یافتہ طبقے کے شکوک و شبہات بھی اس سے رفع ہو گئے ہیں۔

۶- علامہ شبلی اردو کے بہت ممتاز ادیب و انشاء پرداز تھے اس لئے سیرۃ النبی کی زبان و پیرایۂ بیان بہت سلیس و شگفتہ ہے اور اس میں دقیق اور پیچیدہ علمی و تحقیقی بحث [illegible] اور دل نشیں اسلوب میں پیش کیا گیا ہے کہ سارا الجھاؤ اور پیچیدگی دور ہو گئی [illegible]

۷- سیرۃ النبی کو بڑا حسن قبول نصیب ہوا، ہندوستان اور پاکستان [illegible] کے [illegible] ایڈیشن نکلے اور ملک و بیرون ملک کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

۸- سیرت کے واقعات و مباحث کے سلسلے میں مولانا شبلی نے فطری ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے یعنی قرآن مجید کے بیان کو سب سے مقدم اور بالاتر قرار دیا ہے، اس کے بعد احادیث صحیحہ کا نمبر آتا ہے، ان دونوں کی موجودگی میں کتب سیرت کی روایات کو نا قابل اعتنا خیال کرتے ہیں۔

۹- مولانا اہم واقعات کے متعلق صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیتے ہیں مگر روزمرہ اور عام واقعات میں وہ ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی روایتوں کو کافی خیال کرتے ہیں لیکن اہمیت کے حامل واقعات یا غزوات کی جزئیات کی تفصیل میں ان مصنفین کی روایات میں تحقیق و تنقید کے قائل ہیں، اس بنا پر بڑی محدثانہ کدو کاوش کرتے ہیں۔

۱۰- اردو کے عام مصنفین کے برخلاف مولانا اس میں اور اپنی عام تصنیفات میں بھی حوالے دیتے ہیں، مطبوعہ کتابوں کے حوالوں میں مطبع کی صراحت کرتے ہیں اور قلمی کتابوں کے متعلق مقدمہ میں تصانیف سیرت کی جو فہرست دی ہے اس میں بتا دیا ہے کہ کون سا نسخہ ان کے استعمال میں رہا ہے۔

۱۱- سیرۃ النبی کا ایک بڑا امتیاز اور اہم خصوصیت اس کا عالمانہ مقدمہ بھی ہے جو دراصل ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے سطور بالا میں اس کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں اس کی بعض دفعات اسی سے مستفاد ہیں، مقدمہ میں فن سیرت اور روایت و درایت کے اصول پر ناقدانہ بحث کی

گئی ہے۔ اس کی ابتدا میں سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت بیان کی گئی ہے اور مقصد تصنیف کا مذہبی اور عملی پہلو تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ ہے کہ مجموعہ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔" (۱)

مولانا نے تمام ذخیرہ سیرت کو کھنگال کر ہر ایک کی مختصر تاریخ اور کیفیت اس لئے بیان کی ہے کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرے سے کیوں کر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک اس میں تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔

مولانا مسلمانوں کے فن سیرت کے اصول و معیار کو بے نظیر اور اسے دوسری قوموں کے اصول سے بہت زیادہ بلند اور فائق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ معیار دو اصولوں پر مبنی ہے روایت و درایت۔ اور دونوں پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے۔ انھوں نے گونا گوں پہلوؤں سے کتب سیرت کا جائزہ لیا ہے اور گیارہ وجوہات میں ان کی کم پایگی کی وجہیں بتائی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے جہاں کتب سیرت کی خامیاں اور کمزوریاں نظر میں آ جاتی ہیں۔ وہاں اس کی اصلاح و تدارک کی وہ صورتیں بھی سامنے آ جاتی ہیں جو مولانا نے کی ہیں۔

مقدمے کے آخر میں سیرت کی یورپین تصنیفات کا ذکر ہے۔ اس میں ان کے عام انداز، طرز فکر اور عامۂ مغالطوں، غلطیوں اور تعصب و سوء ظن وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے یورپین مصنفین کی حسب ذیل تین قسمیں کی ہیں:

۱۔ عربی زبان اور اصل ماخذوں سے ناواقف ان کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات و تراجم ہیں۔

۲۔ عربی زبان و علم ادب و تاریخ و فلسفہ کے بہت بڑے ماہر لیکن مذہبی لٹریچر اور فن سیرت سے ناآشنا۔

۳۔ اسلامی لٹریچر کا کامل مطالعہ کرنے والے مگر زور قلم کذب و افترا اور [illegible] تعصب

سے کام لینے والے۔

الفاروق

مولانا شبلی کی یہ کتاب بھی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ جس پر ان کو بجا طور سے فخر تھا، اس کی مقبولیت کی بنا پر اس کے کئی ایڈیشن نکلے اور متعدد زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصے میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے حالات وسوانح بیان کئے گئے ہیں، چوں کہ سیرت فاروقی پر لکھی جانے والی ہر کتاب میں یہ تفصیل موجود ہے اس لئے مولانا نے تفصیل میں پڑے بغیر محض سادہ واقعات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے، تاہم حضرت عمر کے قبول اسلام، جنگ احد میں ثابت قدمی، واقعہ قرطاس، سقیفہ بنی ساعدہ اور تمہید میں فن تاریخ اور اس کے اصول ومعیار کے متعلق جو کچھ اختصار سے لکھا ہے وہ عام مورخین اور مصنفین کی تحریروں سے علانیہ ممتاز نظر آتا ہے، پھر مولانا کے قلم کی ادبی رعنائی وشگفتگی اور جادونگاری نے کیف وکشش اور تاثیر کی جو شان پیدا کی ہے وہ دوسروں کے یہاں مفقود ہے۔

دوسرے حصے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور نہ جانے کن کن گوشوں سے معلومات کا خزانہ جمع کیا ہے خصوصاً حضرت عمر کی حکومت کے کارنامے اور ان کے تمام شعبوں کی خصوصیات کو جس طرح نمایاں کیا ہے، اس سے ان کی خاص نکتہ سنجی، دقیقہ بینی، وسعت علم ومطالعہ اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے مگر یہ سب کچھ حضرت عمرؓ کے عام سوانح نگاروں کی نظر سے یا تو اوجھل تھا یا انھوں نے ان کو زیادہ اہمیت ہی نہیں دی، مولانا خود بھی اس حصے کو اپنی سعی ومحنت کی تماشا گاہ سمجھتے ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے فاضل لکھتے ہیں:

> ''کوئی حصہ ثانی کی فہرست مطالب دیکھے تو سمجھے گا کہ یہ کسی انیسویں صدی کی مہذب ومنتظم سلطنت کے محکموں کی فہرست ہے، کیا یہ کم تعجب خیز امر ہے کہ شائستگی نے جو وسعت حکومت کے مفہوم میں آج پیدا کی ہے اور اسی وسعت کی بنا پر جو جو محکمے جزء سلطنت قرار پائے ہیں وہ سب نہیں تو ان میں سے اکثر منتظم شکل میں حضرت عمرؓ نے اپنی دہ سالہ حکومت میں قائم فرما دیئے تھے اور نہ صرف قائم فرمائے بلکہ ان کے فیض بخش نتائج عالم کو دکھا دیئے۔

علامہ مصنف کو سب سے اول ان کی قوت دماغی اور جامعیت خیال پر آفریں کہنی چاہئے کہ انھوں نے فاروق اعظمؓ کی لائف کا ایسا وسیع اور جامع خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا یا بہ الفاظ دیگر ان کی عظمت کو اصلی حیثیت میں دیکھا، اس کے بعد مصنف کی تلاش و تجسس کی داد دینی چاہئے کہ جس قدر عنوان قائم کئے ان کو پوری نکتہ بینی اور موشگافی کے ساتھ معمور کیا اور واقعات کی مدد سے ہر بحث کا حق ادا کردیا۔'' (۱)

جو لوگ اس تاریخ ساز تصنیف کے اس حصہ کے نکتہ چیں ہیں ان کے جواب کے لئے علامہ کے ایک اور پایہ شناس کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ناظرین کو شاید وہ خاص مقصد معلوم نہ ہو جس نے علامہ کو الفاروق کی تالیف پر آمادہ کیا تھا، علامہ اگرچہ قدیم اسلامی طرز تعلیم کے تربیت یافتہ تھے لیکن عام علما کی طرح دنیا کے حالات و واقعات سے بے خبر نہ تھے، ان کے دل میں قوم و ملت کا درد تھا، ان کی نظر تہذیب مغربی کی ان فریب کاریوں اور ملمع سازیوں کی حقیقت شناس تھی، جن سے مسحور ہوکر مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ یہ سمجھ رہا تھا کہ فطرت انسانی کی ہر قابلیت خواہ وہ علم و فن کی ہو یا سیاست و تدبیر کی، صرف دیار مغرب ہی کو حاصل ہے، یہ غلامانہ احساس کم تری دراصل اسلاف کے شان دار کارناموں سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا زریں ورق الٹا جائے جس کو دیکھ کر مسلمان محسوس کریں کہ وہ ایک ایسے مذہب کے پیرو ہیں جس کی روحانی قوت بڑے بڑے کج کلاہوں کے ایوان اقتدار کی بنیادوں کو متزلزل کرسکتی ہے، اس کے لئے فاروق اعظمؓ ہی کے کوکبۂ جلال و عظمت کا منظر کام آسکتا تھا جس کو پیش کرکے علامہ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور کامل یقین واعتماد کے ساتھ دنیا کے تمام حریفوں کو چیلنج دیا کہ ''جس احتیاط و قید کے ساتھ حضرت عمرؓ نے فتوحات کیں، جس طرح قیصر و کسریٰ کے قصرہائے فلک کے کنگروں پر مٹھی بھر بے سروسامان صحرانشینوں کے ہاتھوں سے اسلام کا پرچم اقبال لہرایا، فرش خاک پر بیٹھ کر حکومت و فرماں روائی کا جو جاہ و جلال دکھایا، عام رعایا کو مساوات و آزادی کے جو گراں بہا حقوق عطا کئے، عدل و انصاف کا جو نمونہ پیش کیا، صاحب حکومت ہوتے ہوئے ایک عام

آدمی کی طرح جس سادگی کے ساتھ زندگی بسر کی، ایک غیر متمدن ملک کی خاک سے پیدا ہو کر جو وسیع نظام سلطنت قائم کیا، اگر دنیا کے کسی فاتح یا حکمراں کے حالات زندگی میں اس کی کوئی نظیر موجود ہو تو پیش کرو۔''

اس چیلنج کو ایک مدت دراز گزر گئی لیکن اس کے جواب میں آج تک دنیا کے کسی گوشہ سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی۔''(۱)

کتاب کی تمہید میں انھوں نے فن تاریخ کے آغاز، ترقی اور تنزل، اس کی تعریف، حقیقت وماہیت وغیرہ پر گفتگو کرنے کے بعد فن تاریخ کے لئے ان باتوں کو لازمی قرار دیا ہے:

۱- جس عہد کا حال لکھا جائے، اس زمانے کے ہر قسم کے حالات لکھے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔

۲- تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

ان دونوں کو وہ قدیم تاریخوں میں مفقود بتاتے ہیں۔

۳- سب سے اہم تر بحث اس پر کی ہے کہ جو واقعات مذکور ہیں ان کی صحت کا اعتبار کیسے ہو، واقعات کے جانچنے کے دو طریقوں روایت و درایت پر بحث کرتے ہوئے اس پر خاص زور دیا ہے کہ درایت کے اصول اگرچہ موجود تھے مگر تاریخ میں ان سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔

درایت کے جو اصول وقواعد واقعات کی تحقیق وتنقید کے لئے کارآمد ہیں ان کو تحریر کر کے لکھا ہے کہ موجودہ متداول تاریخوں میں غیر قوموں کی نسبت حضرت عمرؓ کے نہایت سخت احکام منقول ہیں مولانا اس سلسلے میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنے پر زور دیتے ہیں، یہ تصنیفات اس زمانے کی ہیں جب مسلمانوں میں تعصب پیدا ہو گیا تھا، دوسرے یہ کہ قدیم ترین تصنیفات میں اس طرح کے واقعات بالکل نہیں ہیں یا بہت کم ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر تعصب آتا گیا اسی قدر روایتیں خود بہ خود تعصب کے سانچے میں ڈھلتی گئیں مثلاً تمام تاریخوں میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ عیسائی کسی وقت اور کبھی ناقوس نہ بجانے پائیں لیکن قدیم کتابوں (کتاب الخراج، تاریخ طبری وغیرہ) میں یہ روایت اسی قید کے ساتھ منقول ہے کہ جس وقت مسلمان نماز پڑھتے ہوں اس وقت عیسائی ناقوس نہ بجائیں۔(۲)

ابن اثیر حضرت عمرؓ کے اس فرمان کا ذکر کرتے ہیں کہ قبیلہ تغلب کے عیسائی اپنے بچوں کو اصطباغ نہ دینے پائیں، لیکن یہی روایت تاریخ طبری میں اس طرح ہے کہ اسلام قبول کر لینے والوں کے بچوں کو زبردستی اصطباغ نہ دیا جائے۔ (۳)

۲- جو روایتیں تاریخی ہونے کے ساتھ مذہبی حیثیت بھی رکھتی ہیں، ان میں جس قدر تنقید ہوتی گئی ہے، اسی قدر مشتبہ اور مشکوک باتیں کم ہوتی گئی ہیں مثلاً فدک، قرطاس اور سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات ابن عساکر، ابن سعد، بیہقی، مسلم، بخاری سب نے نقل کئے ہیں لیکن جس قدر ان بزرگوں کے اصول اور شدت احتیاط میں فرق مراتب ہے، اسی نسبت سے روایتوں میں مشتبہ اور نزاع انگیز الفاظ کم ہوتے گئے ہیں یہاں تک کہ خود مسلم و بخاری میں فرق مراتب کا یہ اثر موجود ہے۔ (۱)

مولانا شبلی کے نزدیک اصول عقلی کی بنا پر بھی مختلف قسم کے واقعات میں صحت و اعتبار کے مدارج مختلف ہیں، مثلاً حضرت عمرؓ کی خلافت کے واقعات سو برس کے بعد تحریر کئے گئے، اس بنا پر معرکوں کی نہایت جزئی تفصیلیں مثلاً صف آرائی کی کیفیت فریقین کے سوال و جواب، ایک ایک بہادر کی معرکہ آرائی، پہلوانوں کے داؤں پیچ اس قسم کی جزئیات کی تفصیل کا رتبہ یقین تک نہیں پہنچ سکتا، لیکن انتظامی امور اور قواعد حکومت چوں کہ مدت تک محسوس صورت میں موجود رہے، اس لئے ان کی نسبت جو واقعات منقول ہیں وہ بے شبہ یقین کے لائق ہیں، اکبر نے ہندوستان میں جو آئین اور قاعدے جاری کئے ایک ایک بچہ ان سے واقف ہے اور ان کی نسبت کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا جس کی یہ وجہ نہیں کہ حدیث کی طرح اس کے لئے قطعی روایتیں موجود ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ انتظامات مدت تک قائم رہے اور اکبر کے نام سے ان کو شہرت تھی۔ (۲)

آگے پھر بتایا ہے کہ جو واقعات اس زمانے کے مذاق کے لحاظ سے چنداں قابل ذکر نہ تھے اور باوجود اس کے ان کا ذکر آجاتا ہے ان کی نسبت سمجھنا چاہئے کہ اصل واقعہ اس سے زیادہ ہوگا مثلاً ہمارے مورخین رزم و بزم کی معرکہ آرائیوں اور رنگینیوں کے مقابلے میں انتظامی امور کے بیان کرنے کے بالکل عادی نہیں ہیں، بایں ہمہ حضرت عمرؓ کے حال میں عدالت، پولس، بندوبست، مردم شماری وغیرہ وغیرہ کا ضمناً جو ذکر آجاتا ہے اس کی نسبت یہ خیال کرنا چاہئے کہ جس قدر قلم بند ہوا اس سے بہت زیادہ چھوڑ دیا گیا ہے، حضرت عمرؓ کے زہد و تقشف، سخت مزاجی اور سخت گیری کی نسبت

سیکڑوں روایتیں مذکور ہیں اور بے شبہ اور صحابہ کی نسبت یہ اوصاف ان میں زیادہ تھے، لیکن ان کے متعلق ان تمام روایتوں کو صحیح نہیں خیال کرنا چاہئے جو حلیۃ الاولیا، ابن عساکر، کنز العمال، ریاض النضرۃ وغیرہ میں مذکور ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ چونکہ اس قسم کی روایتیں عموماً گرمی محفل کا سبب ہوتی تھیں اور عوام ان کو نہایت ذوق سے سنتے تھے اس لئے خود بہ خود ان میں مبالغہ کا رنگ آتا گیا ہے، اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ جو کتابیں زیادہ مستند اور معتبر ہیں، ان میں یہ روایتیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ (۳)

مولانا نے الفاروق کی تمہید میں تاریخ کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے حضرت عمرؓ کے سوانح وواقعات بیان کرنے میں اسے عملاً برت کر دکھایا بھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس پائے کے ادیب وانشاپرداز تھے اسی پائے کے مورخ بھی تھے، الفاروق میں ان کا مورخانہ ذوق نقطہ عروج پر دکھائی دیتا ہے لیکن ان کی تاریخ نویسی اور اس کا اسلوب معرض بحث رہ چکا ہے بعض لوگوں کے خیال میں مولانا کے اسلوب میں انشاپردازانہ رنگ غالب ہے اور مورخانہ رنگ پھیکا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسلوب کی یہ رنگینی ودل کشی تاریخ کے لئے موزوں نہیں۔ مگر یہ رائے سطحی اور تنقید عامیانہ ہے، جس کی تردید خود مولانا کے قلم سے تمہید میں موجود ہے۔

انھوں نے آج کل کی اعلا درجہ کی مقبول عام تاریخوں کو فلسفہ اور انشاپردازی سے مرکب بتایا ہے، ان کے نزدیک تاریخ وانشاپردازی کی حدیں بالکل جدا جدا ہیں، ان دونوں میں جو فرق ہے وہ نقشہ اور تصویر کے فرق سے مشابہ ہے، مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے، یورپ کے ایک بڑے مورخ رینکی کے وہ مداح ہیں، کیوں کہ اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا، نہ ملک کا ہم درد بنا نہ مذہب اور قوم کا طرف دار ہوا، کسی واقعہ کے بیان میں یہ مطلق پتا نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے، اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے۔ (۴)

اب ہم دوسرے حصے سے کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں:

وہ فاروقی فتوحات کی وسعت پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے ان اسباب کا تذکرہ کرتے ہیں جو یورپین مورخین نے بیان کئے ہیں کہ اس وقت فارس وروم کی سلطنتیں اوج اقبال سے گر چکی تھیں، فارس کا نظام سلطنت درہم برہم تھا، حکومت سنبھالنے والے اہل اور لائق اشخاص نہ تھے، ارکان

سلطنت میں سازشیں ہوئی تھیں، مزدکیہ فرقہ کا زور تھا اسلام مذہب وعقیدہ سے تعرض نہ کرتا تھا، عیسائی فرقے ان کے معین ہو گئے تھے، روم کی سلطنت کم زور ہو گئی تھی اور عیسائیت کے باہمی اختلافات زوروں پر تھے۔

مولانا کے نزدیک واقعیت سے خالی نہ ہونے کے باوجود یہ جواب طرز استدلال کی ملمع سازی ہے سلطنتوں کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ پرزور قوی سلطنت کا مقابلہ نہ کر سکتیں، نہ یہ کہ عرب جیسی بے سروسامان قوم سے ٹکرا کر پرزے ہو جاتیں۔

ان کے نزدیک اس کا اصل سبب یہ تھا:

''مسلمانوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہ دولت جو جوش، عزم، استقلال، ہمت، بلند حوصلگی، دلیری پیدا ہو گئی تھی اور جس کو حضرت عمرؓ نے اور زیادہ قوی اور تیز کر دیا تھا، روم وایران کی سلطنتیں عین عروج کے زمانے میں بھی اس کی ٹکر اٹھا نہیں سکتی تھیں۔''(۱)

پھر وہ ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جنھوں نے قیام حکومت میں مدد دی اور جن میں سب سے مقدم دیانت داری اور راست بازی تھی جس کی بنا پر مفتوحہ ممالک کی رعایا مسلمانوں کی گرویدہ ہو جاتی تھی، ایک اور سبب یہ بتایا کہ مسلمانوں نے اول اول شام وعراق پر حملہ کیا، جہاں کثرت سے عرب آباد تھے جنھوں نے عیسائی ہونے کی وجہ سے اول اول مسلمانوں کا مقابلہ کیا لیکن قومی اتحاد کا جذبہ رائگاں نہیں جا سکتا تھا، بڑے بڑے رئیس جلد مسلمان ہو گئے۔(۲)

فتوحات فاروقی کو سکندر وچنگیز کی فتوحات سے تشبیہ دینا غلط اور بے محل بتایا ہے جن کی فتوحات قہر، ظلم، قتل عام کی بہ دولت تھیں، اسی لیے ان کی سلطنتیں دیرپا نہ ہوئی، فوری فتوحات کے لیے اس قسم کی سفاکیاں کارگر ہوئیں، حضرت عمرؓ کی فتوحات میں سرمو قانون انصاف سے تجاوز نہیں ہوا، آدمیوں کا قتل عام درکنار درختوں کے کاٹنے، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سے تعرض کرنے کی ممانعت تھی، باغیوں اور خائنوں کو جلاوطن کیا جاتا تو ان کی جائداد کی قیمت ادا کر دی جاتی۔ سفاک فاتحین خود شریک جنگ ہو کر فوج کو لڑاتے تاکہ اس کا حوصلہ بلند رہے مگر حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت کی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے، البتہ فوج کی باگ ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔(۳)

سکندر وغیرہ کی فتوحات گزرنے والے بادل کی طرح تھیں کہ ایک دفعہ زور سے آیا اور نکل گیا، ان لوگوں نے جو ممالک فتح کیے وہاں کوئی نظم حکومت نہیں قائم کیا، برخلاف اس کے فتوحات فاروقی میں یہ استواری تھی کہ جو ممالک اس وقت فتح ہوئے، تیرہ سو برس گزرنے پر آج بھی اسلام کے قبضے میں ہیں اور خود حضرت عمر کے عہد میں ہر قسم کے ملکی انتظامات وہاں قائم ہو گئے تھے۔

(۴) عام رائے یہ ہے کہ فتوحات میں خلیفہ وقت کی چنداں تخصیص نہ تھی، اس وقت کے جوش وعزم کی حالت خود تمام فتوحات کی کفیل تھی، مولانا کی رائے میں جوش واثر کی برقی قوت اسی وقت کام دے سکتی ہے جب کام لینے والا بھی اسی زور وقوت کا ہو، تمام فوج پتلی کی طرح ان کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی، غرض ان کے خیال میں فاروق اعظم کے بغیر یہ کل مطلق کام نہیں دے سکتی تھی۔ (۵)

یہ سب وجوہ واسباب بیان کر کے آخر میں یہ فیصلہ کرتے ہیں:

''جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے، آج تک کوئی شخص فاروق اعظم کے برابر فاتح اور کشورستاں نہیں گزرا۔'' (۶)

ایک غلط واقعہ اور اس کی تغلیط کے وجوہ کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے:

فتح ایران کے بعد شہنشاہ فارس یزدگرد کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں تو حضرت عمرؓ نے عام لونڈیوں کی طرح بازار میں ان کو بیچنے کا حکم دیا لیکن حضرت علیؓ نے خاندان شاہ کے ساتھ اس سلوک کو ناروا بتا کر مشورہ دیا کہ لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ کر کے کسی کے اہتمام وسپردگی میں ان کو دے دیا جائے اور خود اپنے اہتمام میں لے کر ایک امام حسینؓ کو اور دوسری محمد بن ابی بکر اور تیسری عبداللہ بن عمر کو عنایت کی۔

مولانا شبلی نے اس غلط قصے کی حقیقت یہ بتائی کہ علامہ زمخشری نے ربیع الابرار میں اس کو لکھا اور ابن خلکان نے امام زین العابدین کے حال میں یہ روایت ان کے حوالہ سے نقل کر دی، مولانا کے نزدیک اس کے غلط ہونے کی وجہیں یہ ہیں:

۱- زمخشری کو فن تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں، اس میں ان کا جو پایہ ہے وہ ظاہر ہے۔

۲- طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری، ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعے کو نہیں لکھا۔

۳- تاریخی حقائق اس کے بالکل خلاف ہیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں یزدگرد اور خاندان

شاہی پر مسلمانوں کو مطلق قابو نہیں حاصل ہوا، مدائن کے معرکے میں یزدگرد مع تمام اہل وعیال کے دارالسلطنت سے نکلا اور حلوان پہنچا جب مسلمان حلوان پر بڑھے تو وہ اصفہان بھاگ گیا اور پھر کرمان وغیرہ میں ٹکراتا پھرا، مرو میں پہنچ کر ۳۰ھ میں جو حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ ہے، مارا گیا، اس کی آل واولاد اگر گرفتار ہوں گے تو اسی وقت گرفتار ہوئے ہوں گے۔

۴- واقعہ کے وقت حضرت حسین کی عمر بارہ برس تھی، وہ ہجرت کے پانچویں سال پیدا ہوئے اور فارس ۱۷ھ میں فتح ہوا، اس لئے یہ امر بھی کسی قدر مستبعد ہے کہ حضرت علی نے نابالغی میں ان پر اس قسم کی عنایت کی ہوگی، اس کے علاوہ ایک شہنشاہ کی اولاد کی قیمت نہایت گراں قرار پائی ہوگی اور حضرت علیؓ نہایت زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

۵- حضرت عمرؓ کی تاریخ میں اس قسم کا واقعہ جو مسلم طور پر ثابت ہے، اس میں وہی برتاؤ کیا گیا جو تہذیب وانسانیت کا مقتضا تھا اور جو آج بھی تمام مہذب ملکوں میں جاری ہے، مصر پر چڑھائی میں حضرت عمرو بن العاص نے اول بلبیس پر حملہ کیا، اتفاق سے مقوقس بادشاہ مصر کی بیٹی جس کا نام ارمانوسہ تھا یہیں مقیم تھی، وہ بھی گرفتار ہوئی، عمر بن العاص نے اس کو نہایت عزت وحرمت سے مقوقس کے پاس بھیج دیا اور مزید احتیاط کے لئے اپنے ایک سردار کو جس کا نام قیس بن ابی العاص بھی تھا، ساتھ کر دیا کہ حفاظت کے ساتھ پہنچا آئے۔ (۱)

سوانح مولانا روم

مولانا شبلیؒ شاہ راہ عام پر چلنے کے عادی نہ تھے:

ع: نمی رویم براہے کہ کارواں رفتہ است

وہ اپنا راستہ سب سے الگ اور جدا نکالتے تھے، ان کی تصنیفات کے جاوداں ہونے کا یہی راز ہے۔

مولانا روم کو عام طور سے محض صوفی خیال کیا جاتا ہے اور دنیا ان کو ان کے فقر ودرویشی ہی کی حیثیت سے جانتی ہے اور ان کی مثنوی کو معرفت وسلوک کا خزانہ سمجھا جاتا ہے، جس میں مولانا نے تصوف وطریقت کے حقائق ونکات سمجھانے کے لئے فرضی قصے اور حکایتیں بیان کی ہیں، واعظین گرمی محفل کے لئے اس کے اشعار پڑھتے اور سر دھنتے ہیں اسی لئے وہ گروہ صوفیا میں بہت

مقبول ہے، لیکن مولانا شبلی کے خیال میں مثنوی میں اسلام کے جن عقائد واحکام اور اور حقائق ومعارف کو خوبی سے دلنشیں انداز میں سمجھایا گیا ہے، دراصل وہ علم کلام کے مباحث ہیں اسی لئے مولانا شبلی مولانا روم کو بلند پایہ متکلم سمجھتے تھے اور جب انھوں نے سلسلہ کلامیہ میں کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا تو علم الکلام، الکلام اور الغزالی کے بعد سوانح مولانا روم بھی لکھا اور مولانا رومی کو متکلم ہی کی حیثیت سے پیش کیا، لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق ومعارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بہ خود دل نشیں ہو جائیں، مولانا روم نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے، اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔'' (۲)

مولانا شبلی نے مولانا روم کی مثنوی پر مبسوط تبصرہ کر کے عقائد وکلام کے ان مباحث پر روشنی ڈالی ہے الٰہیات، صفات باری، نبوت، وحی، معجزہ، روح، معاد، جبر وقدر، تصوف، توحید، وحدۃ الوجود، مقامات سلوک، فنا، عبادت، تجاذب اجسام، تجاذب ذرات اور مسئلہ ارتقا وغیرہ۔

مولانا روم نے ان مسائل کی جس دل آویز اور دل نشیں انداز میں ترجمانی وتشریح کی ہے، مولانا شبلی کے مخصوص انداز اور دل کش اسلوب نے اسے مئے دوآتشہ بنا دیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی لکھتے ہیں:

> ''مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا، اس کی بیسوں شرحیں لکھی گئیں، بہت سے خلاصے ہوئے لیکن (جہاں تک معلوم ہے) صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے۔'' (۳)

مرزا احسان احمد مرحوم فرماتے ہیں:

> ''مثنوی کو ہزاروں بار پڑھنے کے بعد بھی اب تک یہ کسی کو محسوس نہ ہو سکا کہ مولانا نے حکایات وامثال کے پردے میں فلسفہ اور عقائد اسلام کے نہایت نازک اور دقیق مسائل کی تشریح کی ہے، یہ صرف علامہ کا سیر حاصل تبصرہ تھا جس نے سب سے پہلے اہل

نظر کو مثنوی کی حقیقی عظمت سے روشناس کرایا۔" (۴)

ادبی لالہ کاری

مولانا کے جاوداں کارناموں کے ذکر میں ان کی ادبی لالہ کاری کا ذکر بھی ضروری ہے، کیوں کہ وہ ایک فطری ادیب وانشاء پرداز تھے۔ اس ضمن میں ہم ان کی ادبی تصانیف، مکتوب نگاری اور شاعری کے متعلق کچھ عرض کریں گے۔

موازنہ انیس ودبیر

میر انیس مرحوم کی عام شہرت صرف ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے تھی، مولانا شبلی نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ میر صاحب کا کلام تمام اصناف سخن کا بہترین نمونہ اور گوناگوں امتیازی خصوصیات کا حامل ہے، اس سے ان کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ خود مولانا شبلی کی نکتہ سنج طبیعت، بلند ادبی ذوق اور نقد ونظر کی وسعت اور گہرائی کا پتا چلتا ہے، یہ میر انیس کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی اور ان کو پردۂ گم نامی سے نکالا۔

مولانا نے میر انیس کے شاعرانہ محاسن کو نمایاں کرنے کے لئے ان کا موازنہ مرزا دبیر سے کیا اور دکھایا کہ وہ میر صاحب سے کم درجہ کے مرثیہ نگار اور شاعر تھے، اس پر مرزا صاحب کے حامی بہت برہم ہوئے مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا شبلی نے میر انیس کی عظمت کا جو نقش دلوں پر بٹھا دیا تھا وہ جاوداں ہو گیا۔

کتاب کی ابتدا میں مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ بیان کرتے ہوئے فصاحت، ابتذال، بلاغت، واقعہ نگاری، روزمرہ، محاورہ، تشبیہ، استعارہ حسن تعلیل اور الفاظ کے تناسب اور بحروں کے انتخاب وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ بھی آج تک ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔

شعر العجم

یہ مولانا کی زیادہ اہم، بلند پایہ اور ممتاز ادبی تصنیف ہے جو اصلاً فارسی شاعری کی تاریخ ہے مگر اس کے باوجود وہ ایک لازوال ادبی وتنقیدی کارنامہ ہے، ان کے قلم کی بہار آفرینی اور ذہن کی نکتہ آوری نے شعر العجم کو ادب وانشا کا ایک چمن زار بنا دیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب وہوا، سرسبزی وشادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے

اور اس ذریعے سے انشاپردازی اور شاعری تک پہنچتا ہے، عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، صحرا، جنگل، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں، یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں، لیکن یہی عرب جب بغداد میں پہنچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا، ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، پورا ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار، آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام زمین تختۂ زمرد بن گئی، باد سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا، اس حالت کا یہ اثر ہوا کہ ایران کی تمام انشاپردازی پر رنگینی چھا گئی۔" (۱)

شعرالعجم کی ایک خاص خوبی اشعار کا حسن انتخاب ہے جو مولانا نے اپنے ادبی وتنقیدی دعووں کے ثبوت میں شعرا کے کلام سے پیش کیے ہیں، ان سے فارسی شاعری سے دل چسپی اور شعر فہمی کا صحیح اور عمدہ ذوق پیدا ہوتا ہے۔

مہدی افادی نے شعرالعجم پر نکتہ چیں حضرات کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ حسن وعشق کا صحیفہ اور فارسی کا تنقیدی تبصرہ ہے، ان کے خیال میں شعرالعجم تنقید عالیہ کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، صرف اردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پائے کی تصنیف موجود نہیں اور یہ دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا ایک خوب صورت مرقع ہے۔ (۲)

شعرالعجم تقریباً سو برس قبل لکھی گئی تھی، پروفیسر نذیر احمد کے خیال میں اس درمیان فارسی کا وافر مواد جمع ہوا جو مولانا کی دسترس میں نہ تھا لیکن اس کے باوجود اب تک کوئی کتاب ان موضوعات پر جس کا احاطہ شعرالعجم میں ہے، شعرالعجم جیسی وجود میں نہیں آسکی ہے، مولانا شبلی کی یہ تصنیف ہنوز نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے اور باوجود وسائل کی کمی کے ایسی کتاب مرتب ہوئی جو تاریخ شعروادب فارسی کے خطے کی تنہا حکم راں ہے۔" (۳)

مکاتیب

مولانا شبلی کے خطوط علمی وادبی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو اپنی تازگی، طرفگی،

ندرت، ایجاز، سخن گسترانہ انداز کے باعث خاص قدر و قیمت کے حامل ہیں، علی گڑھ جانے سے پہلے وہ زیادہ تر فارسی میں خط لکھتے تھے اور اپنی فارسی شاعری کی طرح اپنے فارسی خطوط کو زیادہ پسند کرتے تھے اور ان کا مجموعہ شائع کرنا چاہتے تھے، اردو خطوط کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے ماموں زاد اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے حقیقی بھائی مولوی رشید الدین انصاری مرحوم نے مولانا کے اردو خطوط جمع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کو لکھا ''میرے خطوط بالکل بدمزہ ہوتے ہیں، ان کو کیا جمع کرتے ہو، مجھ کو خود مزا نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا'' مولانا سید سلیمان ندوی نے الندوہ میں ان کے خطوط جمع کرنے کا اعلان کیا تو اس کو بھی پسند نہیں کیا۔ (۱)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، اس میں اپنا خوش نما نقش اور امتیازی شان چھوڑا، یہی امتیازی شان ان کے اردو خطوط میں بھی ہے مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں: ''ابتدا ہی سے ان کے خطوط اس قدر دل چسپ ہوتے تھے کہ ان کے قدیم وطنی احباب اور تلامذہ ان کو حرز جان بنا کر رکھتے تھے'' (۲) مہدی افادی کہتے ہیں: ''جس روز ڈاک میں مولانا کا خط ملتا تھا اس کا پڑھنا میرے لئے ایک ایسا عیش ہوتا تھا جسے کبھی نہیں بھولوں گا۔'' (۳)

مولانا کے خطوط کی اہمیت اس لئے بھی کہ ان میں ان کے حالات و واقعات زندگی اور ساری سرگرمیوں کی تفصیل ملتی ہے ان کی زندگی جس نشیب و فراز سے گزری، یہ خطوط اس سے بھرے ہوئے ہیں، ان کی علمی، تعلیمی، ادبی، سیاسی، قومی، نجی اور غیر نجی سرگرمیوں کی داستان بھی ان میں موجود ہے، ان کے تمام منصوبوں، ارادوں اور ان تمام کاموں کی تفصیل ملتی ہے جو وہ کر رہے تھے یا کرنا چاہتے تھے، شاگردوں کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں ان کی علمی و عملی تربیت اور حوصلہ افزائی پیش نظر تھی، مولانا کے خطوط کی اہمیت میں اصل دخل ان کی انشاپردازی اور ادبی بانکپن کا ہے، مولوی عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور ان میں یہ خطوط بھی ہیں جو بہ منزلہ سدا بہار کے ہیں اس لئے کہ یہ تکلف اور بناوٹ سے بری ہیں، یہ دلی جذبات اور خیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں، بے ریائی اور خلوص کی سچی تصویریں جن کے ادا کرنے میں ادبی تکلفات اور انشاپردازی کے داؤں

پیچ سے مطلق کام نہیں لیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، پڑھنے والوں کے دلوں کو لبھائیں گے اور ان کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔"

اردو کے مشہور نقاد آل احمد سرور مولانا کے خطوط کی ادبی گل کاری کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"خطوط شبلی کے مطالعہ کے بغیر آپ ایک عالم، ایک مصنف اور ایک مولوی تک پہنچ سکتے ہیں لیکن شبلی تک نہیں پہنچ سکتے جس کی حکیمانہ نکتہ سنجیوں اور شاعرانہ شوخیوں سے اردو ادب میں شادمانی اور رفعت آئی ہے۔"

مولانا شبلی کے مکاتیب کے دو حصے دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی سے چھپے ہیں، مولوی عبدالحق اور پروفیسر سرور نے اپنے تاثرات خطوط شبلی مرتبہ منشی محمد امین زبیری کے متعلق ظاہر کیے ہیں، اس مجموعہ کے خطوط عطیہ فیضی اور زہرا بیگم کے نام ہیں جو بمبئی کی اعلا تعلیم یافتہ اور علم دوست خواتین تھیں، جن کے ذوق علم وادب اور علوم وفنون سے شیفتگی کی بنا پر مولانا کو ان سے بڑی دلچسپی ہوگئی تھی اور وہ ان کی ذہنی ودماغی تربیت اور علمی وتعلیمی رہنمائی کرنا چاہتے تھے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم پروفیسر رشید احمد صدیقی کے حوالے سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح سوسائٹی میں لوفر ہوتے ہیں اسی طرح علم وادب کے کوچے میں بھی لوفر ہوتے ہیں جو اپنی ہی طرح سب کو بوالہوس سمجھتے ہیں۔

مولانا کا ہر خط خواہ کسی کے نام ہو ادبی رعنائیوں سے خالی نہیں، لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے: "ان کا ہر خط زعفران کا ایک پھول ہے جس میں باغ فردوس کی خوش بو ہے۔" مولانا کے خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت برجستگی، بے ساختگی اور بے تکلفی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی عالمانہ شان اور پروقار متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور مکتوب الیہ کے درجہ ومرتبہ کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔

ان کے خطوط کی ایک خوبی طنز ومزاح کی لطیف آمیزش اور چاشنی ہے جس میں ابتذال ورکاکت نہیں آنے دیتے تھے، ان کی نکتہ آفرینی طنزیہ فقروں میں بڑا مزہ اور لطف دیتی ہے۔

مولانا کے مکاتیب عموماً مختصر ہوتے ہیں مگر انشاپردازی اور بلاغت کا کمال اور انداز بیان کی شیرینی وشگفتگی ہر جگہ جلوہ گر ہوتی ہے، چند ہی لفظوں سے جادو پھونک دیتے ہیں، ایجاز ان کی ہر تحریر کا خاصہ ہے مگر جو ایجاز ان کے خطوط میں ہے اسے بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ: "جان اعجاز ہی

کہا جا سکتا ہے۔" ان کے خطوط کا ایک لفظ بھی زائد، بے کار اور بلا ضرورت نہیں ہوتا تھا، جچے تلے اور ضروری لفظوں کی وجہ سے اس میں ایک عجیب تاثیر ہوتی ہے وہ ایک ہی چبھتے ہوئے فقرے سے، ایک ہی مصرعے سے، ایک ہی استعارے یا ترکیب سے، ایک ہی طنزیہ چھیڑ سے اپنے خطوں کو لذتوں اور کیفیتوں سے معمور کر دیتے ہیں۔

وہ بہت سے خطوط بغیر القاب کے لکھتے تھے گویا کاغذ ہی پر گفتگو کر رہے ہیں، بعض خطوط مکالمے کی شکل میں لکھتے تھے جس کو وہ خود باہمی گفتگو سے تعبیر کرتے تھے، یہ سب غالب کے رنگ کا اثر تھا بہ قول مہدی "غالب زندہ ہوتے تو ان کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی" کیوں کہ مولانا نے بھی غالب کی طرح مراسلے کو مکالمہ اور خطوط کو گفتگو کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔

شاعری

مولانا کے شاعرانہ کمالات کا خاص میدان ان کی فارسی غزلیں اور قصائد ہیں، یہ اردو شاعری کے مقابلے میں زیادہ بلند پایہ ہیں، خصوصاً غزلوں میں ان کی سرمستی، رنگینی، زندہ دلی، جوش ومستی، نازک خیال اور بیان کی شوخی ورعنائی، زور بلاغت اور نفاست وسلاست خواجہ حافظ کی یاد دلاتی ہیں، مولانا حالی نے بھی بڑی داد دی ہے، معلوم ہوتا ہے ایران کا کوئی دل فریب منظر غزلیات میں مکمل طور سے موجود ہے جو اکثر بمبئی کی ولولہ انگیز اور طرب زا آب وہوا میں کہی گئی ہیں۔

مولانا نے اردو میں تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، ان کی مثنوی صبح امید مولانا عبدالماجد دریابادی کے خیال میں "بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر اور گلزار نسیم کی ہم ادا اور ترانہ شوق کی ہم نوا ہے۔"

سیاسی موضوعات پر جو نظمیں کہی ہیں ان میں اکثر طنز کے تیر ونشتر کی وجہ سے بڑی موثر اور دل آویز ہیں، تاریخی، مذہبی اور اخلاقی نظمیں بھی اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں، انھیں اسلامی تاریخ کے پر اثر اور قابل فخر کارناموں کو منظوم کرنے کا خاص سلیقہ تھا، ان نظموں میں بھی بڑی تاثیر اور کشش ہے، مولانا نے اپنے دور کے بعض ممتاز اشخاص کے مرثیے بھی لکھے ہیں مگر یہ سب فارسی میں ہیں، اپنی زندگی کے سب سے آخری سانحے یعنی اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل الہ آباد ہائی کورٹ کی وفات پر جو دل دوز نوحہ کہا ہے، وہ اردو کے بہترین مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔

حسن اسلوب

تقریر وتحریر کی اصل خوبی تاثیر اور دل نشینی ہے، ان ہی سے تصنیف کو دوام اور جاودانی نصیب ہوتی ہے، اس کے لئے رعنائی خیال کی طرح حسن بیان بھی ضروری ہے، ادب وانشا کے معراج کمال پر پہنچنے کے لئے طرز تحریر اور اسلوب بیان کا موثر اور دل پذیر ہونا ضروری ہے، مولانا شبلی کے بڑے ادیب وانشا پرداز ہونے کا سبب بھی ان کے طرز تحریر کی خوبی ودل کشی اور اسلوب بیان کی رعنائی اور دل آویزی ہے، ہم اختصار کی وجہ سے صرف اس کی چند خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں:

١- مولانا کے موضوعات تحریر میں بڑی وسعت اور تنوع ہے، اس کے باوجود ان کی ہر تحریر میں چاہے وہ کسی موضوع پر ہو بڑی روانی، برجستگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے اور وہ خاص اثر اور جاذبیت رکھتی ہے، اس وصف میں وہ دوسرے مصنفین اور اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز ہیں، اس کا انداز ایک ہی طرح کے عنوانات پر مولانا کی اور دوسروں کی تحریروں کے مقابلہ سے بہ خوبی ہوتا ہے، اوروں کے یہاں مولانا کی طرح تنوع بھی نہیں ہے۔

٢- مولانا محمد حسین آزاد کو مولانا شبلی اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کہتے تھے، ان کی تحریروں کی اٹھان کس قدر شان دار ہوتی ہے، غضب کی آمد، بلا کا زور اور عجیب روانی اور برجستگی ہوتی ہے لیکن مولانا شبلی کی تحریروں میں جو اتار چڑھاؤ اور متانت وجزالت ہوتی ہے وہ مولانا آزاد کے یہاں مفقود ہے، مولانا شبلی کی برجستگی کا لطف اس وقت زیادہ ملتا ہے جب وہ کسی آیت یا مصرع کو اپنی تحریر میں کر شامل لیتے ہیں۔

٣- مولانا شبلی کو فارسی ترکیبوں کے استعمال کا بڑا سلیقہ تھا، اس سے ان کی تحریر میں زور، روانی اور بڑی اثر انگیزی پیدا ہو جاتی، ''ظہور قدسی'' میں فارسی کی خوش گوار ترکیبوں اور خوش نما استعاروں کو کتنی بے ساختگی کے ساتھ استعمال کیا ہے جس سے عبارت بڑی وجد آفریں اور دل نشیں ہوگئی ہے۔

٤- بے ساختگی مولانا کی تحریر کی بڑی خوبی ہے، انھیں اپنی کسی تحریر کے لئے تکلف واہتمام نہیں کرنا پڑتا خود بہ خود آمد ہوتی ہے، وہ ہر بات اس طرح بے ساختہ کہتے ہیں کہ ایک لفظ بھی زائد اور بے ضرورت نہیں معلوم ہوتا، بے ساختگی کے باوجود تحریر کا شکوہ وتجمل قائم رہتا ہے۔

۵- سادگی بھی مولانا کی تحریر کا خاص امتیاز ہے وہ تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتی ہے، اس کے باوجود اس میں حسن ولالہ کاری اور جاذبیت ہوتی ہے۔

۶- ایجاز واختصار مولانا کی سب سے نمایاں خوبی ہے، جن چیزوں کو لوگوں نے کئی کئی صفحوں میں لکھا ہے، انھوں نے ان کو چند سطروں میں لکھا ہے، مگر اظہار مطلب میں کہیں خلل نہیں آنے دیا، وہ جب کسی واقعے پر قلم اٹھاتے ہیں تو مغز لے لیتے ہیں اور حشو کو چھوڑ دیتے ہیں، رطب ویابس اور معمولی اور سطحی باتوں کو سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف مفید ضروری اور قابل یقین اجزا ہی کو ہاتھ لگاتے ہیں اس کے باوجود کوئی قابل ذکر اور ضروری الاظہار بات چھوٹنے نہیں پاتی۔

طویل واقعات اور وسیع مفہوم کو ایسے الفاظ اور استعاروں میں ادا کرتے ہیں کہ تطویل واطناب سے کام نہ لینا پڑے، حضرت عمرؓ کا قبول اسلام تاریخ اسلام کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے، اس کو عام مورخین وعلمائے طبقات نے بہت پھیلا کر لکھا ہے لیکن مولانا نے اسے بڑے اختصار سے بہت موثر لکھا ہے۔

مولانا نے حضرت عمرؓ کے رعب داب کی تصویر کشی میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے لیکن ان چند فقروں نے جو زور واثر پیدا کر دیا ہے وہ سیکڑوں صفحے سیاہ کرنے سے بھی نہیں پیدا ہو سکتا تھا ملاحظہ ہو:

> ''سکندر اور تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا، عمر فاروق کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا کچھ اور نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آ گیا۔'' (۱)

حواشی:

(۱) سیرۃ النبیؐ (مقدمہ) جلد اول ص ۶۲ طبع جدید ۲۰۰۳ء۔

(۲) سیرۃ النبیؐ (مقدمہ) جلد اول ص ۶۵-۶۶ طبع جدید ۲۰۰۳ء۔

(۳) مقالات شبلی جلد ششم ص ۱۱۵_۱۳۷۱ھ/ 1951ء۔

(۴) مقالات شبلی حصہ اول (مذہبی) ص ۸، ۷ او ۹ ۷ اجدید ایڈیشن ۱۹۹۹ء معارف پریس اعظم گڑھ۔

(۵) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۸۵۔۱۹۹۹ء معارف پریس اعظم گڑھ۔

(۶) ایضاً ص ۷۵۔

(۷) یہ وہ پرگنے ہیں جو مہارانہ اودے پور نے جزیے کے عوض میں دیئے تھے۔

(۸) روزنامہ آزاد ہند کلکتہ ۹ رجنوری ۲۰۰۷ء ص ۲۔

(۹) اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ص ۶۴ تا ۶۷۔۱۹۹۹ء معارف پریس اعظم گڑھ۔

(۱۰) الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی ص ۳۔۱۹۹۸ء مطبع معارف اعظم گڑھ۔

(۱۱) حیات شبلی ص ۵۸۱۔۱۹۸۳ء طبع چہارم مطبع معارف اعظم گڑھ۔

(۱۲) الانتقاد ص ۱۷۔

(۱۳) ایضاً ص ۱۹۔

(۱۴) زمانہ جاہلیت میں سیلاب کی وجہ سے ایک بار کعبہ منہدم ہوگیا تھا، قریش نے جب دوبارہ اس کی تعمیر کرائی تو وسعت نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑا سا حصہ تعمیر ہونے سے رہ گیا تھا جس کے گرد قریش نے دیوار کھنچوادی تھی، اس خالی حصے کو حطیم کہا جاتا ہے، ابن زبیر نے جب کعبہ کی مرمت کرائی تو یہ حطیم بھی کعبہ کی اصل عمارت میں شامل کردیا، ان کا یہ فعل اہل شام کے خیال میں غلط تھا، حجاج نے اسی اضافے پر سنگ باری کی تھی۔

(۱۵) الانتقاد ص ۱۷-۲۰۔

(۱۶) الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی لجرجی زیدان ص ۳۶-۳۷۔

(۱۷) سیرۃ النبیؐ (مقدمہ) حصہ اول ص ۵ طبع جدید۔

(۱۸) ایضاً ص ۶۔

(۱۹) ایضاً۔

(۲۰) مکاتیب شبلی حصہ اول مکتوب بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نمبر ۱۰۴ ص ۲۰۲۔

(۲۱) ایضاً مکتوب بنام منشی محمد امین زبیری نمبر ۱۲ ص ۲۴۲۔

(۲۲) سیرۃ النبی جلد اول (مقدمہ) ص ۵۔

(۲۳) مقالات شروانی ص ۳۸، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ ۱۹۴۷ء۔

(۲۴) مقالات احسان ص ۶۹و۷۰ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء/ ۱۳۸۷ھ

(۲۵) الفاروق (تمہید) ص ۱۵، معارف پریس ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ۔

(۲۶) ایضاً۔

(۲۷) الفاروق (تمہید) ص ۱۸ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۶ھ

(۲۸) ایضاً۔

(۲۹) ایضاً ص ۱۷۔

(۳۰) ایضاً ص ۱۸۔

(۳۱) الفاروق حصہ دوم ص ۵، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/۱۳۷۳ھ

(۳۲) ایضاً ص ۵ و ۶۔

(۳۳) ایضاً ۷ و ۸۔

(۳۴) ایضاً ص ۹۔

(۳۵) ایضاً ص ۱۰۔

(۳۶) ایضاً ص ۱۰۔

(۳۷) الفاروق حصہ دوم ص ۱۹۰ و ۱۹۱۔

(۳۸) سوانح مولانا روم (دیباچہ) ص ۳، معارف پریس اعظم گڑھ طبع جدید۔

(۳۹) حیات شبلی ص ۳۷۶ معارف پریس اعظم گڑھ طبع چہارم ص ....

(۴۰) مقالات احسان ص ۹۴، مطبع معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء/۱۳۸۷ھ۔

(۴۱) شعر العجم جلد چہارم ص ۱۷۷ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء۔

(۴۲) معارف (مضمون شبلی سوسائٹی) ج ۲ عدد ۱۲ ر جون ۱۹۱۸ء ص ۲۰ و ۲۱۔

(۴۳) معارف جنوری ۱۹۸۰ء ص ۱۳ جلد...... عدد ۱۔

(۴۴) مکاتیب شبلی حصہ اول (دیباچہ) ص ۵ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء۔

(۴۵) ایضاً ص ۳۔

☆☆☆

سوانح مولانا روم

پروفیسر کبیر احمد جائسی ☆

علامہ شبلی نعمانی کی تصانیف میں ''سوانح مولانا روم'' ایک منفرد کتاب ہے جو لکھی تو گئی ہے ایک فارسی شاعر کی شہرہ آفاق مثنوی پر مگر خود مصنف نے اس کو ''سلسلۂ کلامیہ کا چوتھا نمبر'' شمار کیا ہے اور اپنی اس تصنیف کو ''علم الکلام'' الکلام اور ''الغزالی'' کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، اس تصنیف کے دو حصے ہیں، ایک حصہ میں علامہ شبلی نے اپنے مخصوص انشاپردازانہ انداز میں مولانا روم کے سوانح تحریر کئے جو غالباً مولانا روم کی سوانح پر اردو کی پہلی کتاب ہے، یہ حصہ مولانا روم کے تین خرد معاصروں (۱) کی کتابوں سے بیشتر مواد اخذ کر کے تحریر کیا گیا ہے، جن دیگر ماخذ سے علامہ شبلی نے مزید استفادہ کیا ہے وہ قدرے بعد کے ہیں، اسی حصہ میں مولانا روم کے سلسلۂ باطنی، ان کے معاصرین اور ارباب صحبت، اخلاق وعادات کے موضوعات کا مختصر ذکر ہے اور یہ تمام موضوعات کتاب کے ۴۴ صفحات پر محیط ہیں، دوسرا حصہ تصنیفات کے نام سے شروع ہوتا ہے اور تین تصانیف فیہ مافیہ، دیوان (جو عام طور سے دیوان شمس تبریز کے نام سے معروف ہے) اور مثنوی کے تعارف پر مشتمل ہے جس کو دو صفحات میں سمیٹ کر صفحہ ۴۷ سے ۴۶ تک ''دیوان'' پر مزید اظہار خیال کرنے کے بعد اصل موضوع یعنی مثنوی کو ہدف مطالعہ بنایا گیا ہے۔ ''مثنوی'' کے کلامی پہلو اور اس کے ان مباحث پر نظر ڈالنے سے پہلے جن کی بنا پر علامہ شبلی نے اپنی اس تصنیف کو ''سلسلۂ کلامیہ'' میں داخل کیا ہے، صفحہ ۴۶ سے ۸۰ تک علامہ نے مثنوی کے سبب تصنیف وغیرہ کو بیان کرنے کے بعد اصل موضوع کا رخ کیا ہے جو صفحہ ۸۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۵۶ پر ختم ہوتا ہے گویا یہ کتاب جس غرض اور مقصد کے لئے تحریر کی گئی اس کو علامہ شبلی نے کتاب کی نصف ضخامت میں تحریر فرما کر اپنے تحلیل

☆ سابق صدر، شعبہ ایرانین اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

وتجزیہ کے نتائج اپنے قاری کے سامنے پیش کردئے ہیں۔

یوں تو علامہ شبلی اپنی دیگر کلامی تصانیف میں "علم کلام کیا ہے" کے موضوع پر اظہار خیال کر چکے ہیں مگر اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے "الکلام" اور "علم الکلام" کا مطالعہ نہیں کیا ہے، سوانح مولانا روم میں بھی مختصر ترین الفاظ میں یہ تحریر فرمادیا ہے کہ ان کے نزدیک علم کلام کیا ہے، ایسا کرنا مولانا شبلی نے اس لئے ضروری سمجھا کہ ان کو مثنوی مولانا روم کی کلامی خصوصیات کو نمایاں کرنا تھا، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق ومعارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بہ خود دل نشیں ہوجائیں، مولانا روم نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔" (۲)

یہاں پر اس بات کا بھی ذکر کردیا جائے کہ اپنی اس رائے کے باوجود علامہ شبلی آگے چل کر مثنوی کے بارے میں ایک ایسی بات فرما گئے ہیں جس کو اُن کی درج بالا رائے سے تطبیق دینا ہمارے لئے ناممکن معلوم ہورہا ہے، فرماتے ہیں:

"مثنوی کا بڑا حصہ اُس (اُن؟) مسائل کے بیان میں ہے جو دقیق النظر علماء کی سمجھ میں بھی مشکل سے آسکتے ہیں یہاں تک کہ بعض بعض مقامات باوجود بہت سی شرحوں کے آج تک لاینحل ہیں" (۳)

ظاہر ہے کہ جس کتاب میں نظم کے پیرائے میں الٰہیات، صفات باری، نبوت، معجزہ، روح، معاد، جبر وقدر، تصوف، توحید اور فلسفہ وسائنس جیسے دقیق مسائل پر اظہار خیال ہوگا اگر اس کے کچھ اجزا یا مقامات "لاینحل" ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، یہاں پر اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تصوف کے عنوان سے علامہ شبلی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کی ابتدا ہی میں انھوں نے حاشیہ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "تصوف کے عنوان کو میں نے بہت مختصر لکھا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کوچے سے بالکل نابلد ہوں" (۴) اس "اعتراف حقیقت" کے باوجود علامہ شبلی نے پوری دیانت داری اور ماہرانہ دقیق النظری سے صوفیاء کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے مولانا روم کے بہت سے ایسے اشعار مثنوی سے ڈھونڈ نکالے ہیں جو صوفیاء کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے

والے بلکہ ان کے ترجمان ہیں۔

علم کلام میں معاد کے مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقائد کے اہم ترین مسئلوں میں سے ایک بلکہ اہم ترین مسئلہ ہے، مثنوی مولانا روم میں اس مسئلہ کو اشعار کے ذریعے واضح انداز سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاعری شاعری ہی ہے منضبط علم کلام نہیں، ہمارے متکلمین نے معاد کے سلسلے میں جو باتیں تحریر کی ہیں، ان سے علامہ شبلی مطمئن نظر نہیں آتے اور معاد کے سلسلے میں امام رازی اور ان کے مقلدین کا جو نظریہ ہے اس کو "سینہ زوریوں" سے تعبیر کرتے ہوئے ان کو تفریح طبع کے قابل گردانتے ہیں (۵) اب وقت آگیا ہے کہ اس مسئلہ پر کھل کر بحث ہونی چاہئے کہ کیا واقعی امام رازی اور اُن کے مقلدین کی "سینہ زوریاں" تفریح طبع کے قابل ہیں؟

علم کلام کا ایک اور اہم مسئلہ "جبر وقدر" کا ہے مولانا روم نے اپنی مثنوی میں کھل کر اپنے عقیدہ کا اظہار کیا ہے علامہ شبلی اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "مولانا کے زمانے میں جو عقیدہ تمام اسلامی ممالک میں پھیلا ہوا تھا وہ جبریہ تھا کیوں کہ اشاعرہ کا عقیدہ درحقیقت جبر ہی کا دوسرا نام ہے، چنانچہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں سیکڑوں جگہ صاف صاف جبر کو ثابت کیا ہے اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو مستقل ایک کتاب اس مضمون پر لکھی جس میں سیکڑوں عقلی اور نقلی دلیلوں سے جبر کو ثابت کیا ہے (یہ کتاب اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے)
>
> باوجود اس کے مولانا روم کا عام عقیدے سے الگ روش اختیار کرنا اُن کے کمال اجتہاد بلکہ قوت قدسیہ کی دلیل ہے۔" (۶)

اس باب میں علامہ شبلی نے اپنے مخصوص عالمانہ اور انشاپردازانہ انداز میں مولانا روم کی "قوت قدسیہ" کی مثالیں مثنوی کے مختلف مقامات سے چن چن کر زیب قرطاس کی ہیں اور اس طرح مولانا روم کو قدریوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

میرے نزدیک سوانح مولانا روم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ شبلی کے عہد حیات میں جو نئے نئے علوم متعارف ہوئے ان کے نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے مثنوی

سے ڈھونڈھ کر ایسے اشعار نکال کر اُن کو موضوع بحث بنایا جن پر مولانا روم صدیوں پہلے اظہار خیال کرتے ہوئے انہی نتائج پر پہنچے تھے جن پر علامہ شبلی کے عہد حیات کے فلسفی اور سائنسداں پہنچ رہے تھے، علامہ شبلی کی یہ روش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دور کے جدید علوم پر بھی ماہرانہ نظر رکھتے اور اپنے قدیم سرمائے کو پرکھتے وقت جدید علوم سے بھی استفادہ کرتے ہوئے قدیم کی اہمیت ومعنویت کو اجاگر کرتے تھے، ہماری ناقص رائے سوانح مولانا روم اس کی بہترین مثال ہے۔

حواشی:

(۱) مولانا روم کے فرزند بہاء الدین سلطان ولد (۶۲۳ھ ۱۲ھ ۷) کی کتاب ''ولد نامہ'' شمس الدین احمد افلاکی کی کتاب ''مناقب العارفین'' تالیف ۷۱۸ھ (یہ مولانا اور سلطان ولد دونوں کے معاصر تھے) اور فریدون بن احمد سپہ سالار کا رسالہ جو مولانا روم کے حالات میں ہے، صحیح سنہ تالیف کا علم نہیں، تحقیق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ رسالہ ۷۱۹ھ اور ۷۲۹ھ کے درمیان لکھا گیا تھا۔

(۲) سوانح مولانا روم، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، مقدمہ ص ۳۔

(۳) ایضاً ص ۵۳۔

(۴) ایضاً ص ۱۳۵۔

(۵) ایضاً ص ۱۱۸۔

(۶) سوانح مولانا روم، ص ۱۳۹۔

☆☆☆
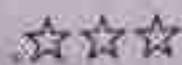
شبلی کی انتقادی فکر کا ثقافتی منظر نامہ

پروفیسر عبدالحق ☆

شبلی شاعر و ادیب یا مصنف و مورخ ہی نہیں، ذکر و فکر میں مجتہد اور مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں، ہماری دانشوری ان کے تفکر اور تجدد کی مرہونِ نظر ہے، شیخ محمد اکرام نے پیش کلام کے طور پر شبلی کے تعارف میں چند اشعار قلمبند کئے ہیں جن کا مفہوم ہے کہ میں نے اکثر رازی و غزالی کے افکار سے سیرابی حاصل کی ہے۔ شیراز کے نغمہ سراؤں سے ہم آواز رہا ہوں اور حجازی آہنگ کے اسرار کا راز داں بھی ہوں، میں وہ قابل رشک گوہر فروزاں ہوں کہ جس کا نور ہر بزم میں جلوہ ساماں ہے، ان کے بہت سے تصورات پردۂ راز میں ہی رہ گئے، انھیں موقع میسر نہ آسکا کہ اظہار میں آتے، وہ خود ایک پراسرار شخصیت کے مالک تھے۔

صد حرفِ راز بود نہاں در نگاہ من

واقعہ یہ ہے کہ شبلی جیسی نوع بنوع اور تازہ و تابندہ شخصیت اردو کیا دوسری ادبیات میں مشکل سے ملے گی۔ تاریخ و تمدن، فلسفہ و مذہب، سیرت و سوانح، شعر و ادب، نقد و انتقاد، عرفان و ادراک سے بہرہ مند، قومی حمیت و عزت سے سرفراز، کارگہ تخلیق میں انمول فن پاروں کی پرورش کرنے والے شبلی ہی ہیں، ان سب سے قطع نظر وہ اثر آفریں اسلوب کے سحر ساز صاحبِ طرز ادیب ہیں، جس میں نثر و شعر کے کمالِ امتزاج کی دل کشی دامنِ احساس کو دردل کی کشادگی بخشتی ہے، حافظ کے بعد سرمستی و سرشاری دیکھنی ہو تو شبلی کی فارسی غزلوں سے رجوع کیجئے۔ اردو میں واقعاتی اور احتجاجی شاعری کی ابتدا بھی شبلی کی مرہون منت ہے۔ شبلی کو اپنی گوناگوں شخصیت کا بہ خوبی علم

☆ سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

ہے۔ ان کا اعتراف بدیہی حقیقت رکھتا ہے۔

شبلی امروز بود بلبل بستانِ سخن

وہ اپنے عہد کے ہی نہیں، صدیوں تک ادبی فیضان کے مصدر بنے رہیں گے۔ اگر شبلی کو اپنی نگارشات پر ناز تھا تو بے جا نہ تھا، ان جیسا ابھی تک کوئی صاحب طرزِ اسلوب پیدا نہ ہو سکا، بلکہ آج تک ان کی پیروی میں نثر نگاروں کی جماعت سرگرداں ہے۔

بہ آب و رنگ نظم خویشتن نازد چناں شبلی

کہ در اقلیم معانی کہنہ استاذ است پنداری

اسے تفاخر کہیں یا عظیم فن کاروں کی طرح احساس برتری کا برملا اظہار، لیکن یہ حقیقت ہے کہ شبلی کو خودنگری وخود اعتمادی اور حمیت کا بھرپور عرفان ہے۔ کلام میں بارہا اعتراف کیا ہے ان کے مزاج، افتاد اور محسوسات کی دنیا عظمت وفراز سے معمور ہے، فکر ہو یا موضوع سخن، افراد ہوں یا ادب، وہ جلال وجبروت کی انتہاؤں سے شغف رکھتے ہیں۔ برنائی کے اسی احساس کے باعث وہ اردو کو بھی اظہار کے لیے فروتر ہی سمجھتے رہے۔ ''سیرۃ النعمان'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نہ بود

حرف بہ اردو زدن آئیں نہ بود

کیا خبر تھی کہ غالب کی طرح مقبولیت کا مدار اُردو سے ہی قائم ہوگا، شبلی کے شایانِ شان ان کی خدمات کا اعتراف ہنوز باقی ہے، اقبال وغالب کے بعد ہم سب سے زیادہ شبلی کے ہی شکر گزار ہیں جن کی اردو تصانیف کے بین الاقوامی زبانوں میں ترجمے ہوئے، کسی اردو ادیب کی نثری کتابوں کو یہ افتخار نصیب نہ ہو سکا کہ ان کے انگریزی، فرانسیسی، عربی اور فارسی ترجموں نے ذہن انسانی کے عالمی افق تک رسائی حاصل کی ہو، کائنات کی سب سے برگزیدہ شخصیت سے وابستہ عقیدت کے علاوہ سیرت نگاری کی شاہکار حیثیت رکھنے والی کتاب اردو کی ہی تحریر ہے۔

سیرۃ النبیؐ سے صرف نظر بھی کر لیجیے، کسی تنقیدی کتاب کو بیرونی زبان میں منتقل کئے جانے کی نظیر بھی اردو میں ہے؟ یہ امتیاز شعر العجم کو حاصل ہے۔ یہ صرف ادبی تاریخ نہیں ہے بلکہ شبلی کی شخصیت کی طرح یہ تنقیدی مباحث کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں ایک معنوی ربط بھی

ہے، وہ شعرالعجم سے فرصت پا کر سیرت کی طرف متوجہ ہوئے، سیرت میں شعرالعجم کے اسالیب کا در آنا بھی قابل توجہ ہے۔

شبلی نے دنیائے تخلیق کے غیر معمولی ذخیرۂ ادب فارسی کو منتخب کیا ہے، اردو میں بھی کسی ایک منفرد شاعر کی جگہ اہم تخلیق کاروں کے موازنہ اور مطالعے کو صنف شعر کے حوالے سے موضوع قلم قرار دیا ہے، موضوع کی رفعتوں سے شبلی متاثر ہوئے تھے، وہ مرثیہ سے کم متاثر تھے، مگر اس صنف کے شہیدوں اور جاں سپاروں سے انھیں زیادہ سروکار تھا، گویا شخصی اکتسابات سے قطع نظر شبلی کی نگاہ میں افراد کے تخلیقی مظاہر زیادہ توجہ طلب رہے، جن کے عصری رویوں اور رجحانات کی تفہیم ممکن ہے، کلی یا اجتماعی شعور کو سمجھنے کے لئے اس عہد کے مصادر کی اساسی اہمیت ہوتی ہے، جس سے شبلی کو سروکار رہا ہے۔ ادب کو وسیلہ آسائش اعصاب کے مفروضے کی تنگ نائی سے نکال کر شبلی نے اسے اجتماعی احساس واعمال کا آئینہ خانہ بنا دیا، جس میں عصرِ رواں کے سیاق وسباق میں بشری تفاعل کی تصویریں بیش وکم کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہیں۔ تخلیق کی اس برگزیدگی کا تصور شبلی سے پہلے نایاب نہ سہی کمیاب ضرور تھا۔

شبلی کی ادبی بصیرت کو آفریں کہتا ہوں، جس نے ادبی اقدار کو عظمت اور ناگزیر اہمیت بخشی، پارۂ تخلیق میں نوع بشر کی مساعی اور ممکنات کی تلاش شبلی کی ادبی عبقریت اور نظری نہاد ہے، جس نے صد سالہ انتقادی موشگافیوں کے سیل میں بھی شبلی کی ادبی استقامت کو لغزش نہ آنے دی۔

شبلی کے پیش نظر اجتماعی شعور کے مغربی فکر کا تصور نہ تھا لیکن فرد اور معاشرے کے اساسی تصورات اور ان کی اہمیت سے مشرق بھی بیگانہ نہ تھا، صحف سماوی میں انفس وآفاق کی ابدیت کے ساتھ فرد کے معاشرتی وجود پر بڑی نکتہ رسی کی گئی ہے جس کے نتیجے میں فرد کے احساس وسکنات میں اجتماعی آہنگ کی کارفرمائی کو قانونِ فطرت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

چند افراد ہی تخلیقی توانائی سے سرفراز ہوتے ہیں، جو عصری ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں، ایک قلم کار کی تخلیق مرکز محسوس کا درجہ رکھتی ہے، کیوں کہ اس میں پوری معاشرت کا سوز وساز شامل ہوتا ہے، اسی وجہ سے فن کار کو بینائے قوم کہا جاتا ہے۔

سوز وساز سے خالی تخلیق کو افسانہ وافسوں سے تعبیر کر کے اسے ہمیشہ غیر پسندیدہ سمجھا گیا

ہے، پھر شبلی جن کی سرشت اجتماعی خمیر سے عبارت ہو ان سے صرف نظر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تخلیقی انتقاد کا یہ نقطۂ نظر ان کی تحریروں میں بہت واضح ہے اور عملی طور پر یہ دیکھیے تو شبلی اردو شاعری میں اپنے عہد و احساس کی ترجمانی میں مجتہد نظر آتے ہیں۔ ہماری شعری وراثت میں شبلی و اقبال دو ایسے بزرگ فن کار ہیں جن کی تخلیقات سے اس دور کی تاریخ کے نمایاں نشیب و فراز کی دل دوز داستان دہرائی جا سکتی ہے۔ تہذیبی کشاکشوں کی اس ترجمانی میں ہمارے بہت سے مؤقر ادیبوں کا کلام خالی نظر آتا ہے۔ شبلی کی نثری تصانیف بھی ایک عصری جواز رکھتی ہیں، شبلی کو زود حس بتایا گیا ہے۔ وہ ایک مضطرب دل رکھتے ہیں جو واقعات پر مشتعل ہو جاتا اور برملا حرف و صوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جذبات کی فراواں کیفیات سے شبلی کا قلم رواں دواں رہتا ہے۔ انھیں تاثراتی اور جمالیاتی نقاد کہہ کر ان کی ہمہ گیر تنقیدی بصیرت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی جو سعی رائیگاں بن گئی۔ تحسین و تشریح انتقاد کی بدیہی حقیقت ہے۔ یہی قاری کی تشویق کو مہمیز کرتی ہے۔ تنقید دراصل تخلیق اور ترسیل کے مابین ایک مؤثر حکم کا منصب رکھتی ہے، جو فیصلے کے صدور سے گریز کرتی ہے، بلکہ وہ فن کی قرأت اور قربت کے لیے قاری کو تشویق اور تفاعل بخشتی ہے۔ اس اساسی عنصر سے خالی تنقید بے سوادی اور کم نگاہی کے سوا کچھ نہیں ہے اور گمرہی پھیلانے کی موجب بنتی ہے، جیسے کہ موجودہ تنقید موہوم اور مبہوم تصورات کی مدعی ہے، انتقادی اکتسابات میں موازنہ اور شعر العجم کے علاوہ چند مقالے اور کچھ شذرات ہیں جو مختلف زمانوں میں لکھے گئے، شبلی نے تنقید میں نہ تو فلسفہ پیش کیا ہے اور نہ ہی کسی دبستان کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کے نزدیک فن کی تشریح اور تخلیق کو تحریک دینے اور تہذیبی اقدار کی بازآفرینی تنقید ہے جو فن کے مطالعہ یا اس تک رسائی کے لیے تشویق و ترغیب دینے کی موجب ہے، گویا نقدستانی ثقافتی ارکان و اقدار کی بازیابی کی کوشش ہے جو نہاں خانہ تخلیق میں حرف راز بن کر شامل ہوتی ہیں، یہی انتقادی تفکر ہے جو گوناگوں متعلقات کے ساتھ شبلی کی تحریروں میں جابجا نظر آتا ہے۔ انتقاد کے نظری و خبری مستعار مباحث نے اپنے ہی مزعومات میں افراط و تفریط پیدا کی جو متون کی تفہیم میں قاری کی بے اعتنائی کا باعث بنی، تنقید کی افادیت مشکوک ہوتی گئی، نظریات کی نارسائیوں کو محسوس کیا گیا۔ متن سے مراجعت کے لئے ایک پرفریب تصور کو فکر و دانش کا معراج سمجھ کر غوغائی ماحول پیدا کرنے کی کوشش جاری ہے۔ شکر ہے کہ کسی تالیف کو بھی

استناد حاصل نہ ہو سکا، مؤلف اور مقالے دونوں مشتبہ ہو گئے۔ جدلیت، جدیدیت اور ماقبل و مابعد کے مجہول تصورات نے عام گمراہی پھیلائی ہے۔ اس مذموم کوشش کی وجہ سے قاری کم ہوتے گئے۔ تخلیق کے سرچشمے بھی سوکھنے لگے۔ ادب کو بڑا نقصان پہنچایا گیا۔ بہ قول رشید احمد صدیقی نقاد اور رغیتا کی کثرت نے تخلیق اور تہذیب سب کو پامال کیا ہے۔ اچھی تخلیق اور ذی فہم قاری دونوں درماندگی سے دوچار ہیں۔ مغربی تنقید کے آسیب میں نقاد نما اساتذہ سب سے زیادہ خانہ خراب ہوئے۔ ان کے کردار اور کرتب بازیوں میں ادب و دانش کی رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کی تنقید بے توقیر ہو کر رہ گئی ہے۔ تخلیق بے اماں و بے درماں ہے۔

شبلی کی نظر میں تخلیق تمدن کے تابع ہے۔ یہ تمدن پورے ثقافتی سرمایہ کی سیرابی سے نمود حاصل کرتا ہے گویا یہ ثقافتی ذکر و فکر کے اظہار کا وسیلہ ہے، جسے فن پارہ کی تفہیم میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شعرالعجم کا آغاز اسی حقیقت سے ہوتا ہے:

"اسلام ایک ابرِ کرم تھا جو سطح خاک کے ہر ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بہ قدرِ استعداد پہنچا، جس خاک میں زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔" (۱)

فارسی کا معروف شعر ایک کائناتی کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید ودر بوم خار وخس

یعنی بارانِ رحمت باغ و راغ پر یکساں برستا ہے مگر یہ زمین کی نمو اور روئیدگی پر منحصر ہے کہ وہ گل و لالہ کھلائے یا خار و خس پیدا کرے۔

یہ ایک کلیہ تخلیق ہے۔ فن کی نمود اور رونما ہونے والی تبدیلیوں نیز پسند و ناپسند کے اسباب اسی سے متعین ہوتے ہیں۔ عوام و خواص کا شعری مذاق بھی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عہد بہ عہد ادب کے آہنگ و اسالیب میں ثقافت کی کارفرمائی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مقدمات قائم کیے ہیں، سرعنوان یہی موضوع ہے:

"کیا کیا انداز قائم ہوئے۔ ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کیے خود اس نے ملک و قوم پر کیا اثر ڈالا۔" (۲)

شبلی نے تنقیدی مباحث کی تشکیل میں واقعہ نگاری کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ زمان و مکاں کے تناظر میں واقعات سرزد ہوتے ہیں جو تخلیق کے لئے عقبی پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ شعرالعجم میں واقعات کے تفصیلی بیان کا یہی جواز ہے۔ شبلی کو تاریخ پر قدرت حاصل ہے۔ واقعات نگاری اسی میلان سے پیدا ہوا۔ شبلی نے لکھا ہے:

''اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہ نامہ کی مدد سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔''(۳)

ہر تمدن ایک نقطۂ عروج پر پہنچ کر معکوس کروٹ لیتا ہے۔ لفظوں کے نگینے جڑنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فن کی صنعت کاری مقصود بن جاتی ہے۔ فنون کی پرداخت اور پرکھ کے پیمانے بھی بدل جاتے ہیں۔ شبلی کی خیال افروزی ملاحظہ فرمائیں:

''صنائع بدائع شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں۔''(۴)

شبلی قومی حمیت اور حوصلہ مندی کے حامل تھے۔ عزائم کی سربلندی ان کے فکری شعار میں شامل تھی۔ وہ منفی رجحانات یا موضوعات کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں، کیوں کہ یہ غارت گر ثقافت ہے۔ شبلی تمدنی تاریخ اور ثقافتی یافت کی نشاندہی میں فن اور فن کار کے اندرونِ وجود کا بھی تجزیہ کرتے ہیں، جس میں ان کے نظر کی بلوغت اور فکری بصیرت کی بھرپور کارفرمائی نظر آتی ہے۔ فن کار کا شخصی میلان و شعور اس کے عقائد و افکار کی بازآفرینی فن کی ترسیل اور فن کار کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد کرتے ہیں۔ یہ صرف نفسیاتی عمل نہیں ہے، جن سے فن پارہ موثرات حاصل کرتا ہے۔ فردوسی۔ کے مطالعہ میں شبلی نے جس تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، وہ پہلے اور شبلی کے بعد ممکن نہ ہوسکا، فردوسی شبلی کا ایک ممدوح ہے۔ مثنوی کے محاسن پر شبلی نے خاص اہتمام کیا ہے مگر مصنف کی نفسیات کے تجزیہ میں انھوں نے بڑی نکتہ رسی پیدا کی ہے۔ اس کے شعور کی تہ در تہ کیفیات کی بازآفرینی میں علامہ نے نفسیاتی مشاہدہ و ادراک میں اضافہ کیا ہے۔ عرب فاتحین کے ہاتھوں ایرانیوں کی شکست فردوسی جیسے مسلمان رزم نگار کو کیسے گوارا ہوسکتا تھا، اس نے آتش انتقام میں ان فاتحین کی مذمت کے لئے زبان کھولی، کیوں کہ فردوسی کیا پورے ایران کی رگوں میں ابھی مجوسیت کا خون دوڑ رہا تھا۔ ان کی آتش پرستی شعلۂ سوزاں بن کر اعصاب میں سرایت کررہی تھی، وقتی طور پر وہ

مغلوب ضرور ہوئے مگر آبائی عقائد واعمال سے دست برداری میں صدیاں درکار تھیں۔ کئی شعراء کے لاشعور کی ان پراسرار کیفیات کی شبلی نے گرہ کشائی کی ہے:

''عرب کی تحقیر اور طعن کے وقت وہ خود یزدگرد بن جاتا ہے۔''(۵)

فردوسی کی نفسیات کی ایسی تعبیر پہلے نہیں سنی گئی، گویا شبلی نفسیاتی تنقید کے بھی امام ہیں اور جگہ جگہ شعراء کے باطن کو سمجھنے میں شبلی نے ان کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ زوال پذیری سے دوچار معاشرہ فن کی حرمت پر کتنے مضر اثرات مرتب کرتا ہے، شبلی کی وضاحت غور طلب ہے۔

یہ وہ مباحث ہیں جنھیں مغربی تنقیدی تصورات سے وابستہ کیا گیا اور تنقیدی تفکیر کا قصر تعمیر کیا گیا۔ اسے ادب کی پرکھ کا آفاقی معیار سمجھا گیا۔ اردو میں بھی ان سے استفادہ کیا گیا۔ نقد کے بیش از بیش ضابطے متعین کیے گئے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ شبلی کے زمانے میں یہ معائر متعارف بھی نہ تھے۔ شبلی نے چند مغربی ناقدین کے نام لئے ہیں مگر ان سے نظریاتی نوعیت کی فیض رسانی کا امکان معدوم نظر آتا ہے۔ شبلی کی نظر میں یہ مشرقی اصول نقد کے جملہ مباحث اساسی اہمیت کے حامل ہیں، ساتھ ہی وہ تخلیق کے پراسرار رمز سے بھی بہ خوبی واقف ہیں کیوں کہ وہ بلند پایہ تخلیق کار ہیں، ان کی تخلیقی فعالیت انتقادی مباحث کی موشگافیوں سے خوب واقف ہے اور فن کی پر پیچ راہوں سے گزرنے کا ہنر بھی جانتی ہے۔ صدق وصواب کی بات یہ ہے کہ تخلیق کار فن کی تعبیر وتشریح میں زیادہ کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ شبلی کی نظر میں فن کے وجود ونمود کے فکری عواقب ہوتے ہیں، جن کی تلاش وتحقیق کے بغیر تنقیدی افادیت مشتبہ رہتی ہے۔ انھوں نے یوروپی ادبی اقدار کا اعتراف بھی کیا ہے، یہ ہماری تنگ دامانی تھی کہ شبلی کو ہم نے مغرب بیزار سمجھ لیا اور اس بدگمانی کی وجہ سے شبلی کو ہدف بھی بنایا گیا، حالانکہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ عہد شبلی پر نظر ڈالیں تو ''پیروئ مغربی'' کو وقت کا اہم ترین فکری میلان کہا جاسکتا ہے، شبلی کی وسعتِ نظری اور روشن خیالی اس کی کیسے منحرف ہوسکتی تھی؟ تنقید کے تعلق سے شبلی نے جو آفاقی اعلانیہ پیش کیا ہے اور مغربی ادبی اقدار کو جو خراج پیش کیا ہے، وہ اب بھی عدیم المثال اور توجہ طلب ہے۔

شعر اگر دامنِ دل می نکشد بانگِ خراست
نغمہ گر نیست دل آشوب بہ غوغا ماند

پائے ازیں دائرۂ تنگ بروں نہ کہ سخن
خود محیطیست کہ ہر قطرہ بدریا ماند
جادۂ مغربیاں گیر کہ ایں طرز نوی
دل پذیر ست ودلآویز ودل آراماند

شعر وادب کا اتنا واضح اور آفاقی نقطۂ نگاہ شبلی کی تخلیقی بصیرتوں اور انتقادی اصولوں سے ہم آمیز ہے۔ ان کے اصولوں میں اعتدال وتوازن کی بڑی کارفرمائی ہے۔ وہ زود حس اور جذباتی ضرور ہیں مگر منطقی اور کلامی بھی ہیں، جن کے لئے عدل وانصاف تلازمہ تنقید ہیں۔ شعر العجم کی پہلی جلد کے ابتدائی صفحات میں شبلی کا دوسرا اعتراف ملاحظہ ہو:

"عجیب بات یہ ہے کہ یورپ نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ التفات کیا، مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا لیکن یورپ نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کرلیا کہ زرتشت سے لے کر نوشیرواں کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہوگئی۔" (۶)

یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدی فکر میں مشرق ومغرب کے اہم میلانات کا کسی حد تک ارتباط ملتا ہے جو اسی دور کی پہچان ہے۔ شعر العجم جلد دوم میں ایک جگہ انھوں نے ایسی بات قلم بند کی ہے جو بڑے بڑے حامیان مغرب کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے:

"مذہبی غلو میں حقیقت شناسی بہت کم قائم رہتی ہے..... فرض کرو ایک شہر میں بہت سی مسجدیں موجود ہیں لیکن انگریزی تعلیم (جو تحصیل معاش کا ذریعہ ہے) اس کا سامان بالکل نہ ہو۔ اب ایک شخص ایک مسجد اور دوسرا شخص انگریزی مدرسہ بنائے تو تم کس کام کو ترجیح دوگے۔" (۷)

محولہ بالا اشعار میں تخلیقی معنویت کے ساتھ فن کے مقاصد جلیل پر شبلی نے جو نکتہ آفرینی کی ہے وہ فن کے ابدی اقدار کی حامل ہے۔ فن اگر دامنِ احساس کو متلاطم نہ کرسکے تو گدھے کی آواز ہے، جسے صحف سماوی میں بدترین آواز کہا گیا ہے۔ اقبال کے تخلیقی یا ادبی تصورات سے اس خیال کی ارتفاعیت کی تائید یا توثیق ہے۔

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

ان کی انتقادی فکر کی ایک اور جہت یعنی ان کا ایک طریق تقابل ہے۔ اکثر و بیشتر مختلف تخلیقات اور ان کے عوامل کو متوازی میزان پر پرکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ منہاج شبلی کا وضع کردہ ہے جن میں ان کی اپنی پسند وناپسند کو بھی دخل ہے اور کچھ شعریات کے ضابطوں سے بھی مستعار ہیں جو اسلاف کے قائم کردہ ہیں، ہر فن اور فن کار کے اپنے مطالبات جداگانہ ہوتے ہیں اور عہد وعصر کے حقائق بھی یکساں نہیں ہوتے، کہیں کہیں یہ تقابل افادیت سے سروکار نہیں رکھتا، مگر انتقادی سرمایہ میں اس کی اہمیت ناگزیر ہے۔ خود موازنہ بھی اس تقابلی تجزیہ کی ایک اچھی مثال ہے۔ دوسرے لفظوں میں اردو تنقید کی مہتم بالشان بنیاد شبلی نے تقابلی تنقید پر رکھی، مختلف شعرا کے مطالعہ کا رجحان عام ہوا، خواہ وہ میر و مرزا ہوں یا غالب و مومن، یا امیر و داغ، مغربی ادبیات سے بھی تقابل شروع ہوا، جس کی ابتدا اقبال نے کی۔ غالب پر ۱۹۰۴ء میں کہی جانے والی نظم نے غالب کو گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا۔ اردو کے کسی شاعر کا مغربی فن کار کے تقابل کا تعارف اقبال سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ڈاکٹر بجنوری نے مغرب سے موازنے کی عمارت تعمیر کی۔ محاسن کلام غالب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ شبلی نے مشرق اور معاصر ادب میں موازنے کی ابتدا کی۔ اقبال مغرب شناس تھے، انھوں نے اردو کے بڑے شاعر کا مقابلہ مغرب کے عظیم تخلیق کار سے کیا۔

گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اس بیان نے بجنوری کو تحریک دلائی، غالب تخلیق و تفکر میں ہندی الہام کے محافظ قرار دیئے گئے۔ موازنہ سے صرف نظر کیجئے، شعرالعجم میں اکثر اس طریقۂ کار سے سابقہ پڑتا ہے۔ فردوسی کا تقابل نظامی سے، خسرو کا ایران سے حافظ و سعدی کے ضمن میں بھی یہ صورت نظر آتی ہے۔

ان کے تصورات تنقید میں دوسرے مباحث کو ذیلی اور ضمنی عنوانات کے تحت بھی پیش کیا گیا ہے، جس پر بہت کم توجہ دی گئی اور غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کیا گیا۔ انھوں نے جغرافیائی حالات سے مرتب ہونے والے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ادبی تخلیقات میں ان محرکات کے اسباب بھی بیان کئے ہیں، تشبیہ و استعارات کے ساتھ الفاظ و معانی کے رشتے اور رابطے بھی کس طرح متاثر

ہوتے ہیں۔ ان کا تجزیہ شبلی کے طرزِ تنقید کی خصوصیت ہے۔ آب وہوا اور مناظرِ قدرت کا اثر شعرالعجم میں ایک ذیریں عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ تمدنی زندگی میں فوجی زندگی کا اثر بھی ایک عنوان ہے جس کے تحت ادبی تخلیقات کی بدلتی ہوئی قدروں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ علامہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے محبوب کے ناز و نیاز کی تمام رعنائیوں میں امرد پرستی کے اسباب اور سرچشموں کی حقیقت بیان کی ہے، نوخیز فوجی جوانوں کی تمام ادائیں محبوب کے پیکر میں کس طرح حلول کرتی ہیں، فارسی غزل کی یہ روایت اردو میں دست بدست آتی ہے۔

ان کے بقول بگڑے ہوئے معاشرے کی نارسائیاں اخلاق و اقدار کو مذموم بنانے میں معاون ہوتی ہیں، جس کے نتیجے میں فحش الفاظ تخلیق میں درآتے ہیں جو ہجو و ملامت کو فروغ دیتے ہیں اور بڑے ثقہ شاعر بھی اس کثافت سے نہیں بچ پاتے، خواہ وہ سعدی ہوں یا رومی:

> ''پانچویں اور چھٹی صدی میں چوں کہ ملکی تمدن خراب ہوگیا تھا اس لئے زبان میں فحش الفاظ آچکے تھے، ہجو نے اس کو اور ترقی دی، یہاں تک کہ ملک کی عام زبان خراب ہوگئی، اب مہذب سے مہذب حضرات بھی شاعری کو فحش سے نہیں بچا سکے۔ گلستاں کا باب پنجم اور مثنوی مولانا روم کی بعض بعض حکایتیں اسی حالت کے نتائج ہیں۔'' (۸)

یہ معاشرتی یا تمدنی انحطاط کے نتائج ہیں، اس میں فرد کی طبعی ناہمواری یا ذہنی درماندگی بھی اس کے خبث کو پروان چڑھاتی ہے۔ رشک و حسد، رقابت و چشمک سے معرکہ آرائیاں جنم لیتی ہیں۔ کثف و کراہت سے تخلیق محفوظ نہیں رہ پاتی، پھر نام و نسب کی برگزیدگی سے محروم فن کاروں کی جماعت تخریب کاری کے ہنر پیدا کرتی ہے، شبلی نے بہت سی مثالیں پیش کر کے استصواب کیا ہے۔ پست گھرانوں میں پیدا شدہ فن کاروں کے اکتسابات پر بحث کی گئی ہے۔

رشک و حسد ایک عام وبا ہے۔ شعرا بھی اس سے بری نہیں ہو سکتے تھے، جب کوئی شاعر کسی دربار میں زیادہ کامیاب ہوجاتا ہے تو اور شعرا کو رشک ہوتا تھا، اس طرح شاعرانہ معرکہ آرائیاں شروع ہوجاتی تھیں، سلاطین کی غیر معتدل اور ناہموار طرزِ حکومت نے اخلاقی شاعری پر نہایت خراب اثر ڈالا، انھوں نے ایک اور فکر انگیز بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب علمی انحطاط غالب ہوتا ہے تو قصے کہانیوں کا عروج ہوتا ہے، معاصر ادبی تاریخ کی شہادت سامنے ہے۔

شبلی کے انداز نظر پر گفتگو میں اس امر کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ وہ فن کے وجدانی اور الہامی مقام و منزلت پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اس کی تقدیس و تحریم کے قائل ہیں، انھوں نے تخیل کی بیکراں کیفیات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کی ارتفاعیت سے فن کی ابدی شہرت کا رشتہ و پیوند قائم کیا ہے۔ ان سب کے برعکس ان کی تنقیدی بالیدہ نگاہی دیکھئے کہ وہ مادے کے وجود سے منکر نہیں ہیں بلکہ تخلیق کے لئے اسے ملزوم و معاون تسلیم کرتے ہیں، مادے کے بغیر تخیل کی آفرینش ممکن نہیں ہو سکتی۔ ان کے مباحث میں یہ ایک منطقی ارتکاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''شعر اگرچہ غیر مادی چیز ہے لیکن وہ مادیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔'' (۹)

ان کی انتقادی فکر میں اسے ایک خاص معنوی حاصل ہے، جس کے تجزیہ میں ان کی انتقادی بصیرت کارفرما ہے، اس مسلمہ کلیہ کا اعتراف شبلی کی دانشوری کی حیرت خیز مثال ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مارکسی طرزِ تنقید سے مشرق متعارف بھی تھا اور نہ ہی انقلابِ روس کی پیشین گوئی سامنے تھی، مادیت کی بنیاد پر تخلیق کا متاثر ہونا تنقید کی دنیا میں پیغمبرانہ بشارت تھی جو شبلی جیسے عبقری کی تحریر یا صریر خامہ سے سنی گئی۔

شبلی کے بعد خیال اور مادے کے مباحث شروع ہوتے ہیں اور ایک مکتبِ فکر کی حیثیت سے ادب و انتقاد میں متعارف ہوتے ہیں اور اس کی اساس پر تنقیدی دبستان کی پر شکوہ عمارت تیار کی جاتی ہے۔ شبلی عالم دین تھے اور روحانیت کے قائل مگر مادے کے بھی حامل تھے۔ مادے سے خیال کا پیدا ہونا قانونِ فطرت ہے۔ مرئی اشیا ہی تخیلات کی بے کرانی کے اسباب فراہم کرتی ہیں۔ شبلی نے جگہ جگہ فن کے مادی متعلقات پر بحث کی ہے۔ فن کی اس تخلیقی دروں بینی میں شبلی کو دیدہ وری حاصل ہے۔ یہی ژرف نگاہی ان کے انتقادی افکار و آرا کو دوش و امروز سے الگ فردائے فن کی نقد ستانی کے لئے ہمہ گیر اصول فراہم کرتی ہے۔ اس موہوب شرف پر خود شبلی کو حیرت ہے۔

در حیرتم کہ پاکیٔ گفتارش از کجاست؟

☆☆☆

حواشی:

(۱) شعرالعجم، جلد اول، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۵

(۲) شعرالعجم، جلد اول دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء،

(۳) شعرالعجم، جلد اول، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۶

(۴) شعرالعجم، جلد اول، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۷

(۵) شعرالعجم، جلد دوم، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۴

(۶) شعرالعجم، جلد دوم، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۷۳

(۷) شعرالعجم، جلد دوم، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۶۱

(۸) شعرالعجم، جلد اول، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۷

(۹) شعرالعجم، جلد دوم، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۷۹

☆☆☆

شبلی کی تنقید نگاری

پروفیسر صابر کلوروی ☆

علامہ شبلی کی علمی فتوحات پر پوری ایک صدی گذر گئی اور حقیقت تو یہ ہے کہ گذشتہ صدی اقبال، ابوالکلام آزاد اور شبلی کی صدی تھی، ان نابغۂ روزگار ہستیوں نے علم وادب کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ جب تک اردو قائم ہے ہماری آئندہ آنے والی نسلیں ان کے احسانات سے سبک دوش نہیں ہو سکتیں۔

علامہ شبلی کی علمی فتوحات ادب کے کسی ایک میدان تک محدود نہ تھیں، انھوں نے بیک وقت سوانح نگاری، علم الکلام، تاریخ، تنقید اور شاعری مین اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا، ان کی عبقریت کسی ایک میدان میں آسودہ نہ رہ سکی، اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری میں بھی انھوں نے اپنی تخلیقی توانائیوں کو یوں صرف کیا کہ حافظ کی یاد تازہ ہونے لگی۔

بہت عرصہ ہوا، پروفیسر خورشید الاسلام نے شبلی کے بارے مین ایک ایسا جملہ لکھ دیا جس کی بازگشت آج بھی تنقید کے ایوانوں میں سنائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ ''شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے'' کلیم الدین احمد کے اختیار میں ہوتا تو وہ انھیں کم از کم یونانیوں میں پیدا ہونے کی اجازت نہ دیتے بلکہ انھیں کیمبرج یا ہارورڈ کی دانش گاہوں سے برتھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا مشورہ دیتے، ہماری خوش قسمتی ہے کہ اردو تنقید کو ابتدا ہی میں دو ایسے بزرگوں کی سرپرستی حاصل رہی جن میں سے ایک نے اردو تنقید کو عربی اور فارسی اسالیب نقد سے روشناس کرایا تو دوسرے نے مغربی علوم سے استفادے کی راہ ہموار کی، ہماری مراد حالی سے ہے جن کی کتاب ''مقدمۂ شعروشاعری'' بلاشبہ اردو تنقید کی بوطیقا ہے۔

☆ شعبۂ اردو، پشاور یونیورسٹی پشاور، پاکستان۔

شبلی نے ارسطو کو پڑھا لیکن ابن رُشد کے ترجمے کی مدد سے ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ اقبال کی طرح مغرب سے مرعوب نہ ہوئے۔

علی گڑھ میں شبلی کا طویل قیام بھی ان پر وہ رنگ نہ چڑھا سکا جو سر سید احمد خان کا خاصہ رہا ہے، اُن کے ہیرو اسلام کے ہیرو تھے ان کی نگاہیں ہندوستانی سرحدوں کو عبور کر کے ایران اورعرب کے ریگزاروں میں اپنا ہدف تلاش کرتی رہیں، ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر اور مرزا انیس ہی ان کی ادبی جولان گاہ بن سکے۔

انیس کی عظمت کے اعتراف میں انھوں نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھی، اور پھر شعر العجم لکھ کر آب حیات کی یاد تازہ کر دی، ان کتابوں میں جگہ جگہ ان کے تنقیدی نظریات ملتے ہیں، شعر العجم جلد چہارم میں تو مقدمہ شعر و شاعری کی طرح باقاعدہ عنوانات قائم کر کے انھوں نے تنقیدی اصولوں سے بحث کی ہے یہ تمام تر تنقیدی مواد آب حیات اور مقدمہ شعر و شاعری کا ضمیمہ معلوم ہوتا ہے۔

اکیسویں صدی میں علامہ شبلی کی تنقید کی معنویت کیا ہے؟ یہ سوال اکثر انگریزی پڑھے لکھے ناقدین اٹھاتے رہتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید علمی ترقیوں کی بدولت آج کی اردو تنقید پہلے سے کہیں آگے ہے لیکن اس امر کو ماننے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہئے کہ یہ شبلی اور حالی کے پاؤں پر کھڑی ہے۔

تنقید کے میدان میں شبلی کی بعض اولیات کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا شبلی کی بدولت اردو پہلی بار تقابلی تنقید سے روشناس ہوئی، اس میں جمالیاتی عناصر کا اضافہ ہوا، تنقید میں رومانویت بھی شبلی کے راستے سے داخل ہوئی، ادب پاروں کی تفہیم میں نفسیات سے بھی پہلی بار مدد لی گئی، شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی صورت میں پہلی بار عملی تنقید کے کامل نمونے ہمارے سامنے آئے۔

شعر کی تعریف اور شاعری کے بنیادی عناصر پر شبلی نے بہت پر مغز گفتگو کی ہے، ارسطو کی طرح وہ بھی شاعری کو نقالی یا مصوری سمجھتے ہیں بلکہ ایک لحاظ سے اسے مصوری پر فوقیت حاصل ہے اس لیے کہ مصور تو مادی اشیا کی تصویر کشی کرتا ہے جب کہ شاعر غیر مادی اشیا، مثلاً احساسات اور جذبات تک کی کامیاب تصویر بھی کھینچ سکتا ہے، ان کے نزدیک جو شخص واقعات اور مظاہر فطرت

سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہ اُس اثر کو الفاظ میں ادا بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے، شاعری کی بنیاد وہ تین چیزوں پر رکھتے ہیں، محاکات، تخیل اور حسنِ الفاظ، محاکات کے معنی کسی چیز یا حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اُس چیز کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے محاکات کی یہ اصطلاح اردو میں پہلی بار شبلی کے ذریعے روشناس ہوئی لیکن چل نہ سکی اور اب پیکر تراشی یا امیجری کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ محاکات کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود وہ تخیل کو شاعری کی اصل بنیاد سمجھتے ہیں ان کا یہ نکتہ قابل غور ہے کہ محاکات میں جان تخیل کی بدولت ہی آتی ہے، ان کے خیال میں انشاپردازی کا کمال اور جمال تشبیہ واستعارے کی بدولت ہے اور مبالغے کا حسن تخیل کی بدولت ہے نہ کہ جھوٹ کی وجہ سے ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں کہ شاعری کی نظر تاثر کی سچائی پر رہے تو ساری دقت رفع ہو جاتی ہے اور شاعری میں مبالغہ بھی سچائی کا خادم نظر آنے لگتا ہے۔

علامہ شبلی کے ہاں لفظ اور معنی کی بحث بھی خاصی دل چسپ ہے اور اس پر ہمارے نقادوں نے خاصی خامہ فرسائی کی ہے، شبلی اس ضمن میں ابن رشیق کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ لفظ جسم ہے اور مضمون روح، دونوں کا ارتباط ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کمزور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی ان کے نزدیک شاعری یا انشاپردازی کا دارومدار الفاظ پر ہے اس ضمن میں وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ گلستاں سعدی میں مضامین کی تاثیر دراصل الفاظ کے تناسب اور حسن ترتیب کی بدولت پیدا ہوئی ہے، لفظ کو معنی پر ترجیح دینے کے خیال کی بازگشت ہمیں شعرالعجم میں بھی سنائی دیتی ہے، جہاں وہ کہتے ہیں:

> ''مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر پیدا نہ ہو سکے گی۔'' (شعرالعجم، جلد چہارم ص ۷۱)

غالباً یہی وجہ ہے کہ حالی کے برعکس شبلی مرثیے کے اخلاقی مضامین کو اعلیٰ درجہ کی شاعری نہیں قرار دیتے، اسی سے حالی اور شبلی کے تنقیدی مزاج کا فرق بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

لفظ اور معنی کی بحث میں شبلی جہاں لفظوں کے مناسب استعمال کا ذکر کرتے ہیں، وہاں وہ موضوع کی تمام وسعتوں کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں سبک، شیریں، ثقیل اور بھدے الفاظ کے علاوہ ان کی مختلف لہروں اور صوتی اثرات کی واقفیت بھی بہم پہنچاتے ہیں، بلند اور پر شوکت الفاظ

کو وہ قصیدے کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔

علامہ شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں فصاحت اور بلاغت پر بھی بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، بلاغت ان کے نزدیک کلام کا اقتضائے حال کے موافق اور فصیح ہونا ہے وہ انیس کی شاعری کو بلاغت کا کمال قرار دیتے ہیں کلام کی بلاغت کی یہی شرط ہے تو انیس کے مرثیوں کو اس سے خالی ہونا چاہئے کہ ان مرثیوں میں کردار عربی ہیں مقام ہندوستان سے کوسوں دور کربلا ہے شادی اور غم کی ساری رسمیں عرب کی ہیں، واقعہ کربلا کی تمام تر جزئیات اقتضائے حال کے مطابق نہیں ہیں، پھر بھی اگر ان مرثیوں میں کوئی تاثیر ہے تو اس کی وجہ کچھ اور ہی ہونی چاہیے، اور اسے مرثیے کے سامعین اور ان کی نفسیات میں ڈھونڈنا چاہیے۔

علامہ شبلی کا مزاج، علم، عقل اور جذبے کا مرکب ہے، اس لیے ان کی تنقید میں رومانویت بھی دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے، وہ شعر کے جمالیاتی پہلوؤں پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اخلاقی پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قومی اور ملی احساس شبلی کی نظریاتی تنقید میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکا۔

شبلی کے تاریخی ذوق کی جھلکیاں کہیں کہیں ان کی تنقید میں بھی نظر آ جاتی ہیں مثلاً شعر العجم کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''...........خیالات پر اس کا اثر یہ ہوا کہ عشقیہ شاعری پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا، معشوق کے اوصاف اور سراپا کی تشبیہات اور استعارات میں تمام تر فوجی سامان ہے، یہاں تک کہ حسن کا مرقع میدان جنگ نظر آتا ہے، زلفیں کمند ہیں، ابرو خنجر، پلکیں تیر، آنکھیں قاتل وغیرہ وغیرہ۔''

تاہم شعر العجم میں تاریخی شعور اُس سطح کا بہر حال نہیں ہے جو الفاروق اور المامون میں پایا جاتا ہے، مثلاً ایران کے شعراء کے حوالے سے انھوں نے کچھ ایسے واقعات بھی بیان کر دیے ہیں جن کی حیثیت محض افسانے کی ہے، مثلاً رودکی کے بارے میں یہ کہنا کہ اُن کا اسباب چار سو اونٹوں پر لدا ہوتا تھا، حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

علامہ شبلی کی تنقید عالمانہ ہے اور اس میں ایک طرح کا تخلیقی حسن بھی پایا جاتا ہے، وہ تنقید

کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر یکساں توجہ دیتے ہیں اُن کے محاکمے کے اصول خاصے سائنٹفک ہوتے ہیں، کہیں کہیں وہ شعر کا تجزیہ اتنے عمدہ طریقے سے کرتے ہیں کہ تنقید تخلیق کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔

شبلی کے نقادوں میں بیشتر وہ لوگ ہیں جن کے دماغ انگریزی لالٹینوں کی بدولت روشن ہیں، گذشتہ سو برسوں میں علوم وفنون میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی بدولت تنقید میں بھی مغربی تصورات داخل ہو گئے ہیں ایسے میں یہ توقع رکھنا کہ شبلی کی تنقید جدید مغربی تصورات سے بھی معمور ہونی چاہیے تھی، درست مطالبہ نہیں ہے، ان نقادوں میں احسن فاروقی اور کلیم الدین احمد بھی شامل ہیں، وہی کلیم الدین احمد جو اپنے باپ عظیم الدین احمد کو اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں، ایسے نقادوں کی رائے اور بصیرت پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

شبلی کا اگر کسی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف حالی ہیں، اردو تنقید کی بنیادوں میں انہی بزرگوں کا خونِ جگر شامل ہے، آج ہماری تنقید جس مقام پر کھڑی ہے اس میں ان دونوں بزرگوں کا فیضان نظر شامل ہے۔ مضمون کی ابتدا بھی خورشید الاسلام کے ایک کوٹیشن سے ہوئی تھی اس کا اختتام بھی ان ہی کے ایک اقتباس سے کیا جاتا ہے:

> ''شبلی کو اپنی بڑائی کا احساس بھی اتنا ہی تھا جتنا غالب کو، شبلی میں وہ گداز نہیں جو حالی میں ہے مگر اس کے باوجود شبلی کی زندگی حالی سے زیادہ بیدار، بھرپور اور رنگا رنگ تھی، خالص روحانی اعتبار سے حالی پہلے گوتم بدھ ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے، اور شبلی اول اور آخر یونانی تھے، ہمارے خون میں شبلی اور حالی دونوں کا خون موجود ہے۔''

مجھے اس اقتباس پر صرف ایک جملے کا اضافہ کرنے دیجئے اور وہ یہ کہ ہمارے خون میں ہی نہیں ہماری تنقید میں بھی شبلی اور حالی کا خون دوڑ رہا ہے اور عصر حاضر میں ان کی تنقید کی معنویت اور مقبولیت میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی اور آج بھی ہم ان کی تنقید سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

علامہ شبلی

خلیق انجم☆

ایک زمانے میں لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے مدرسے بھیجتے تھے، اس مقصد کے لیے سب سے بڑے لڑکے کو منتخب کیا جاتا تھا، چنانچہ شبلی کے والد نے شبلی کو دینی مدرسہ بھیجا، جہاں اُنھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور زمانے کے مروّجہ علوم پر قدرت حاصل کی۔ شبلی کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر غیر معمولی قدرت حاصل ہوگئی تھی۔ اُن کے چھوٹے بھائیوں کو والد نے انگریزی کے اسکول میں داخل کیا تھا اور جب وہ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو اُنھیں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔

مہدی حسن علی گڑھ میں تعلیم پا رہے تھے، اُن کے والد جب مہدی حسن سے ملنے کے لیے علی گڑھ گئے تو شبلی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ شبلی کی عمر لگ بھگ پچیس سال تھی اور اس وقت تک سرسید تحریک سے وہ متاثر ہو چکے تھے، اُنھوں نے سرسید کی مدح میں عربی میں ایک قصیدہ کہا تھا جو وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ سرسید یہ قصیدہ پڑھ کر نہ صرف خوش ہوئے بلکہ شبلی کی عربی دانی کے دل سے قائل ہوگئے، یہ قصیدہ بعد میں علی گڑھ گزٹ میں چھپ گیا، اگلے سال علی گڑھ میں عربی اور فارسی کے استاد کی اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی، شبلی نے اس جگہ کے لیے درخواست دی اور چوں کہ سرسید کے لیے شبلی کا نام نیا نہیں تھا، وہ عربی قصیدے کی وجہ سے شبلی کی ادبی اور علمی صلاحیتوں سے خاصے واقف تھے، اس لیے انھوں نے شبلی کا تقرر کر دیا، اس طرح شبلی علی گڑھ پہنچ گئے۔

سرسید، علامہ شبلی کی علمیت اور اہلیت کے دل سے قائل تھے، جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ

☆ جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

انھوں نے اپنی نادر اور بیش بہا کتابوں کی الماریوں کی چابیاں اُن کے حوالے کر دی تھیں، شبلی نے ان کتابوں سے بہت استفادہ کیا، لکھتے ہیں: علی گڑھ کالج میں مولانا شبلی کی صحیح پوزیشن پر شاید سب سے واضح اور تفصیلی تبصرہ طفیل احمد صاحب منگلوری کا ہے، وہ ادبی دنیا کے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے ''مولانا شبلی ایک علیگ شاگرد کی نظر سے'' لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ مولانا شبلی علی گڑھ پہنچ کر ابتدا ہی سے اس مرتبہ پر پہنچ گئے تھے جو تمام کالج میں کسی ملازم کو حاصل نہ تھا، سرسید کے قریب رہنے اور روزمرہ ملاقات ہونے سے انھیں نہ صرف علی گڑھ کے بلکہ قوم کے سب سے معزز شخص سے تقرب حاصل تھا، اس پر مولانا کی ذہانت خداداد قابلیت اور علمی انہماک سے ان کے اعزاز میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا، وہ علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک کے جملہ کاموں میں سرسید کے قومی جلسوں میں اپنی خوش بیانی اور ذاتی خوبیوں کی وجہ سے نمایاں رہتے۔''

طفیل احمد صاحب نے سرسید اور شبلی کے تعلقات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''مولانا کی علی گڑھ کالج کی پروفیسری اگر بادشاہت نہ تھی، تو وزارت ضرور تھی، اگر علی گڑھ کے بادشاہ سرسید تھے تو ان کے ہر وقت کے ہم نشین اور ہمدم مولانا کا ایک وزیر ہونے میں کیا کلام ہے۔''

علامہ شبلی نے اپنی ایک تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ:

''حضرت یہ سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے، اس کا آغاز اس کی نشوونما، اس کی ترقی، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے، اسی کالج سے ہوا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرے میں قدم نہیں رکھا تھا، یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کا مقصد کیا تھا، آپس کے مذہبی جھگڑے (بڑھانا) مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا، اس کو قوت اور استحکام دینا، میں آج سے بہت پہلے فارسی شعر بھی کہتا تھا، لیکن وہ کس قسم کے کس درجے کے تھے؟ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو اعلا رتبے کی خیال کرتا ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج کی میری

شاعری اگر پست ہے تو اس وقت کی پست تر تھی۔ غرض میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے، وہ اسی کالج کی بدولت ہے، اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں، اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔"

ایک دفعہ سرسید، شبلی، حالی، ذکاء اللہ وغیرہ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے حیدرآباد گئے، وہاں اُن کے اعزاز میں ایک عوامی جلسہ منعقد ہوا، جس میں شبلی نے ایک طویل ترکیب بند پڑھا، اس ترکیب بند میں شبلی نے مسلمانوں کی اقتصادی، اخلاقی اور تہذیبی زوال کا بڑے دردناک انداز میں ذکر کر کے علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔

اس نظم میں سرسید کے بارے میں لکھا ہے:

می نہ بیند کہ سرسیدِ ما آں کہ بہ فضل ☆ رہبرِ قافلۂ ماست بہ ہر راہ گزار
چیست آخر کہ بایں پیری وایں ضعفِ بدن ☆ از علی گڑھ بہ دکن آید وجوید تیمار
تاچہ خواہد کہ بدریوزہ گری خاستہ است ☆ تاچہ دارد کہ ازیں ننگ ندارد انکار
تاچہ حال است کہ آتش زنفس می بار ☆ تاچہ حال است کہ خوں میچکدش از گفتار

چندہ جمع کرنے کی مہم میں سرسید نے ایک ڈرامہ کیا، جب تماشا دیکھنے کے لیے لوگ جمع ہوئے اور اسٹیج کا پردہ اٹھایا گیا تو سرسید برآمد ہوئے، سرسید نے ہال کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"تم اپنی دولت اور حشمت پر مغرور ہو کر یہ نہ سمجھو کہ قوم کی حالت بری ہے مگر ہمارے بچوں کے لیے تو سب کچھ ہے، یہی اُن لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب اُن ہی کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اس اسٹیج پر کھڑے ہیں، سرسید کو اس حیثیت سے اسٹیج پر کھڑا دیکھ کر اور اُن کی تقریر سن کر شبلی کا دل ہل گیا۔"

اس واقعے پر شبلی نے ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا:

"دوستو! کیا تمھیں سچ مچ تھا تھیٹر کا یقیں؟ ☆ کیا یہ سمجھے تھے کہ پردہ کوئی ہوگا رنگیں؟
نظر آئے گی جو سوئی ہوئی اک زہرہ جبیں؟ ☆ آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں؟

"مثنوی صبح امید" کے چند شعر ملاحظہ ہوں، جس میں شبلی نے ان الفاظ میں سرسید کی قومی

خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے:

باتوں میں اثر تھا کس بلا کا ☆ اک بار جو رُخ پھرا ہوا کا
اُمید کی تڑپ گئی تگ وتاز ☆ اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے ☆ ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پا بہ گل تھے ☆ آندھی ہوئے جو فسردہ دِل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا ☆ مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے ☆ اخبار کہیں کہیں رسالے
تعلیم کے جا بہ جا وہ جلسے ☆ گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
کیا کیا نہ مصیبتیں اُٹھائیں ☆ ہر طرح کی ذلتیں اُٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر! ☆ دُشنام سُنی دعائیں دے کر!
حنظل پائے شکر کے بدلے ☆ سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے!
لعل اس نے دیئے شرار پائے ☆ گُل نذر کیے تو خار پائے
کیا تلخ ملے جواب اس کو ☆ کیا کیا نہ دیئے خطاب اس کو

علامہ شبلی نے علی گڑھ میں اکابر کی آمد یا کسی اور تقریب میں جو کالج کے جلسوں میں اردو اور فارسی میں نظمیں پڑھیں اور جن میں معزز مہمانوں کی تعریف اور وقتی تقریب کے متعلق مناسب جذبات کے اظہار کے ساتھ قوم کی حالت کا بیان اور علی گڑھ تحریک کا پیغام بڑے موثر طریقے سے پیش کیا ہے، شبلی بڑے حساس اور خوددار انسان تھے، دوسروں کی مدح سرائی انھیں طبعاً ناپسند تھی، اس لیے انھوں نے ان مدحیہ نظموں اور قصیدوں کو بالعموم اپنے فارسی دیوان میں جگہ نہ دی، لیکن 'حیات شبلی' میں (غالباً علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پرانے فائلوں سے نقل ہو کر) بعض قصائد آگئے ہیں، ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں کالج پر شبلی کو کس قدر ناز تھا اور ان کا جوش وولولہ کس طرح اُن کے اشعار میں اُبلا پڑتا تھا۔

۱۸۹۴ء تک مولانا شبلی کی ایک بڑے عالم کی حیثیت سے پورے ہندوستان بلکہ بعض دوسرے ممالک میں شہرت پہنچ چکی تھی، کہا جاتا ہے کہ سرسید نے علی گڑھ کے ایک طالب علم سید زین الدین کو

ہدایت دی کہ وہ انگریزی میں خط لکھ کر گورنمنٹ کو بھیجیں کہ شبلی کی علمی فضیلت کی قدردانی ہندوستان
اور ہندوستان سے باہر ممالک میں ہو رہی ہے، خاص طور سے ترکی نے انھیں اپنے ملک کا بہت بڑا
انعام 'تمغۂ مجیدیہ' سے نوازا ہے لیکن ہندوستانی حکومت نے ابھی تک اُن کی طرف توجہ نہیں کی۔

اس خط کا حکومت پر اچھا اثر پڑا اور جنوری ۱۸۹۴ء کو مولانا کو حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دینے کا اعلان کر دیا، اس خطاب کے ملنے پر شبلی کے دوستوں اور علی گڑھ کے شاگردوں نے اُن کو دل سے مبارک باد دی۔ ۱۹ر جنوری ۱۸۹۴ء کو شبلی کو مبارک باد دینے کے لیے کالج میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا، اس جلسے میں سرسید، اُن کے صاحب زادے سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خاں، کالج کے پرنسپل مسٹر بک اور پروفیسر آرنلڈ وغیرہ شریک تھے، محسن الملک نے جلسہ کی صدارت کی، اس موقع پر شبلی نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کا شکریہ ادا کیا۔

یہاں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرسید، شبلی کی علمیت کے بہت زیادہ قائل ہو گئے تھے، اس لیے اُنھوں نے کوشش کر کے اُنھیں حکومت سے شمس العلماء کا خطاب دلوایا۔

سرسید نے شبلی سے درخواست کی کہ وہ 'سیرۃ النبی' پر ایک کتاب لکھیں، انھوں نے ایک مختصر سی کتاب لکھی لیکن سرسید کی کتاب 'خطباتِ احمدیہ' جو ولیم میور کی کتاب Life of Mohammad کے جواب میں لکھی گئی تھی، بڑی ضخیم اور مدلل کتاب تھی، شبلی کو بھی اس کتاب کو پڑھ کر یہ خیال آیا کہ انھیں بھی ایسا کام کرنا چاہیے، سیرت النبی کے لیے مواد جمع کرنے کے مقصد سے شبلی قسطنطنیہ کے سفر پر روانہ ہو گئے، وہ تین مہینے تک قسطنطنیہ میں رہے اور اس دوران اُنھوں نے اپنے ذوق کی بے شمار کتابوں سے استفادہ کیا، یہ کتابیں وہ تھیں جن کا ہندوستان میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جب ۱۸۹۷ء میں شبلی بیروت، بیت المقدس اور قاہرہ ہوتے ہوئے علی گڑھ پہنچے تو علی گڑھ میں اُن کا زبردست خیر مقدم ہوا، علی گڑھ کالج میں اُن کے دوستوں اور شاگردوں نے سفر سے واپسی پر دلی مبارک باد پیش کی۔

خلیق احمد نظامی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"شبلی نے اردو اور فارسی میں قومی شاعری کی ہے، اس میدان میں اُن کی بہت سی

نظمیں اور غزلیں ادبی لحاظ سے بھی بہت ممتاز ہیں، شاعری کو قومی تحریک کے لیے استعمال کرنے کا سبق بھی بقول خلیق احمد نظامی انھیں سرسید ہی نے دیا تھا۔''

عبدالحلیم شررؔ نے سرسید اور علامہ شبلی کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شبلی کا شمار اپنے عہد کے ممتاز ترین دانشوروں میں ہوتا تھا، وہ سرسید کی غیر معمولی اہلیت وقابلیت کے دل سے معترف تھے۔''

اس سلسلے میں عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ:

''مولانا (شبلی) سے مجھے حد درجے کی بے تکلفی تھی اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے تھے، سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر اُن کے مشورے کے نہ کرتے۔''

یہ حقیقت ہے کہ سرسید اور علی گڑھ نے شبلی کی شخصیت بالکل بدل دی تھی لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی نے بھی سرسید کے ذہن وقلب کو متاثر کیا تھا، سرسید پر مغربی تعلیم کا جادو ایسا چلا ہوا تھا کہ وہ اپنے مذہب کے دل سے قائل تو تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ طلبا دینی تعلیم پر اپنا زیادہ وقت خرچ کریں لیکن شبلی نے مذہب کے معاملہ میں اُن کے نظریات کو بالکل بدل دیا۔

اگر سرسید نے اپنی فکر اور نظریات سے شبلی کو متاثر کیا تو شبلی نے بھی سرسید کو متاثر کیا، یہ شبلی ہی کا اثر تھا کہ آخری عمر میں سید صاحب کے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ زمانہ کا ایسا رنگ ہے کہ اگر مذہبی اصلاح نہ کی گئی تو یہ انگریزی اسکولوں کے تعلیم پائے ہوئے بچے سب عیسائی یا لامذہب اور ملحد ہو جائیں گے اور یقیناً ہو جاتے کیوں کہ سید صاحب کے پاس بعد کے زمانہ میں متعدد انگریزی طلباء کے ایسے خطوط آئے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ نے ہماری رہبری نہ کی ہوتی تو ہم مذہب اسلام کے چھوڑنے کو تیار تھے، یہ خطوط سید صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ ان کو احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا، ان کو اپنی ہمدردی اسلام اور اپنی کوشش خیر کی سند اور انھیں کو اپنی نجات کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

علامہ شبلی جدید تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ مغربی تعلیم کے اس حد تک قائل نہیں تھے جیسے سرسید تھے، وہ سوچتے تھے کہ اگر ہماری نئی نسل مشرقی تعلیم سے بالکل بے بہرہ رہی تو ان کا ناقابلِ تلافی

نقصان ہوگا، شبلی مشرقی اور مغربی تعلیم میں ایک توازن قائم کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے ندوۃ العلماء کے نصاب میں انگریزی بحیثیت مضمون شامل کی اور پندرہ روپے ماہوار پر دارالعلوم میں ایک استاد مقرر کیا مغربی اور مشرقی تعلیم کی طرف علامہ شبلی، مولانا حالی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، سید سلیمان ندوی اور مولانا ظفر علی خاں کا بھی یہی رویہ تھا۔

علامہ شبلی کو اگرچہ بعد میں سرسید کی تحریک سے خاصا اختلاف ہوگیا تھا لیکن وہ سرسید کی شخصیت اور سیرت کے ہمیشہ معترف رہے، ایک جگہ اُنھوں نے اعتراف کیا ہے:

''وہ پرزور دست وقلم، جس نے 'اسباب بغاوت ہند' لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے اس کتاب میں لکھا، وہ کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پُرزور لٹریچر نہیں پیدا کرسکتا۔ وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لیے برہم ہوکر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔''

اب یہاں یہ بتانا ضروری ہوگیا ہے کہ مشرقی اور مغربی تعلیم، تہذیب اور تمدن کے بارے میں علامہ شبلی کو سرسید سے اختلاف تو بہت پہلے سے تھا لیکن اب اُس کا وہ برملا اظہار بھی کرنے لگے تھے، ایک دفعہ علی گڑھ طلباء کی یونین میں بحث تھی کہ جمہوری طرزِ حکومت بہتر ہے یا شخصی، اس جلسہ میں سرسید بھی موجود تھے اور سب جانتے ہیں کہ سرسید جمہوری حکومت کے خلاف تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایشیائی طرزِ حکومت کے لیے شخصی حکومت مناسب ہوتی ہے، شبلی نے جمہوری طرزِ حکومت کی خوبیوں پر ایسی مدلل تقریر کی کہ تمام طالب علم اُن کی حمایت کرنے لگے۔

سرسید چوں کہ شخصی حکومت کے حق میں تھے، اس لیے اُنھوں نے تقریر کی اور اس میں اپنا نقطہ نظر بیان کیا، یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے 'ایشیائی اسلامی طرزِ حکومت' کے نام سے ایک مقالہ لکھا جو ۲۸رجون ۱۸۹۲ء کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارے میں شائع ہوا، اس طرح طلباء کی یونین کے جلسے میں ایک ایسے موضوع پر مباحثہ تھا کہ ہماری قدیم طرزِ تعلیم آج کل کی جدید طرزِ تعلیم سے یقیناً بہتر تھی شبلی نے قدیم طرزِ تعلیم کی موافقت میں تقریر کی، ظاہر ہے کہ یہ سرسید کے موقف کے خلاف تھا،

مگر شبلی کی تقریر ایسی مدلل اور ایسی موثر تھی کہ سرسید کے صاحب زادے سید محمود کو بھی شبلی کے خیالات سے اتفاق کرنا پڑا، چوں کہ علامہ شبلی کی شخصیت اور عزائم آہنی تھے اور وہ اپنے معمولی سے ذاتی مفاد یا معمولی سی تنخواہ کے لیے اپنے فکروفن سے دستبردار نہیں ہوسکتے تھے، علی گڑھ کے ماحول پر انگریزی اور انگریز پروفیسر چھائے ہوئے تھے جب کہ شبلی انگریزی سے بہت زیادہ واقف نہیں تھے مگر پھر بھی اُنھوں نے اپنے مشرقی علوم اور اپنے خیالات سے علی گڑھ کو اچھا خاصا متاثر کیا، وہ جس محفل میں ہوتے وہاں جس موضوع پر گفتگو ہوتی، شبلی اس پر بات کرتے اور ایسے دلائل کے ساتھ کرتے کہ اُن کے قول ''قول فیصل'' کی حیثیت رکھتے، وہ مغربی علوم سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے بلکہ یہ اُن کی عظمت تھی کہ انھوں نے اپنے لوگوں کے دلوں میں مشرقی علوم کی دھاک بٹھا دی تھی۔

شبلی کا المیہ یہ تھا کہ وہ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے دینی اور مشرقی علوم کے دل سے قائل تھے لیکن ایک دانشور کی حیثیت سے اُن کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ وہ مغربی تعلیم کی حمایت کریں، اسی لیے اُن کی تقریروں اور تحریروں میں اکثر ایسے بیانات ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تضاد کا شکار تھے، وہ مغربی علوم کی تعریف بھی کرتے ہیں اور برائی بھی، لیکن چاہتے تھے کہ مسلمان مشرقی تعلیم بھی حاصل کریں وہ ایسے طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جو مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھنا چاہتے تھے، جن دنوں شبلی ندوہ میں تھے ایک طالب علم ضیاءالحسن ندوی نے ندوے سے فراغت پائی، ضیاءالحسن تحصیل انگریزی کے لیے علی گڑھ میں داخلہ لینا چاہتے تھے اس وقت شبلی ندوہ میں تھے، انھوں نے ۱۴رنومبر ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں اپنے شاگرد مولانا حمید الدین کو لکھا:

> ''میاں ضیاءالحسن علی گڑھ کالج میں تعلیم کے لیے جاتے ہیں، تم ایک خط ان کی مُعرفی کا ڈاکٹر ہارویز کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دو میں ان کو بھیج دوں گا۔''
>
> (مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۳۰۔ اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۹۲۷ء)

شبلی چاہتے تھے کہ طلبہ سادہ لباس پہنیں اور سادگی سے زندگی گزاریں انھیں جو اعتراض علی گڑھ پر تھا، وہی اعتراض ندوہ کے طلبہ پر بھی تھا، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ طلبہ میں تقدس کا اثر نہیں ہے، آپ نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک دفعہ ندوہ کے لڑکے ڈیپوٹیشن کے طور پر بھیکن پور بھی گئے تھے، ان کی وضع سے آپ نے سمجھا کہ علی گڑھ کے لڑکے ہیں، یہ میری موجودگی سے قبل کا زمانہ ہے اس کی وجہ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتدا سے آج تک کوئی پرنسپل با اثر نہیں ملا۔''

(مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۸۵۔ ۲۹ ر ستمبر ۱۹۰۱ء)

سرسید اور علی گڑھ نے جس طرح شبلی کی علمی شخصیت کو نکھارا تھا، اس کا اعتراف شبلی نے علی گڑھ پہنچنے کے بارہ سال بعد یعنی ۱۸۹۴ کی ایک تقریر میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''قدیم تعلیمی نظام شکست کھا چکا تھا اور جدید تعلیم کے نتائج بھی کچھ حوصلہ افزا نہیں تھے، جدید تعلیم کی وجہ سے مذہبی اقدار کا ہمارے معاشرے میں پہلے جیسا مقام نہیں رہا اور مذہبی معاملات میں آزادی نے ہماری اخلاقی اور روحانی زندگی میں زبردست بحران پیدا کر دیا تھا، ایک ایسا بحران کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اخلاقی اقدار، ذہنی سکون وطمانیت سے محروم ہو گیا۔'' (شبلی: عربی اور سفرنامہ مصر وروم شام)

اودھ پنچ کے مضامین اور اکبر کی نظموں نے شبلی کے خیالات کو اور مضبوط کر دیا، چنانچہ جب وہ علی گڑھ کالج میں آئے تو اگر چہ وہ سرسید کے مدح خواں اور ان کی قومی بہی خواہی کے قدرداں تھے، لیکن وہ مغربی تعلیم کے اثرات کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، جس سال وہ علی گڑھ آئے ہیں، اسی سال کا ایک خط ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے:

''یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے، لاحول ولا........... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔

سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ''ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ

مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کی نظریں بار بار شبلی پر پڑتی تھیں، مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا، مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی جو اسی زمانے میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنھوں نے سرسید کے حکم سے 'طبقات ابن سعد' کے ایک حصے کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے بھی انکار کیا، جب سرسید نے بااصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ "وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔" مولانا حمید الدین کی صاف گوئی سے مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اس سے سرسید کو شبلی کی طرف سے بدگمانی ہوئی۔

سرسید اور شبلی میں اکثر مذہبی امور پر اختلاف رہتا تھا، بعض اہل علم کا اس بات پر اتفاق تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر نبوت کا خاتمہ نہ ہو گیا ہوتا تو الغزالی نبی ہوتے، علم کلام کے باب میں شبلی لکھتے ہیں:

"شہرت عام کے لحاظ سے علم کلام کو امام غزالی کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ارسطو کو منطق کے ساتھ، ابن خلدون نے اعلانیہ دعویٰ کیا ہے کہ امام غزالی سے پہلے علم کلام میں فلسفے کی آمیزش نہ تھی، فلسفیانہ طور پر سب سے پہلے امام صاحب ہی نے اس فن کو مرتب کیا لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے...... علم کلام میں ابتدا ہی سے دو طریقے قائم ہو گئے تھے، عقلی یا نقلی، علم کلام خود اسلامی فرقوں، یعنی معتزلہ، قدریہ، جبریہ کے مقابلے میں ایجاد ہوا تھا، ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں جس کلام کا ذکر کیا ہے، وہ یہی علم کلام ہے، عقلی علم کلام کا فلسفہ اور دوسرے مذاہب کے مقابلے کے لیے ایجاد ہوا تھا،...... نقلی علم کلام کی بھی متعدد شاخیں تھیں، ظاہریہ، ماتریدیہ، اشعریہ، امام غزالی اشعریہ طریقہ کے پیرو تھے، جس کے بانی اول امام ابوالحسن اشعری تھے۔ یہ سب طریقے اول اول فلسفہ اور عقلیات سے تعلق نہیں رکھتے تھے، اشعریہ میں سب سے پہلے باقلانی نے بعض بعض فلسفیانہ اصطلاحیں داخل کیں، امام الحرمین نے اس پر اضافہ

کیا، امام غزالی نے اس قدر ترقی دی کہ نقلی ہونے کے بجائے عقلی بن گیا۔''
غزالی معقولات اور استدلال کے جن تصورات کے قائل تھے، انیسویں صدی کے ہندوستان میں ان کی حیثیت منقولات کی ہوگئی تھی، کیوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ علم و آگہی میں اضافہ ہوتا ہے، غزالی کی تصنیف "التفرقة بين الاسلام والزندقة" پر سرسید نے تفصیلی تبصرہ کیا تھا، غزالی نے جنت کے دروازے جن پر کھولے اور جن کو دوزخ کا کندہ بنایا، اُس کے بارے میں سرسید نے لکھا:

''امام صاحب نے نہایت ملاپن برتا...... جن کو دوزخی بنایا ہے اُن میں بھی غلطی کی ہے اور جن کو بہشتی قرار دیا ہے اُن میں بھی غلطی کی ہے، جن معجزات کا انھوں نے ذکر کیا ہے، اول تو ان کا خود اہلِ اسلام میں متواتر ہونا ثابت کیا ہوتا پھر دوسرے مذہب والوں کے نزدیک ان کے متواتر ثابت ہونے کے طریقے کو بتایا...... ہم ان کی اس تمام تقریر کو بودا، اور محض نکما سمجھتے ہیں۔''

'تہذیب الاخلاق' میں سرسید کا یہ تبصرہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا، بارہ برس بعد شبلی کا الغزالی پر رسالہ لکھنا، سرسید کو جواب دینا سمجھا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا، ہاں سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا اور شبلی نے جواب دیا، ۱۹۰۱ء میں قلبِ ماہیت سے پہلے شبلی ایک عرصے تک سرسید کے ہمدم اور ہم راز بھی رہے۔

شبلی علی گڑھ کالج کے بہت مداح تھے لیکن دینی معاملات میں انھیں اس کالج سے خاصا اختلاف تھا، ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''لیکن اگر اس فقرہ کا یہ مطلب ہے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ عربی اور مذہبی تعلیم میں کامل ہونا، تمام دنیوی اور دینی ترقی کا وسیلہ ہے تو بالکل اور سرتاپا سچ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کالج کا یہ دعویٰ ہے اس نے مذہبی علوم کی تکمیل کا سامان مہیا کیا ہے، کالج تقریباً چھتیس برس سے قائم ہے، اس کا مذہبی نصاب چھپا ہوا موجود ہے، آگے چل کر جو کچھ ہوگا اس سے بحث نہیں لیکن اس وقت تک تو جو کچھ اس میں مذہبی تعلیم ہے اسی شدبد کے برابر ہے جس قدر ندوہ میں انگریزی تعلیم ہے۔

سرسید مرحوم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کالج میں فقہ، حدیث، تفسیر اصول کی کامل تعلیم دیتے ہیں، ۳۶ برس کی وسیع مدت میں کالج نے کوئی مذہبی عالم نہیں پیدا کیا اور یہ کالج کی کوئی تحقیر نہیں، کالج تقسیم عمل کے اصول پر کام کر رہا ہے، جیسا کہ سید محمود مرحوم نے اپنی تقریر میں کہا تھا اور یہ کام کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔''

(مقالات شبلی، جلد ہشتم، اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء ص ۱۱۴-۱۱۶)

جب شبلی علی گڑھ کے طلبا کو نماز پڑھتے دیکھتے تھے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے نہ کوئی اور واقعہ، آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں مگر ان دنوں ہوا کا رُخ ہی بدل گیا ہے، لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے، ایک بی، اے سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے: الصلوۃ خیر من النوم پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔

مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان وشوکت ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریکِ نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں، ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے، میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں، مسجد بننے کی تیاری ہے، سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانہ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے، وہ مہتمم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ خود دیں گے، میں نے بھی پچاس روپے دیئے ہیں، سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے، لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ ہے۔

مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا، میں اس جوشِ مسرت میں اور بھی

لکھتا، مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحاق و عثمان یاد آ گئے اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔"

سرسید کا انتقال ہو چکا ہے، شبلی علی گڑھ اور ندوہ دونوں چھوڑ چکے ہیں، علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ ہے، اگر شبلی چاہتے تو کالج کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کرتے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا، سب سے بڑے مسئلے یہ تھے کہ یونیورسٹی قائم کی جائے اس کا نام مسلم یونیورسٹی رکھا جائے، یونیورسٹی کو یہ حق دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے کسی بھی کالج کو ملحق کر لے، یونیورسٹی کے معاملات میں وائسرائے کے حقوق کم کیے جائیں، یونیورسٹی کا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ان تمام مسائل پر شبلی نے مثبت نظر سے نظمیں کہی ہیں۔

میری ان تمام گذارشات کا مقصد یہ ہے کہ شبلی کو سرسید سے اختلاف تھا، وہ سرسید کے مخالف نہیں تھے۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو جب سرسید کا انتقال ہوا تو شبلی کو بہت صدمہ ہوا، انھوں نے نواب علی حسن خاں کو ایک عربی خط میں لکھا:

"قومی عمارت کے ستون ہل گئے، یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں پہنچ گئے اور یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا، میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

یہ فقرے وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے دل اور دماغ کو واقعی صدمہ پہنچا ہو، شبلی اپنی جگہ سے اُٹھے اور آہستہ آہستہ ڈائس کی طرف بڑھے، مجمع پر ایک نظر ڈالی اور بولے:

"سید احمد خاں اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں چلے گئے، دیکھو ہماری قومی عمارت کے ستون ہل رہے ہیں، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت طاقتِ گویائی کہاں سے لاؤں۔

حضرات! اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشو و نما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا جو کچھ ہوا اس کالج سے ہوا اور یہ کالج جلوہ ہے اسی بڑے شخص کا۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

اس کی شخصیت میں کیا جادو تھا، اس کی نظر میں کیا تاثیر تھی، اس کی آواز میں کیا کشش تھی۔علامہ شبلی فرطِ غم سے کچھ ایسے مغلوب ہوئے کہ آگے کچھ نہ کہہ سکے اور بیٹھ گئے:

دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی | جادو تھی، فسوں تھی، جانے کیا تھی

ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں | نشتر سی اتر گئی جگر میں

صورت سے عیاں جلال شاہی | چہرے پہ فروغِ صبح گاہی

لب پر ہے فغاں کہ اب بھی جاگو | اے خواب گراں کے سونے والو

تاچند رہوگے مست و سرشار

اٹھو کہ سحر ہوئی نمودار

☆☆☆

عہد جدید میں شبلی نعمانی کی معنویت

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر☆

ادب: حال کے منظر نامے میں ماضی اور مستقبل کے ساتھ فکری مکالمے کا نام ہے، یعنی اس کی معنویت گرفت زمانوں کی اسیر نہیں ہوتی، یہ ماورائے زمانہ اپنے نقش ونگار کی تخلیق کرتا ہے۔ اگر وقت کا طلسماتی ہاتھ ادب کی تخلیقات کو اپنی گرفت میں لے کر، اس کی تمام تر فکری اور جمالیاتی جہتوں کی تفہیم اور تعبیر کو منکشف کر دے، تو پھر ادب کا رابطہ مستقبل کے سویروں سے ممکن نہیں ہوتا، کہنے کا مقصد یہ کہ اگر کوئی بھی ادیب اپنے عہد کی فکری گرفت سے باہر نہ نکل سکے، تو اس کا ادب اپنے عہد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر ادیب کی معنوی جہتیں ہر زمانے کے نئے ذہن کی تخلیقی کروٹوں کا ساتھ دیں اور ہر زمانہ اس کے فکر و فرہنگ سے روشنی کشید کرے تو پھر وہ ادیب زمانے کے آہنگ سے ماورا ہو کر مختلف زمانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس طرح اس کا تخلیقی شعور ذہن تازہ کی فکری الجھنوں کا مداوا بھی کرتا ہے اور رہنمائی بھی، اور اس کی تخلیقی اپج ایک ایسی جہت کو نمایاں کرتی ہے، جو عہد جدید کی معنویت سے ہم رنگ بھی ہوتی ہے اور ہم آہنگ بھی۔

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

میر ہوں کہ غالب ...... میر امن ہوں کہ شبلی نعمانی یہ وہ لوگ ہیں، جن کا نصابِ فکر اپنے اپنے زمانوں کے اسالیب حیات اور روحِ عصر کی توانائی سے پھوٹا اور آنے والے ادوار کے لیے مشعلِ راہ بھی ہوا اور مینارۂ نور بھی، ان کے بعد، ہر عہد کا جدید ذہن ان کے فکری طرزِ احساس اور معنوی رعنائی کا اسیر رہا، اور ان کی معنویت ہر زمانے کا ساتھ دیتی رہی ...... اور تازہ بھی رہی

☆ پروفیسر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان۔

اور تازہ کار بھی، کیوں کہ تازگی اور تازہ کاری کے سوتے اس تخلیقی جمالیات سے پھوٹتے ہیں، جو روح عصر کی تابانی سے مملو بھی ہوتی ہے اور مستقبل کی قدروں کی داعی بھی...... اور یہ رویہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب لکھنے والا اپنے عہد کے آئینے میں فردا کی تعبیر اور ترجمانی کے سارے رنگ اور رس متشکل کر سکے، دشتِ امکاں کی چشم خواب رنگ کے سارے منظر، اگر اس کے آئینۂ ادراک میں عکس انداز ہو سکیں تو پھر کسی بھی ادیب کا فکری منظر نامہ زمانے کے طلسماتی آہنگ کا پابند نہیں رہتا۔

شبلی نعمانی اپنے فکری آثار اور فنی اسلوب کی ترجمانی میں ایسے خوش آہنگ ہیں کہ ان کے علمی اور ادبی آثار کا جمالیاتی اور فکری وفور آج تازہ بھی ہے اور نیا بھی۔ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانے نہیں ہوئے، بلکہ ان کے فکر کی تابانی اور جگمگا اٹھی، ان کا فکری نظام، رنگا رنگی کا اشاریہ رہا اور فنی آہنگ، خوشبو کی کوملتا کا اظہاریہ بنا، رنگ و بو کی یہ معنوی اپیل زمانے کی گرفت سے ماوراہی رہی، یوں وہ زندہ بھی رہے اور ان کا نظام فکر و فن بھی نکھرتا رہا اور آج ان کی معنویت پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

وہ مؤرخ بھی ہیں اور ادیب بھی، سوانح نگار بھی ہیں اور سیرت نگار بھی، شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی، عالم بھی اور متکلم بھی۔ ان کی ہر حیثیت دوسری سے بڑھ کر تازہ اور توانا ہے، وہ ماضی کے ترجمان بھی ہیں اور مستقبل کے علمبردار بھی، انھوں نے فکر و فرہنگ کی، جن جہتوں میں اپنے تخلیقی شعور کی عکس اندازی کا فریضہ انجام دیا، ان میں امکانات کے در وا کر دیے، ان کا تخلیقی وجدان اور مکاشفاتی اسلوب زمانے کے معنوی اور جمالیاتی نظام سے خراج لیتا رہا اور آج بھی اس میں کمی نہیں آئی، سوال یہ ہے کہ ان کے فکری اسلوب کا وہ کون سا زاویہ ہے کہ جس کی بدولت ان کی معنویت جدید عہد میں بھی موجود ہے؟ اس سوال کی تلاش میں میں نے شبلی نعمانی کی تمام تر تصنیفات و تالیفات کو اس زاویے سے دیکھا اور اس روح کو تلاشنے اور اُجالنے کی کاوش کی، جو ان کے تمام تر علمی اور فکری سرمائے میں جاری و ساری ہے اور جس کی بدولت آج کا تازہ اور جدید ذہن ان کی معنویت اور جمالیات کا اسیر ہے۔

شبلی نعمانی کی فکری روح ان کے تہذیبی تصورِ حقیقت اور تصورِ روایت سے مستعار ہے، ان کا تصورِ حقیقت فکر و فرہنگ کے میدان میں جس طرح اپنی جولانی دکھاتا ہے وہ ان کے معنوی

طرزِ احساس کو آفاقی اور ہمہ گیر قدروں کا اشاریہ بنا دیتا ہے، فکر کی تابانی فن کے اظہار سے تخلیق کی راہ پاتی ہے تو فکری معنویت کی جمالیات اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ منظر نامے کی تعبیر مرتب کرتی ہے اور تصورِ روایت اسلوب کو دلکشی اور رعنائی کا جو قرینہ عطا کرتا ہے، وہ انھیں زندہ رہنے اور ان کے اسلوب کو زندہ رکھنے کا جتن کرتا ہے۔

شبلی نعمانی کی فکری معنویت آفاقیت اور ہمہ گیریت کے اسلوب میں عکس انداز ہوتی ہے تو اس میں طرزِ احساس کی رعنائی اپنی جمالیات کے رنگ اور رس سمیٹ لیتی ہے، ان کا فکری نظام دائمی اور جاودانی قدروں کے ساتھ مل کر ایک ایسی روشنی کا نقیب بن جاتا ہے جو معاشرے کی معنوی اور فکری دھڑکنوں کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور عکاس بھی۔

شبلی نعمانی کی معنویت بصیرت: آئینۂ ادراک کے بطون میں اتر کر رنگ ونور کا ایک ایسا ہالہ بناتی ہے جو علم اور آگہی کے موسموں کی نوید بن جاتا ہے اور ان کی فکری جمالیات فکر وخیال کے آنگن میں چراغ کی لو کو بڑھاوا دیتی ہے اور تہذیب کا مطالعہ اس کے تصورِ حقیقت کی روشنی میں منعکس ہو کر اس کے داخلی اور روحانی نظام کی تعبیر بن جاتا ہے، شبلی نعمانی کے ہاں ...... جو بھی دائمی رویے متشکل ہوئے ہیں وہ ان کے تہذیبی مطالعات کی دین ہیں، کیوں کہ ان کی بصیرت افروز ترجمانی ہر کسی کا مقسوم نہیں ہوتی۔

شبلی نعمانی کے فکری آثار اپنے خیال کی رعنائی اور اس کے اظہار کی کوملتا کی بنا پر ہمہ جہت معنویت کے حامل ہیں، وہ تاریخ نگاری کے فن میں جلوہ گر ہوں یا ادب وشعر کے میدان میں جلوہ آرا ...... ان کا حسنِ خیال، خیالِ حسن کی تعبیر کو اتنے رنگوں میں منعکس کرتا ہے کہ جہانِ معنی کا منظر نامہ آئینہ خانے کی صورت میں متشکل ہو جاتا ہے اور اس سے شعور اور خیال میں معنوی آہنگ کے دریچے وا ہو جاتے ہیں، معنوی آہنگ کی کشید رنگینیٔ اظہار اور لطافتِ احساس کے اس جمالیاتی رنگ سے ہمکنار ہوتی ہے، جو وجدان کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے۔

تاریخ کی وادی میں اتر کر کوئی بھی مؤرخ حالات وواقعات کی تعبیر کا تانا بانا بناتے ہوئے آرائشِ خیال میں گم ہو جائے تو تاریخ تو رہی ایک طرف ...... وہ اپنا آپ گم کر دیتا ہے، نہ زمانے کے چاک پر تاریخ صورت پذیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی مؤرخ اپنی پہچان اور شناخت کے تمام

ترنگوں سمیت جلوہ گر ہو سکتا ہے لیکن علامہ شبلی ہیں کہ تاریخ نگاری کرتے ہوئے آرائشِ خیال کی جمالیات کو بھی گم نہیں کرتے اور اپنے فن کو شناخت عطا کرتے ہیں، ...... اور جو ادیب اس رنگ و آہنگ کو اپنے فن کا آئینہ بنا لے، وہ خود کیسے گم ہو سکتا ہے، یقیناً نہیں ...... علامہ شبلی تاریخ کے آنگن میں ادب اور تہذیب کی رعنائی سے ایک ایسا منظر نامہ مرتب کرتے ہیں جو اپنے پس منظر میں تاریخ کے آثار میں سانس لیتا ہے اور اپنے پیش نامے پر ادب کی جمالیات سے خوشبو کا جہانِ معنی تخلیق کرتا ہے، ...... یہ مقام ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا کیوں کہ یہ منظر خواب دیکھنے اور خیال اُگانے سے تو ہاتھ آنے سے رہا ...... ان ہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد ......

ان تازہ کار حوصلہ مندوں میں علامہ شبلی سرفہرست ہیں، وہ تاریخ نگاری میں ادب کا دریچہ وا رکھتے ہیں اور ادب کی تخلیق میں تاریخی مناظر سے غافل نہیں رہتے ...... یہ اسلوب اور آہنگ ادب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کرنے سے عبارت ہے، جب ہی اس کا آہنگ خارج زیادہ باطن سے جڑا ہوتا ہے، کسی بھی تخلیق کار کے ہاں اسلوب کی باطن کے ساتھ جڑت اس کے داخلی تجربے کی رعنائی سے بھی متعلق رہتی ہے اور خارج کا پرتو بھی اس سے علاحدہ نہیں ہوتا۔

علامہ شبلی کا تصور روایت اور تصورِ تہذیب اسی اسلوب کی بدولت تاریخ اور ادب و شعر کو معنوی جمالیات کا وہ شعور عطا کرتا ہے جو باطن اور خارج کے مابین ایک نقطۂ اتصال کی تلاش سے عبارت ہے ...... اور یہی شعور زمانے کے معنوی اور عصری آہنگ سے مل کر اور زمان و مکان کی حدود اور قیود سے بالا ہو کر، ایک ایسے گنجینۂ معنی کی نوید دیتا ہے کہ جس میں دشت امکاں کے سارے منظر حسنِ خیال کی جاذبیت سے کھل اٹھتے ہیں ...... یہ منظر نامہ کم از کم کسی بھی ادیب کی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے ...... کیوں کہ اسی طرزِ احساس کے باعث معنویت کے متنوع Shades اُبھرتے اور نئے نئے رنگوں میں ڈھلتے ہیں۔

علامہ شبلی کا اسلوب اختصار اور اعجاز کے حسن سے استعارے کو اس طرح اپنے حصار میں لیتا ہے کہ اس کا معنوی پھیلاؤ استعاراتی آہنگ کے پس منظر سے عکس انداز ہو کر معانی کی ایک نئی دنیا دریافت کرتا ہے، وہ تخیل کی جلوہ پاشیوں کو استعارے کے شہر میں منعکس کرتے ہیں تو منظر نامہ استعارہ در استعارہ کا پھیلتا ہوا طرزِ احساس کی کومل اور بجل فضا کو مسخر کر لیتا تھا، اور یوں استعارے

کے چار شہروں کی کہانی تخیل کی دنیا کو جمالیاتی پیکروں میں ڈھال دیتی ہے، وقت کے چاک پر استعارہ کہانی کو تخلیق کرتا ہے اور کہانی تاریخ کے موسموں سے رنگ اور نور کے منظر اُجال لیتی ہے اور یوں ہر کردار اپنے خال وخد کی رعنائی کا سراپا اوڑھ لیتا ہے، استعارے کا اس طرح پھیلاؤ تاریخ اور ادب کے منظرنامے کو وسعت آشنا تو کرتا ہی ہے..... اسے امر کرنے اور جاوداں بنانے میں بھی تغافل نہیں برتتا..... بس لکھنے والے کا کمال یہ ہونا چاہیے کہ وہ ادب کے چاک پر اپنے تجربے اور مشاہدے کی رنگارنگی سے منکشف ہوتے ہوئے موسموں کو تخلیق کرنے اور انھیں جاوداں رنگوں میں Paint کرنے کے فن سے آگاہ ہو، کیوں کہ غم کے چرنے پر دکھ کاتنا ادب کو زندہ بھی رکھتا ہے اور جاوداں بھی لیکن اس مقام تک رسائی میں کتنے ہی مقامات آہ وفغاں بھی آتے ہیں..... ان سے کامگار ہو کر گزرنا اور اپنے ادب میں زندگی کے استعاراتی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا کمالِ فن ہے اور یہ کمال ہر ذہن پر نزول نہیں کرتا، جب تک کہ خیال کی اڑان میں زمان ومکان کی زنجیریں ٹوٹ نہ جائیں، اس تک رسائی ممکن نہیں ہوتی..... یہ منزل ادب کی دنیا میں اتنی ارزاں بھی نہیں کہ ہر کوئی اس مسندِ ادب پر جلوہ گر ہو جائے، بہ قولِ بیدل۔

همه عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمار ما
چه قیامتی که نمی رسی ز کنارِ ما به کنارِ ما

یہ جو 'کنارِ ما' سے 'کنارِ ما' کا سفر ہے، اپنے اندر صدیوں کی مسافت کا زمانہ سمیٹے ہوئے ہے لیکن ذرا ٹھہریے! یہ سفر ایک لمحے میں بھی طے تو ہو سکتا ہے مگر اس سے جو وقت کے منظرنامے پر کہانی کی تخلیق کرنا جانتا ہو..... یہ تجربہ اس تخلیق کار پر منکشف ہو سکتا ہے جو استعارے کے چار شہروں کا مسافر رہا ہو..... اور یہ راز کھل سکتا ہے اس ذات کے آئینۂ دل پر جو عرفانِ ذات کے موسموں میں زندگی کرنے کا ہنر جانتی ہو، تو آیئے، دیکھیں کہ شبلی کے نگارخانے میں معنوی جمالیات کے یہ سارے مناظر عکس گر نہیں ہیں..... ہیں اور اگر ہیں تو پھر اس کی معنویت زمانوں کے مابین گردش کناں ہو سکتی ہے، اس میں سکوت اور سکون پیدا نہیں ہوتا..... کیوں کہ صاحب ساز کے لیے لازم ہے کہ وہ سردش کی غلط آہنگی کا شعور بھی رکھتا ہو اور جسے یہ عرفان نصیب ہو جائے وہ شبلی بن جاتا ہے، کم پر راضی نہیں ہوتا۔

شبلی نعمانی کے فکر وفرہنگ کا ہرزاویہ اپنی خیال افروز صداقتِ احساس سے منعکس ہوتا ہے، وہ شعر کہہ رہے ہوں، یا نثر میں محوِ کلام ہوں ان کے ہاں حقائق کی دنیا...... تخیل کی افسانوی فضا سے متاثر نہیں ہوتی، لیکن حقائق کی ترسیل اور ابلاغ کا جو قرینہ وہ اختیار کرتے ہیں وہ خاص طور پر ان ہی سے مخصوص ہے،...... اگر ان کے تمام فکری اور ادبی آثار سے ایک کا انتخاب کریں جو ان کی معنوی اور فکری رعنائی کا ترجمان بھی ہے اور جس کی بدولت ان کی معنویت ہر دور میں موجود بھی ہے اور توانا بھی، تو وہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے،...... اور سیرت النبی ﷺ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو فکر اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی رعنائی خیال کو خیالِ حسن کی تعبیر کا قرینہ عطا کرتا ہے اور یہی قرینہ ان کی معنویت کی دلیل بھی ہے اور ان کی تازگی اور توانائی پر گواہ بھی۔ ان کی سیرت نگاری کا ایک منظر دیکھیے، صرف ایک:

> ”آج کی صبح، وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ: آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گم رہی سرد ہو کر رہ گیے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گیے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گیے، توحید کا غلغلہ اُٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔“

علامہ شبلی کا یہ تخلیقی منظر نامہ دیکھیے اور بتایئے کہ کیا یہ لکھنے والا ساحر نگار ادیب کبھی مر بھی سکتا ہے؟...... نہیں! بالکل نہیں، کیوں کہ موسموں کے بدلتے رنگ اس کی معنویت میں ڈھل کر اسے جاوداں بھی رکھتے ہیں اور پیہم جواں بھی اور یہ متواتر اور مسلسل پیرایۂ اسلوب حیات بخش رویوں میں ڈھلتا ہے اور نئے سویروں کا منظر نامہ تخلیق کرتا ہے اور ابد آباد تک زندہ رہتا ہے۔

☆☆☆

"علامہ شبلی اور عملی تنقید کے مطالبات"

موازنۂ انیس و دبیر کی روشنی میں

پروفیسر سید فضل امام رضوی ☆

فنونِ لطیفہ (Finearts) اور خاص طور پر ادب کی تفہیم اور پرکھ کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود نقاد کا ذہن عالمانہ اور تربیت یافتہ ہو، شبلی عربی و فارسی کے متبحر عالم تھے، وہ سرسید کے قریب اسی علمی کشش کے باعث آئے اور مغرب کے تنقیدی رویّے سے واقف ہوئے اور تقابلی تنقید کا رجحان مغربی ادب سے ہی اخذ کیا، یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں تنقید باضابطہ اور باقاعدہ طور پر نہیں تھی، تذکراتی تنقید تاثراتی اور جمالیاتی انداز کی حامل تھی، اُردو شاعری کا انتقادی جائزہ سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے لیا تھا، آبِ حیات میں ابواب وادوار اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، ہلکی ہی سہی لیکن تقابلی تنقید کی کہیں کہیں جھلکیاں مل جاتی ہیں، میر و سودا، مصحفی و انشاء، غالب و ذوق کے ذیل میں وہ تقابلی تنقید کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ۱۸۹۳ء میں حالی نے اپنا اردو دیوان شایع کیا، جس کے لیے انھوں نے ایک جامع اور مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا، جو مقدمہ شعر و شاعری کے نام سے مشہور ہو کر اردو تنقید کا سنگِ میل بن گیا، حالی نے ملٹن اور ابن رشیق قیروانی کے بیان میں تفریق کی وضاحت کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تقابلی تنقید کے تصور سے آگہی حاصل کر رہے تھے۔

شبلی نے ۱۹۰۳ء-۱۹۰۴ء میں کتاب موازنۂ انیس و دبیر تصنیف کی اور ۱۹۰۷ء میں مطبع آگرہ سے منظر عام پر آئی، اسے اردو کی تقابلی تنقید کی خشتِ اول کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

☆ سابق صدر شعبۂ اُردو، الٰہ آباد یونی ورسٹی، الٰہ آباد۔

موازنۂ انیس ودبیر کو عملی تنقید کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

''تنقید کا یہ انداز شبلی کی اختراع نہیں، بلکہ ہمارے پُرانے نظام نقد وانتقاد میں ادبی گروہ بندیوں کے ماتحت مختلف شاعروں کی شاعری کی قدر وقیمت کا فیصلہ اور طریق کے علاوہ اس انداز سے بھی کیا جاتا تھا، شبلی نے بھی اسی طریقے پر عمل کیا ہے۔...... اس خاص بات کے علاوہ شبلی کے محاکمے کے اصول بہت حد تک سائنٹفک ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے شاعری کو پرکھنے کے صحیح اصول واضع کیے ہیں، پھر دونوں شاعروں کی تقابلی اہمیت ان اصولوں کی روشنی میں ظاہر کی ہے۔''(۱)

اُردو کے قدیم شعری ادب کے مطالعے نے انھیں اس بات کے لیے متوجہ کیا کہ اپنی بات کی توضیح وتشریح کے لیے انیس ودبیر سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہوسکتا۔ انیس کے یہاں سادگی وپرکاری ہے تو دبیر کے یہاں دقت آفرینی اور طوالت ہے، شبلی نے موازنہ لکھ کر روزمرّہ ومحاورہ، فصاحت اور بلاغت کے معیار ومیزان متعین کیے، شبلی کا انتقادی عمل مشرقی شعریات پر مبنی ہے اور مشرقی شعریات کے مضمرات ومشمولات سے ماخوذ ہے، تمام تر رموز ونکات اور اصطلاحات وہیں کی وضع کردہ ہیں۔ وہ خود رقم طراز ہیں:

''جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتی ہیں، ان کو روزمرّہ کہتے ہیں، روزمرّہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن دراصل وہ فصاحت کا ہی ایک جزوِ خاص ہے، یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے، جو سادہ صاف اور سہل الادا ہوں اور اگر ان میں کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو رات دِن کی بول چال اور کثرتِ استعمال سے وہ منجھ کر صاف ہوجاتے ہیں، روزمرہ کے لیے فصیح ہونا لازمی ہے، میر انیس کے کلام میں روزمرہ اور محاورے کا استعمال پایا جاتا ہے۔''(۲)

یہ حقیقت ہے کہ میر انیس کے کلام میں لسانی ادراک اور شعور گہرا ہے اور ان کے برتنے کا انھیں سلیقہ بھی آتا ہے اور یہ کلاسیکی معیار ادب کی مثال ہے، شبلی نے موازنہ کی بنیاد پوری طرح سے اندازِ بیان پر رکھی ہے اور یہ انداز بیان اور اُسلوب نگارش کلاسیکی اصولوں پر مبنی ہے اس اجمال کی

تفصیل یہ ہے کہ شبلی نے دو اصطلاحیں یعنی فصاحت اور بلاغت کی مدد سے شعراء اور شعر کا معیار متعین کرنے کی کوشش کی ہے ان دونوں اصطلاحوں کا مشرقی ادبیات میں ہمیشہ سے خاص مقام رہا ہے۔

فصاحت اور بلاغت کے ذیل میں شبلی نے جو امتیازات قائم کیے ہیں وہ یہ ہے کہ فصاحت سے مراد سہولت اظہار، اس کے وسائل اور متعلقات ہیں جس میں ایک طرح شفافیت (TRANSPARENCY) یعنی سلاست، روانی اور برجستگی ہو، اس کے علی الرغم بلاغت کا تعلق الفاظ سے کم معانی سے زیادہ ہے، اسے ذو معنویت یا ترسیلی کہا جا سکتا ہے، جدید ادبی تنقید کے تناظر میں یہ اصطلاحات زیادہ موزوں اور مناسب شاید نہ معلوم ہوں لیکن اردو مرثیہ کے باب میں ان کو اہمیت حاصل ہے، یہ صنف سخن واقعہ نگاری سے متعلق ہے اور واقعہ نگاری میں اس صنف کی رسمیات طے شدہ ہیں۔ مرثیہ کے موضوعات تاریخی اور اساطیری ہیں، انیس نے جذبات واحساسات کی ترجمانی، عکاسی اور منظر کشی کو ترجیح دی ہے۔

شبلی نے بلاغت کو فصاحت کا ہی ایک حصہ قرار دیا ہے، ان کے نزدیک فصاحت، روانی اور برجستگی ہے، موازنہ کے آغاز میں انھوں نے تحریر کیا ہے:

> ''ہر لفظ چوں کہ ایک قسم کا سُر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے ان آوازوں سے اس کا خاص تناسب بھی ہو، ورنہ گویا دو مختلف سُروں کو ترتیب دینا ہوگا، نغمہ اور راگ مختلف آوازوں یا سُروں کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود دل کش اور دل آویز ہے لیکن اگر دو مختلف سُروں کو باہم ترکیب دے دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے، راگ کے دل کش اور موثر ہونے کا گر وہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترکیب ہو، ان میں انتہائی توازن اور تناسب ہو۔'' (۳)

شبلی کے یہی خیال اور الفاظ مضمون ''فن بلاغت'' میں درج ہیں۔ (۴) اس بحث میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تنافر لفظی، فصاحت میں حارج ہوتا ہے اور الفاظ کی باہمی عدم آہنگی تنافر کا سبب ہے، موسیقی میں ترنم کا دارومدار تناسب اور توازن پر سُروں کا کامل مطابقت اور ہم آہنگی اور سُروں کے ارتباط باہمی پر ہے۔

شبلی فرماتے ہیں کہ تشبیہ واستعارہ کی بنیادیں مماثلت (ANALOGY) میں ہیں،

دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مماثلت واضح اور خارجی سطح پر ہوتی ہے اور اس کو آسانی کے ساتھ ادراک کے دائرۂ گرفت میں لایا جاسکتا ہے، استعارہ میں مماثلت اندرونی سطح پر پائی جاتی ہے، وہ استعارہ کو فن تدبیر قرار دیتے ہیں، شبلی نے تشبیہ کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

[۱] مفرد............[۲] مرکب

''مفرد''...... یعنی جس طرح چہرے کو پھول سے تشبیہ دی جائے......اور ''مرکب'' یہ کہ جس طرح یہ کہا جائے کہ میدان جنگ میں گرد اُٹھی تو اس میں تلواریں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے شب کو ستارے ٹوٹتے ہیں۔''(۵)

موازنہ میں شبلی نے بیشتر حصہ میں انیس کے شعری کارنامے کی پرکھ کے لیے صرف کیا ہے اور اس محاکے کے دوران مرزا دبیر کے شعری کارناموں پر ذرا کم ہی توجہ مبذول فرماتے ہیں، انیس اپنے کلام میں زیادہ تر تشبیہات سے کام لیتے ہیں، استعاروں کا زیادہ استعمال نہیں کرتے ہیں۔

مراثی انیس میں دونوں طرح کی تشبیہات مستعمل ہیں، مفرد اور مرکب دونوں:

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں
کانٹوں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نور عین پر
پروانے گر رہے تھے چراغ حسینؑ پر

میر انیس پر تفصیلی بحث کے بعد شبلی جب مرزا دبیر کی طرف توجہ کرتے ہیں تو کلام کا آغاز درج ذیل الفاظ سے کرتے ہیں:

''اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دل آویزی اور برجستگی، لطیف و نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے، فصاحت ان کے کلام کو چھو تک نہیں گئی، بندش میں تعقید و اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دوراز کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے بالکل عاجز ہیں، خیال بندی اور مضمون آفرینی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکے۔''(۶)

شبلی نے تعقید اور غرابت کی مثالیں مراثیٔ دبیر سے لکھی ہیں، مگر اُن کا یہ کہنا کہ وہ کسی حالت یا کیفیت کی تصویر بالکل نہیں کھینچ سکتے، انصاف نہیں ہے، شبلی نے بہت ہی جبر و اکراہ سے دبیر کی اس خوبی کا اعتراف بہر حال کیا ہے کہ مضمون بندی اور خیال آفرینی ان کے یہاں پائی جاتی ہے لیکن ساتھ میں یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اس کو سنبھال نہیں پاتے۔ مطلب یہ ہے کہ مرزا دبیر خود ضبطی سے عاری ہیں، یہ بات شبلی کو گراں گزرتی ہے اور اسے بھی قابل تحسین نہیں قرار دیتے۔

میر انیس کے متعلق شبلی فرماتے ہیں:

''ان کا اصلی جوہر بندش کی چستی، ترکیب کی دل آویزی، الفاظ کا تناسب اور برجستگی اور سلاست ہے، یہ چیزیں مرزا صاحب کے یہاں بہت کم ہیں، ایک ہی مصرع میں ایک لفظ نہایت بلند اور شاندار ہے اور دوسرا مبتذل اور پست ہے، بندش کا ایک شعر اس زور و شور کا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرجتا آ رہا ہے اور دوسرا بالکل پھیکا اور کم وزن ہے، دو تین بند صاف اور سلیس نکل جاتے ہیں پھر تعقید اور بے ربطی شروع ہو جاتی ہے، اکثر جگہ اشعار بڑے دھوم دھام کے ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں ہے۔''

اب مرزا دبیر سے متعلق ارشادات ملاحظہ ہوں:

''وہ نہایت دقیق اور بلند مضامین پیدا کرتے ہیں لیکن مناسب الفاظ ہاتھ نہیں آتے اس لیے مضمون ایک گورکھ دھندہ بن کر رہ جاتا ہے۔''(۷)

اور یہ بھی رقم طراز ہیں:

''مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات ہیں، اس میں شبہہ

نہیں کہ وہ اپنی دقت آفرینی سے ایسی عجیب اور نادر تشبیہات اور استعارات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کبھی ذہن منتقل نہیں ہوا ہوگا لیکن اس زور میں وہ اس قدر بلند اُڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔'' (۸)

حالانکہ شبلی یہ بھی رقم طراز ہیں:

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے، وہ اسی قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائرِ وہم پرواز نہیں کر سکتا.............. وہ قوت متخیلہ کے زور سے نئے نئے اور عجب دعوے کرتے ہیں اور خیالی استدلال سے ثابت کرتے ہیں۔'' (۹)

ان دونوں شعراء کے محاکے اور موازنے کے ذیل میں شبلی نے مراثی کے بند تو پیش کیے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ متن کے خاص خاص اجزاء پر انھوں نے ناقدانہ اظہار خیال بھی کیا ہو، اور اس کا تجرباتی عمل اور تجزیہ بھی کیا ہو، ایک ہی صورت حال، واقعہ یا فضا اور ماحول کو دھیان میں رکھ کر، مفرد اشعار سے زیادہ گفتگو کرتے ہیں لیکن، موضوع اور مضامین کی یکسانیت کے اعتبار سے بھی مفرد اشعار کے انتخاب سے مناسب طریقۂ تنقید کا اظہار نہیں ہو پاتا ہے۔

دراصل شبلی کے ذہن پر فصاحت بہ معنی سادگی، روانی اور سلاست کا اتنا گہرا اثر ہے کہ ان کے لیے کسی اور لسانی پیرایۂ اظہار کا تصور نہیں، حالاں کہ انھوں نے بڑی خوبی اور سادگی سے بلاغت کے ڈانڈے کو فصاحت سے ملا دیا ہے، اس کے باوصف کہ وہ بلاغت کا رشتہ معانی سے اور فصاحت کا رشتہ الفاظ سے جوڑتے ہیں، شبلی کے یہاں تشبیہات اور استعارات کے بیچ امتیازات اور تفریق کا کوئی واضح تصور بھی نہیں ملتا، خیال آفرینی اور مضمون آفرینی کو قابل تحسین تو ٹھہراتے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ کم وقعت رکھتی ہیں، وہ قوتِ متخیلہ کے ضرور قائل ہیں — لیکن اس کا سبب شاید یہ ہے کہ شاعری میں فلسفیانہ استدلال اور منطقی استنباط کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی بلکہ جذباتی منطق (EMOTIVE LOGIC) سے کام لیا جاتا ہے، اپنے اس اعتراض کو شبلی نے متعدد بار دوہرایا ہے کہ مرزا دبیر کے یہاں خیال آرائی بہت زیادہ پائی جاتی ہے — لیکن وہ اس پر قابو نہیں رکھ پاتے — لیکن شبلی نے ان کی توضیح وتصریح اس طرح نہیں کی ہے جس طرح کہ تنافر لفظی اور

غرابت لفظی کے ذیل میں بحث کرتے ہیں۔ ''موازنہ'' کے مطالعے سے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شبلی کے ذہن میں اصطلاحات کا ایک تسلیم شدہ اور مروجہ سانچہ تھا جس میں انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور اپنے موازنے کو اس سانچے میں رکھ کر بحث کی ہے، اس سانچے میں جن ادبی اور انتقادی اقدار کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ سادگی، اصلیت، ہمواری، بندش کی چستی، تراکیب کی دل آویزی اور برجستگی ہے، خیال آفرینی، دقتِ نظر، طرفگی اور مبالغہ جس کو شاعری کا مابہ الامتیاز تصور کیا جاتا ہے، اس کو کم اہمیت دی ہے۔

بلاشبہ میر انیس کے یہاں فصاحت کے علاوہ ارتعاش اور ایک طرح کی تجذیب اور تہذیب ہے، احساسات اور جذبات کی جو نرمی اور گداختگی ہے، موقع و محل کے اعتبار سے ان کے معیار و مدارج میں جو تفریق نمایاں ہے، اس کے متعلق موازنہ میں کہیں ذکر نہیں ہے، اسی طرح سے مرزا دبیر کے یہاں معلوم و مانوس سے ماورا ہونے کی جو صلاحیت اور انفرادیت ہے، جو نکتہ آفرینی اور نکتہ سنجی ہے، اس کی جانب بھی شبلی نے کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے، اور انھوں نے بہت سی باتوں کو کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ اکثر و بیشتر اُلجھن ہونے لگتی ہے۔

یہ حقیقت ہے شبلی میر انیس کے ذیل میں جائز حدود کو پار کر گئے ہیں اور اُن کا یہ موازنہ ایک طرح سے جانب داری کا شکار ہو گیا ہے، شبلی شعرالعجم کی جلد چہارم میں اور اپنے موازنہ میں تخئیل کی بے پناہ قوت کو تو تسلیم کرتے ہیں، جس کی مدد سے ہم لامحدود امکانات کا پتا لگاتے ہیں اور نئی نئی دنیاؤں کی تخلیق کرتے ہیں —— لیکن وہ نہ تو اس صلاحیت کو ممیز اور ممتاز کرتے ہیں جس کے ذریعہ ہم اس میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جسے ہم امتیاز یا قوت فیصلہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں اور نہ ہی خیال آفرینی کے متعلق کوئی مثبت رویہ اختیار کرتے ہیں —— لیکن اس کے باوصف شبلی کے ''موازنہ'' نے اردو تنقید میں ایک انداز فکر اور طریقہ انتقاد کی باقاعدہ اور باضابطہ بنیاد ڈالی ہے اور آج بھی اردو مرثیہ نگاری کی تنقیدی تاریخ اور میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کی تفہیم میں یہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے، شبلی کے ہی باعث پہلی مرتبہ مرثیہ کے شاعرانہ پہلوؤں کی طرف ارباب ادب کی توجہ مبذول ہوئی، شبلی کو مشرقی تہذیبی اور ادبی سرمایے سے خصوصی شغف تھا اور ان میں اس کی حد درجہ صلاحیت بھی تھی اور اس کو خلوص دل سے برتتے اور سمجھتے تھے ان حقائق کی روشنی

میں علامہ شبلی نعمانی کے انتقادی کمالات کا جائزہ لینا مفید مطلب ہوگا۔

شبلی، میر انیس اور اردو مرثیہ کی طرف اس سبب سے بھی متوجہ ہوئے تھے کہ ان کے پیش نظر اس عہد کی زوال پذیر شاعری کی اصلاح مقصود تھی، اس عہد کے بھی ادیب شاعر اور مفکر اس فکر میں تھے کہ کیسے ملک اور قوم کو زوال سے نجات دلائی جائے، چنانچہ انھوں نے موازنہ کی تمہید میں اس بات کا اشارہ بھی کیا ہے:

''فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کرلیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلایا کہ اُردو شاعری میں زُلف وخال وخط یا جھوٹی خوشامد اور مدّاحی کے سوا اور کچھ نہیں، میر تقی میر کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ، شاعری کی جان ہیں لیکن اس بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے، میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی قدر روانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھے لکھتے ہیں .... اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ تھا کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ وتنقید لکھی جائے، جس سے اندازہ ہوسکے کہ اُردو شاعری باوجود کم مائگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لیے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے .... (۱۰)

حالانکہ شبلی سے پہلے محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی، میر انیس کی ادبی اور شعری اہمیت وفضیلت کا ذکر کر چکے تھے لیکن شبلی نے، انیس کو اپنے شعری پیمانے اور معیار ومیزان کی روشنی میں پرکھا ہے اور اس اندازِ نقد سے وہ انیس کو منفرد شاعر ثابت کرنا چاہتے تھے، ان کی انتقادی اور احتسابی نظر میں جو شاعری کی خصوصیات اور امتیازات تھے ان کی بہترین مثالیں اور نمونے انیس کی شاعری میں ہی دکھائی دیئے، شعرالعجم کی جلد چہارم میں جب وہ فارسی شاعری کے ذیل میں فن شعر گوئی سے متعلق اصولی مباحث رقم کر رہے تھے، اس وقت بھی شبلی نے انیس کی اُردو شاعری سے مثالیں پیش کی ہیں۔ دراصل شبلی نے مختلف اسباب کی بنا پر میر انیس کا انتخاب کیا ہے، انیس کو ایک

مکمل شاعر کے طور پر پیش کرنا شبلی کا اصلی مقصد تھا، انھیں یہ بھی بتانا تھا شاعری سے کیا مراد ہے؟ شاعر کا منصب کیا ہے، کن عناصر سے اچھی شاعری وجود میں آتی ہے، تخیل اور جذبات کسے کہتے ہیں؟ شاعری میں علم بدیع کی کیا حیثیت ہے؟ ان سب کی روشنی میں معیار و میزان مرتب کیا جائے، شعوری اور واقعہ نگاری اور محاکاتی عناصر پر بھی شبلی نے بحث کی ہے، یہ حقیقت ہے کہ شبلی اپنے مقرر کردہ معیار شاعری پر اتنا اعتماد رکھتے تھے کہ کسی اور معیار پر انیس کے کلام کو پرکھنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا، شبلی نے موازنہ کی تمہید میں ایک اہم جملہ لکھا ہے۔ جس سے ان کے انداز نقد کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے:

''جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو، اس کے سامنے میری انیس کی نسبت کمال شاعری کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔'' (۱۱)

اس جملے کی روشنی میں شبلی کے تنقیدی انداز نظر کی تفہیم ممکن ہے، اسی لیے موازنہ میں شاعری کے لفظی پہلوؤں اور بلاغت دونوں کا ذکر ہے، شبلی نے بلاغت کے باریک پہلوؤں مثلاً واقعیت، مناظر فطرت کی مرقع کشی، روزمرہ، جذبات نگاری اور واقعہ نگاری بھی کا تذکرہ کیا ہے اور بہت واضح مثالوں سے پیش کیا ہے، اس باب میں شبلی نے کوئی فلسفیانہ موشگافیوں سے کام نہیں لیا ہے۔

شعر وسخن کے سلسلے میں شبلی الفاظ پر زیادہ زور دیتے ہیں، وہ ان خیالات اور تصورات کو جن میں مسرت وانبساط کی کیفیت ہوتی ہے، اس کی دل کش پیش کش کو شاعری کہتے ہیں، موضوع کے مختلف پہلوؤں، اس کی ہم آہنگی کو دوسرے درجے پر رکھتے ہیں، شدتِ جذبات اور صداقت پر زیادہ توجہ کرتے ہیں، احساسات کی تصویر کشی میں تخیل کی کارفرمائیاں انھیں پسند ہیں اور اس میں جدت طرازی کا عمل زیادہ دل چسپی کا سبب بنتا ہے۔

حالی کے نزدیک مرثیہ کو شاعری میں اعلا اخلاقی حیثیت حاصل ہے، شبلی مرثیہ کے اس اخلاقی پہلو کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے حالاں کہ موازنہ کی تمہید میں یہ پہلو اُن کے پیش نظر تھا، اس سے حالی اور شبلی کے تنقیدی تصورات کا بنیادی فرق واضح ہو جاتا ہے، اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حالی اور شبلی کے عہد کو ادبی اقدار کی تلاش وجستجو کا عہد بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کیوں اس عہد میں ہر نقاد اپنے شعور وذوق کی روشنی میں ادبی اقدار کا تعین کرنا چاہتا تھا، موازنہ کو اسی تجسس اور

جستجو کی ایک سعی قرار دیا جا سکتا ہے، یہ سچ ہے کہ مرثیہ کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ''موازنہ'' نے نئی راہیں دکھائی ہیں اور آئندہ کے تبصرہ نگار اور ناقدین اس ڈگر پر چل کر کوئی مثبت رائے قائم کر سکتے ہیں اس لیے کہ اُردو تنقید کے ارتقا میں شبلی نے گراں قدر اور وقیع علمی انتسابات کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور سب سے پہلی عملی انتقادیات (Cpractical Criticism) کے رویے کی نشاندہی کی ہے۔

مراجع:

(۱) ڈاکٹر سید عبداللہ: سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۲۴۴۔

(۲) علامہ شبلی نعمانی: موازنۂ انیس و دبیر، ص ۳۰۔

(۳) ایضاً ص ۲۵۔

(۴) علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد دوم ''فن بلاغت'' مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء

(۵) موازنۂ انیس و دبیر، حوالۂ مذکورہ ص ۶۹۔

(۶) ایضاً، ص ۳۳۴۔

(۷) ایضاً، ص ۳۳۸۔

(۸) ایضاً، ص ۲۱۶۔

(۹) ایضاً، ص ۲۴۹-۲۴۸۔

(۱۰) ایضاً، ص ۵۴۔

(۱۱) ایضاً، ص ۳-۲۔

☆☆☆

شبلی کی معنویت

مولانا عمیر الصدیق ندوی☆

۱۸۵۷ء کے انقلاب انگیز سال میں جب بندول کے چھوٹے سے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا تو کسے معلوم تھا کہ بعد میں ایک حساس شاعر کے دل سے یہ آواز آئے گی کہ

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیض خاص ربانی نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلی نعمانی

انیس سال میں وہ تعلیمی لحاظ سے فارغ التحصیل ہوئے اور اس طرح کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث اور اصول فقہ کے لیے ان ہی علماء کے پاس دور دراز کا سفر طے کر کے گئے جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے، اب مسافتوں کی دشواری شاید کم سمجھ میں آئے لیکن ڈیڑھ سو سال پہلے کے زمانے میں یکہ اور پیدل کی سواری، خوشی سے برداشت کرنا اور کبھی کبھی والد کی اجازت کے بغیر چپکے سے نکل جانے کی مشقت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں، نامور اساتذہ کی خدمت میں حاضری کے التزام میں خود علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ "میں اس میں منفرد تھا" انیس سال ہی کی عمر میں سرکار دوعالم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور روضۂ مطہرہ کے سامنے اشعار پیش کرنے میں جہاں قدرت نے ان کو انفرادیت بخشی وہیں شاید یہ پیغام بھی زبان حال سے دے دیا کہ شبلی کی شناخت ہمیشہ منفرد ہی رہے گی۔

چوں بہ درت آمدم امیدوار ☆ سایہ لطفے زسرم برمدار

کیا درخواست تھی جس نے زندگی کے سفر کی ابتدا اور انتہا دونوں کی تعیین کردی۔

زمانہ نے چاہا کہ وہ وکیل بنیں، وکالت کریں، لیکن وکیل ازل نے تو ان کو ملک و ملت کی وکالت کے لئے منتخب کیا تھا، قانونی وکالت کے لیے تو ہزاروں لاکھوں تھے۔

شبلی کی پہلی تحقیقی کاوش اسکات المعتدی علی انصات المقتدی کے نام سے ایک مختصر رسالے کی شکل میں سامنے آئی، چند سال اعظم گڑھ، غازی پور میں گزرے لیکن ۲۶ سال کی عمر ہوئی

☆ رفیق، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

تو اس زندگی کا آغاز ہوا جس کے بعد عمر مستعار کے باقی بتیس برسوں نے ان کو دنیا کے مشاہیر کی صف میں بقائے دوام بخش دیا، علی گڑھ اور سرسید کے علی گڑھ نے ایک چھبیس سالہ نوجوان کی زندگی میں جو انقلاب بپا کیا اس کی تفصیل یہاں دہرائی جا چکی ہے، عربی کا فارغ التحصیل صرف ایک سال میں اعزہ اور احباب کو انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی تلقین کرنے لگا اور یہی نہیں ایک مجلس موازنہ ترقی قومی بھی قائم کر دی، شبلی کالج اسی مجلس کی فکر اور کارکردگی کا ثمرہ ہے۔

اب اگر مولانا کے تمام کارنامے بیان کیے جائیں کہ المامون سے شروع ہونے والے تصنیفی سفر میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم اور الفاروق، سیرۃ النعمان، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ کیسے شامل ہوئیں تو یہ اگرچہ قند کی لذت سے خالی نہیں لیکن ہے تو مکرر، اس لیے صرف اسی اعتراف کو دہرایا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ میں علامہ شبلی کی حذاقت اور قوت دماغی تھی کہ وہ جدید علمی مجالس کے اصول اور ان کی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا، جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا، نمائشی چیزوں کا رد کیا، یہ مولانا حبیب الرحمن شروانی کا تجزیہ ہے جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اور زیادہ واضح کر دیا کہ علی گڑھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا، ان میں سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی اور اس کا احساس ہے، مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے یہ احساس اب ان کا موضوع تھا، اور ہوتا بھی کیوں نا؟ سرسید کہتے تھے کہ قوم کو مرتے دیکھا نہیں جاتا، بیمار جاں بلب کو سب جانتے ہیں کہ دوا دینی بے سود ہے پھر بھی اس کے حلق میں دوا ڈالتے ہیں، یہی ہم سے ہو سکتا ہے، نجات دینی یا نہ دینی خدا کے ہاتھ میں ہے، سرسید کی تڑپ پر اسی مجلس میں نوجوان شبلی کہتا تھا کہ جس شخص نے ان فکروں میں اپنے بال سفید کر دیے ضرور ہے کہ اس کا دل تھوڑی بات پر رنجیدہ ہو اور اس حالت میں مجبورانہ ناامیدی کے الفاظ کہہ اٹھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ برسوں کے کام دو دن میں نہیں ہو سکتے...... یورپ جس کی ترقیوں پر آج زمانہ رشک کر رہا ہے ایک دن میں اس حالت پر نہیں پہنچا ہے...... دنیا میں اس قسم کے جتنے کام ہوتے آئے ہیں ایک مدت تک اس کا مادہ بنتا رہا ہے پھر ان کی صورت ظہور میں آئی، قوم کو آج جس چیز کی سخت ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کی قوتیں متحد ہو کر کام کریں، ترقی کے لیے بڑی چیز یہ ہے کہ لوگوں میں قومی مذاق پیدا کیا جائے اور یہ صرف اس طریقہ سے حاصل

ہوسکتا ہے کہ قوم کا ایک اچھا خاصا گروہ ایک جگہ جمع ہو اور سب کے خیال میں ہو کہ ہم صرف قومی کام کے لئے جمع ہوئے ہیں، سرسید کی تقریر اور علامہ شبلی کی تائید، سرسید اور علامہ شبلی کے تعلقات کے مطالعہ کرنے والوں کے دل کو آواز دیتے ہیں، علی گڑھ کو شبلی نے خیر باد کیوں کہا اس کو جاننا ہمارے لیے کیا ضروری ہے، ضروری تو صرف یہ ہے کہ علامہ جب ندوے پہنچے تو کیا وہ اس ملت کی بربادی کے درد کو بھول چکے تھے جو بقول ان کے شاگرد کے سرسید کی دین تھا، علی گڑھ میں رہتے ہوئے جب نوجوان شبلی ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے تو یہ الفاظ کسی تربیت خاص کا نتیجہ تھے کہ:

''مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد، سیادت، مشیخت، عربیت، عجمیت نہیں ہے بلکہ اسلام ہے اور اسلام کے سوا اور کچھ نہیں، اس امر کے ہونے کے بعد کہ ہماری قومیت اور اسلام گویا مرادف الفاظ ہیں ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلام سے علم کو کیا تعلق ہے کیوں کہ جو تعلق علم کو اسلام کے ساتھ ہوگا وہی ہمارے ساتھ ہوگا......... عرب کو دیکھو وہ ملک جس پر ابتدائے آفرینش سے علم کا سایہ تک نہیں پڑا تھا اسلام کے ساتھ اس کا ذرہ ذرہ علم کی روشنی سے چمک اٹھا، سلجوق دیلم، افغان تاتار ترک جو دنیائے آغاز سے بے علم رہے، اسلام قبول کرنے کے ساتھ شاعر، نگار، ادیب، فلاسفر اور حکیم بن گئے۔''

ندوۃ العلماء کے اجلاس میں انھوں نے علماء کو یہ بات یاد دلائی کہ یہ امر واقعی حیرت کے قابل ہے کہ جب مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے یعقوب کندی حکیم فارابی اور ابن سینا اور قطب الدین رازی کے نصابات بدلتے رہے تو سلسلہ نظامیہ کا آج تک من غیر تغیر بحال رہنا کس لحاظ سے ہے۔

علامہ کی یہ فکر اگر زمانہ کی آواز تھی تو اس کے اندرون وہی درد تھا یعنی اسلام کی تباہی اور مسلمانوں کی بربادی کا درد، بتیس سال کے عرصے میں شبلی کے زمان ومکان بدلے، الفاروق والمامون کا سفر شعر العجم تک پہنچا لیکن ایک درد کا سفر تھا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہا، یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایرانی شاعری کی تاریخ لکھی جائے، موسم بہار، شراب، غزل، تشبیہات، صنائع بدائع، مبالغہ، مضمون آفرینی، مناظر قدرت، شوخی وظرافت کے مضامین پر اعلی تحقیقی وتنقیدی بحث ہو، شاعری اور اس کے تمام اقسام، محاسن، معائب کا ناقدانہ تجزیہ ہو لیکن کتاب کا آغاز اس جملے سے ہو کہ:

''اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بہ

قدر استعداد پہنچا، قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرق مراتب تھا اور فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم وفنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا، شاعری اس کا خمیر تھی، اسلام نے اس خاص جوہر کو اور چمکایا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف۔''

شعر العجم تو ادبی تاریخ ہے، ان کا سفر نامہ ہو یا مکتوبات ہوں اگر مشترک طور پر کوئی لہر سب میں رواں ہے تو وہ صرف اور صرف عظمت رفتہ کی از سر نو بحالی کی فکر ہے، اردو کو دیونا گری سے بچانے کی مہم ہو یا ہندو مسلم اتحاد پر مبنی ایک سیاسی ڈھانچہ کی تشکیل، ہم کو تو صرف ایک عنصر ہی ہر جگہ کارفرما دکھائی دیتا ہے اور یہ ہے اسلام کی سربلندی، سیرۃ النبیؐ کے خاتمہ بالخیر کی بشارت ان کے لئے یوں ہی نہیں رہی، یہ ان کے ایمان کی بلندی تھی کہ انھوں نے سیرۃ النبیؐ سے پہلے کی تحریروں کو آستان غیر میں مقیم ہونا بتایا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جس سیرت کی تالیف کے لیے فرشتوں میں چرچا ہو، کہ دبیر چرخ لکھے کہ روح الامین اور فیصلہ یہ ہو کہ یہ تو وہ شے ہے کہ لکھتے تو ہمیں لکھتے، اس کے لیے شبلی کا انتخاب اگر ہوا یقینا شاید یہ ان کی پاک نیت کی قبولیت کی علامت تھی۔

شبلی کی ہر تحریر اور ہر فعل وعمل کو اگر وہ معنویت حاصل ہوئی جس کے اثرات کا اندازہ کل سے پڑھے جانے والے مقالات سے ہوتا ہے تو یہ کہنا حق بجانب ہے کہ گذشتہ صدی کی اسلامی دنیا پر صرف اور صرف علامہ شبلی کے اثرات کی عملداری ہے، ابوالکلام آزاد ہوں، محمد علی جوہر ہوں، سید سلیمان ندوی اور ان کا دارالمصنفین ہو یا مولانا مودودی اور مولانا علی میاں ہوں، گذشتہ صدی کے ہر سنگ میل پر شبلی موجود ہیں ان کی معنویت نے خود کو عملاً ثابت کیا ہے، اور آج بھی ضرورت اسی معنویت کی اہمیت کو تسلیم کرنے کی ہے شبلی، واقعی روایتی جنید وشبلی نہیں تھے لیکن یہ اقرار تو کرنا ہی ہوگا کہ اگر کوئی ہلاک جادوے سامری نہیں اور اگر کوئی قتیل شیوہ آذری نہیں اور اگر کسی میں کلیم کا سلیقہ اور خلیل کا قرینہ دیکھنا ہو تو شبلی کو دیکھے، شبلی آج بھی موجود ہیں کیونکہ۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی، وہی مرحبی وہی عنتری

☆☆☆

شبلی نعمانی کی عصری معنویت

شمیم طارق☆

ہندوستان کا یوں تو ویدوں کے زمانے سے ہی مختلف نسلوں، قبیلوں اور مذہبی گروہوں سے سابقہ رہا لیکن مسلمانوں اور فرنگیوں سے اس کا رابطہ کئی حیثیتوں سے زیادہ دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا، اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں سے پہلے جو قومیں یہاں آئیں وہ نیم متمدن یا قطعی غیر متمدن ہونے کے سبب یہاں کی تہذیب میں ضم ہوتی گئیں جو ایک ہی مٹی اور ماحول سے ہم رشتہ ہونے کے باوجود الگ الگ خطوں اور علاقوں میں الگ الگ انداز سے نمو پذیر تھی، سب سے پہلے مسلمانوں نے جن کے مذہبی معاشرتی اصول ان کے معمولات و معاملات زندگی میں نمایاں تھے اور پھر فرنگیوں نے جو دنیا پر سیاسی معاشی تسلط کے علاوہ علمی ثقافتی تسلط قائم کرنے میں بھی پر جوش تھے، ہندوستان کے لوگوں اور ان کے ذہن و تہذیب کو متاثر کرنے کی کوشش کی، کسی حد تک دونوں کامیاب ہوئے لیکن ایک بنیادی فرق کے ساتھ، مسلمانوں نے ہندوستان جنت نشان کو اپنا ''پدری وطن'' سمجھ کر یہاں کے لوگوں کو دینی و دنیوی فلاح و صلاح سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی اور پھر اسی کی خاک کا پیوند ہو کر امیر مینائی کے اس شعر کی تفسیر بن گیے:

جنت میں روح جسم ہے نیچے مزار کے
کشتی ہماری ڈوب گئی پار اتار کے

مگر فرنگیوں کی تمام تر توجہ اس ملک کی دولت و حشمت کی بہ جبر تحصیل کے ساتھ اس کے

☆ فلیٹ نمبر ۲۷، چوتھا منزلہ، مرزبان مینشن، بائیکلہ فروٹ مارکیٹ، بائیکلہ، ممبئی۔ ۲۷۔

ثقافتی ورثے کی تحقیر پر رہی، نتیجتاً ہندوستانیوں کی روح اس کرب سے دوچار ہوئی جس کی ترجمانی کرتے ہوئے مصحفی نے کہا تھا کہ:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

مصحفی کا یہ شعر عام طور سے اسی طرح نقل ہوتا رہا ہے مگر ابوالخیر کشفی نے مصحفی کے ''دیوانِ چہارم'' کے حوالے سے اس شعر کو جس طرح نقل کیا ہے اس میں بجائے ہندوستاں کی ''اسلامیوں میں'' استعمال ہوا ہے یعنی:

اسلامیوں میں دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی (۱)

مصحفی کے سالِ ولادت کے سلسلہ میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس کے باوجود یہ طے ہے کہ وہ نواب سراج الدولہ کی شکست سے پہلے پیدا ہو چکے تھے اس لیے فرنگیوں کے جبر وظلم کے واقعات سنتے رہے ہوں گے، ۱۷۹۹ء میں جب ٹیپو سلطان شہید ہوئے اس وقت مصحفی کی عمر ۵۰ سال کے آس پاس رہی ہوگی، اس کے بعد ہی ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے نصرانیوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا جس کا اثر پورے ملک پر مرتب ہوا، مصحفی پر بھی ٹیپو کی شہادت اور محدث دہلویؒ کے فتوے کا اثر پڑا ہوگا اس لیے اس شعر میں ''اسلامیوں میں'' ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، مجنوں گورکھپوری کا یہ کہنا بھی کہ:

''وہ (مصحفی) بیک وقت ماضی کی یادگار اور حال کی کشاکش میں مبتلا مستقبل کے میلان کا اشاریہ ہیں۔'' (۲)

اس حقیقت کا غماز ہے کہ مصحفی ہی وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنے تمام پیش روؤں اور ہم عصروں کے مقابلے فرنگی استعمار کے خلاف زیادہ قوت وشدت سے آواز بلند کی، یہ وہ دور تھا جب قومیت کے جدید ترین تصور کے پیدا نہ ہونے کے سبب قومی احساس اور ملی احساس میں فرق کیا جانا ممکن نہیں تھا، ''اسلامیوں'' کی اصطلاح ان مسلمان دیسی حکمرانوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جنھیں شکست دے کر فرنگیوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، اس لیے یہ اصطلاح بیک وقت ملی احساس سے

بھی ہم رشتہ ہے اور قومی احساس سے بھی، یہی احساس ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں میں بھی تھا جو بہت اچھے ہندو تھے مگر مسلمان حکمرانوں سے رہائی کے نام پر ''فرنگی تسلط'' برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے، اس لیے سب نے مل کر مسلح مزاحمت کا فیصلہ کیا، جبر و ظلم کا منطقی نتیجہ بغاوت ہی ہے اس لیے اس بغاوت پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں تھی مگر انگریزوں نے حیرت کا اظہار کیا، شاید اس لیے کہ وہ صرف اقتدار کی قوت سے واقف تھے، محکوموں اور مظلوموں کی اس قوت سے واقف نہیں تھے جو ہر دور میں جابر سلطانوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتی رہی ہے، تھامسن لو حیرت سے چیخ پڑا کہ:

> ''دختر کش راجپوت، کٹر برہمن، متعصب مسلمان اور عیش پسند تو ندوالا، من چلا مراٹھا، سبھی اس جہاد میں شامل ہو گئے۔ گائے کا قاتل اور گائے کا پجاری، خنزیر سے کراہیت کرنے والا اور خنزیر کا گوشت کھانے والا، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والا اور برہم کے منتروں کو گنگنانے والا سبھی نے مل کر بغاوت کی۔'' (۳)

اس مسلح مزاحمت کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اقتدار سے دستبردار ہونے پر مجبور ہونا پڑا، اس کے باوجود ہندوستانیوں کی سادہ لوحی فرنگی مکر سے ہار گئی اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی بدلے ہوئے نام کے ساتھ غلامی ہی ان کا مقدر بنی رہی، لیکن چونکہ ہندوستانیوں کی انقلاب برپا کرنے کی متحدہ کوششوں نے فرنگیوں کو خوف زدہ کر دیا تھا اس لیے ملکہ برطانیہ کی حکومت نے ہندوستان کی دولت و حشمت اور زمین پر قبضہ برقرار رکھنے کے ساتھ ان کے ذہن و ضمیر پر قابض ہونے کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی کوشش کو جامع منصوبے کی شکل میں جاری رکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کی تعلیم و تاریخ کے علاوہ تہذیب بھی بدلنے لگی، ''آئین نو'' کو عام کرنے کے نام پر تاریخ و نصاب میں زہر گھولنے کی کوششیں کی جاتی رہیں تا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو وحشی ثابت کیا جا سکے۔ مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں بھی شروع کی گئیں کیوں کہ فرنگی ہندوستانیوں کے اتحاد پر حیران تو تھے مگر ۱۸۵۷ء کے واقعات کا اصل ذمہ دار مسلمانوں کو ہی سمجھتے تھے۔

اس تبدیلی نے مغل ماضی سے منہ موڑ کر برطانوی مستقبل پر ایمان لانے والے طبقے کو

نمایاں اور فرنگیوں کے ساتھ ''فرنگیت'' کے ہر نقش کو مسترد کرنے والے تحریک ولی اللٰہی سے متاثر علماء اور کچھ دوسرے انقلابی گروہوں کو الگ الگ دائروں میں خفیہ طور پر منظم وسرگرم کیا۔ ایک تیسرا گروہ بھی سرگرم عمل ہوا۔ جس کی قیادت سرسید احمد خاں کر رہے تھے لیکن اس دور کے سرسید کی فکر ۱۸۴۶ء سے پہلے اور ۱۸۸۵ء کے بعد کے سرسید کی فکر سے مختلف تھی، (۴) یہ وہ سرسید تھے جنھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر فرنگیوں کو ان کی غلطیوں کا احساس دلانے کے ساتھ ''مدرسۃ العلوم'' اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو حکومت وقت کا شریک بنانے کے علاوہ برطانوی ہندوستان میں اسلامی اور مشرقی علوم کے تحفظ کا خواب بھی دیکھا تھا۔

شبلی کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی، وہ بڑی آسانی سے ان علماء کی جماعت اور سرگرمیوں میں شمولیت اختیار کر سکتے تھے جو فرنگیوں کے علاوہ فرنگیت کے ہر نقش کو مٹانے پر تلی ہوئی تھی اور چونکہ وہ چھوٹے ہی سہی مگر زمیندار خاندان کے فرد تھے اس لیے اپنے معاشی اور سماجی حقوق کے تحفظ کے لیے فرنگی حاکموں سے مفاہمت کی راہ پر چل کر ان لوگوں میں شامل ہو سکتے تھے جو برطانوی مستقبل پر ایمان لا کر عیش کر رہے تھے، لیکن انھوں نے سرسید کی رفاقت اختیار کی جو مذہبی تشخص اور فرنگیت کی مخالفت کے نام پر جدید علوم وفنون کی مخالفت کرنے والے علماء اور عصری ضرورت و مصلحت کے نام پر فرنگیت کو اپنا شعار بنا لینے والوں سے یکساں دوری اختیار کرتے ہوئے ایک نئی ڈگر تیار کر رہے تھے، انھوں نے ایک دو سال نہیں پورے ۱۶ سال سرسید کی رفاقت میں بسر کیے، سرسید کی مذہبی فکر سے انھیں شروع سے ہی اختلاف تھا لیکن جب ''الفاروق'' کی تصنیف واشاعت، کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں پڑھائے جانے والے نصاب کی نوعیت پر ٹکراؤ کی نوبت آ گئی تو انھوں نے سرسید کی رفاقت کو ختم کر دینے میں ہی عافیت سمجھی، البتہ وہ سرسید کے تعلیمی کارناموں کی تعریف آخری سانس تک کرتے رہے، اس علیحدگی پر رائے زنی کرنے والوں نے رائے زنی کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے، بدرالدین طیب جی جیسے علم دوست و وطن دوست شخص بھی ان کے ہم زبان تھے، اس کے بعد کا دور جس میں قوم کی ذہنی بیداری اور آزادی کی قومی تحریک پر شباب آیا تو شبلی اگرچہ بزم ہستی سے رخصت ہو چکے تھے مگر پورا ہندوستان ان ہی کی بولی بول رہا تھا، ہندو مسلم اتحاد اور کانگریس زندہ باد کے نعرے لگائے

جار ہے تھے، گاندھی جی نے آزاد ہندوستان میں تشکیل پانے والی حکومت کے حضرات خلفائے راشدینؓ کے دور حکومت اور اسوۂ عمل کو مثال بنانے کی بات کہی تھی، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے زیر اثر نہ صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ کیا جانے لگا تھا بلکہ نیا تصور تعلیم اور نئی تعلیم درسگاہوں کے قیام کا جذبہ بھی عملی شکل اختیار کر رہا تھا، اس دور میں ''تعلیم نسواں'' یعنی خواتین کی تعلیم اور ان کے سماجی کردار کے بارے میں جو باتیں کہی گئیں ان میں بھی اس آواز کی بازگشت موجود تھی جو شبلی نے عطیہ فیضی کے نام اپنے خطوط میں یا کسی اور مضمون میں بلند کی تھی، عطیہ فیضی کے نام شبلی کے بعض خطوط کے علاوہ ان کی دوسری تحریروں کی روشنی میں کئی اہل قلم نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شبلی اپنی عملی زندگی میں اتنے کشادہ قلب وکشادہ ذہن یا آزاد خیال نہیں تھے کہ عورتوں کے خود کمانے اور کھانے کی وکالت کرتے، یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے کیوں کہ شبلی دینی تعلیم، مشرقی اقدار اور پردہ کے قائل تھے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ عطیہ فیضی کو جو کچھ لکھتے تھے اس کا مقصد حضور حسن کو صرف یہ یقین دلانا نہیں تھا کہ ان کو فرسودہ خیالات کا حامل، مولوی محض نہ سمجھ لیا جائے، ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کے مقام ومرتبے، سماجی کردار اور تعلیم ومعاش کے بارے میں شبلی فکرمند تھے اور عطیہ سے ان کے تعلق کی وجہ ان کا وہ خواب تھا جو مستقبل کی مسلمان عورتوں کے بارے میں وہ دیکھ رہے تھے۔

شبلی نے صرف ۵۷ سال کی زندگی پائی، لیکن اس ۵۷ سالہ زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ تاریخ اشخاص، تاریخ علوم اور تنقید ادب پر مشتمل ہے، انھوں نے بہت سے جدید علوم سے بھی اردو کو متعارف کرایا لیکن جو کچھ لکھا سوچ سمجھ کر ایک خاص مقصد اور ایک مقررہ لائحۂ عمل کے تحت لکھا، تاریخ ونصاب میں نفرت کی گنگوتری کی نشاندہی کی، تاریخ مذہب اور مذہبی داستانوں کا فرق واضح کیا، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے مستقبل کی طرف ایسے اشارے کیے کہ عبدالحلیم شرر کو لکھنا پڑا کہ ''مولوی شبلی نے اس کتاب کے ذریعہ ایک دلفریب خواب ہمیں دکھلایا ہے اور ہم اس درجہ محو ہو رہے ہیں کہ گھڑی گھڑی وجد میں آکر چاہتے ہیں کہ یہ خواب اپنی قوم کو بھی دکھا دیں۔''
انجمن ترقی اردو ہند، اور دکن میں سررشتۂ علوم وفنون کے ناظم کی حیثیت سے اردو کی ترویج واشاعت اور اردو ہندی کے جھگڑے کے دوران پوری قوت سے سچائی کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ''الندوہ''

کے ذریعہ علمی خیالات کی ترویج کی اور عمر کے آخری دنوں میں دارالمصنفین قائم کر کے اردو کے ساتھ مشرقی علوم وتاریخ کے سلسلہ میں صحت مند نقطۂ نظر کے فروغ کی ایسی صورت پیدا کی جو آنے والے زمانے میں بھی اپنا کام کرتا رہے۔ مہدی افادی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''خاتم المصنفین شبلی نے ہمارے لیے کم وبیش پانچ ہزار صفحوں کا ذخیرۂ ادب چھوڑا ہے، یہ لٹریچر کی وہ قیمتی صنف ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں ''تنقیدات عالیہ Higher Criticism'' کہتے ہیں، آپ لوہے کے چنے کہیے اور میرا خیال ہے کہ اسلام کے متعلقات میں اتنا بڑا سرمایہ اور وہ بھی اس قدر کسی زبان میں موجود نہیں، شبلی میں ایک خاص طرح کا مادہ اختراعی بھی تھا، وہ ایک ہی وقت میں اعلیٰ درجے کے مورخ، اعلیٰ درجے کے ناشر، اعلیٰ درجے کے شاعر، غرض مشرقی زبانوں میں مختلف اصناف سخن کے پورے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپ کے مستشرقین کی طرح ان کا معیار تصنیف اتنا بلند تھا کہ میرا خیال ہے کہ سینکڑوں برس بعد بھی تصنیفات ٹکسال باہر نہ ہوں گی، ایسا جامع حیثیات غالباً اب پیدا نہیں ہوگا۔'' (۵)

شبلی نے جس دور میں سانس لی وہ انیسویں صدی عیسوی کا آخری اور بیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی دور تھا، اس دور میں اگرچہ حکمرانی تو ملکۂ برطانیہ کی تھی مگر بدلی ہوئی شکل میں، منصوبے وہی تھے جس کی ابتداء ایسٹ انڈیا کمپنی نے کی تھی، آج ملٹی نیشنلز یعنی کثیر القومی کمپنیوں کی شکل میں بہت سی ایسٹ انڈیا کمپنیاں ہندوستان پر قابض ہو چکی ہیں، صارفیت یعنی Consumer Culture نے بہ شمول مسلمان ہر مذہب کے ماننے والوں کے مزاج وطبیعت کو متاثر کیا ہے، عالم کاری یا Globalisation کا اثر صرف معیشت پر نہیں تعلیم ونظام تعلیم پر بھی مرتب ہو رہا ہے، سٹیلائٹ کلچر اور سائنس وٹیکنالوجی کے استقبال کے نام پر قومی، ملی، تاریخ وثقافت اور زبان وادب کی کسی حد تک ان دیکھی ہی نہیں تحقیر بھی کی جانے لگی ہے جس کے سبب نئی نسل بے یقینی کی راہ پر گامزن ہے، تاریخ ونصاب کی کتابیں جھوٹ کو پرعطا کر رہی ہیں، آزادیٔ نسواں کے نام پر دوانتہا پسندانہ نقطہ ہائے نظر پروان چڑھ رہے ہیں، سیاست میں متحدہ قومیت پر مبنی نظریہ ایک بار پھر مسترد کیا جا رہا ہے، ایسے میں شبلی کے افکار اور لائحہ عمل میں ہی ہمیں امید کی ایک کرن نظر آتی ہے،

ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے شبلی سے زیادہ موزوں کوئی دوسری علمی شخصیت جو قدیم وجدید علوم وافکار کا حسین و متوازن امتزاج ہو نظر ہی نہیں آتی ، وہ قدیم علوم اور اسلامی تصور حیات کے پارکھ ہونے کے باوجود قدامت پسند نہیں تھے ، البتہ جدید علوم ونصاب تعلیم کے نام پر پھیلائی جانے والی اس پراگندہ خیالی کے مخالف تھے جو ذہن وطبیعت سے اعتدال اور نفس سے تہذیب چھین لیتی ہے ، شبلی نے ہی احساس دلایا تھا کہ یورپی مصنفین اور مستشرقین جدید تاریخ نویسی کے اصول وآداب سے تو واقف ہیں مگران کے سینوں میں اسلام ومسلمان کے خلاف تعصب کی دبی ہوئی آگ اپنا کام کرتی رہی ہے ، انگلش ، جرمن اور فرنچ میں لکھی ہوئی تمام قابل قدر تحریریں نہ صرف ان کی نظر سے گزر چکی تھیں بلکہ ان کی قابل اعتراض باتوں کی تردید میں انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اس کی ایک ایک سطر اعتماد واستدلال سے مزین تھی۔

آج پھر مسلمانوں کے مذہب وطریقۂ تعلیم ، تاریخ وادب اور عورتوں کی تعلیم کے بارے میں غیر متوازن باتیں کہی جارہی ہیں اور ایسا کرنے والوں میں مستشرقین و مستشرقین کے جملوں کو بے سیاق وسباق دُھرانے والے ہندوستانی مصنفین کے علاوہ وہ مسلمان بھی ہیں جنھوں نے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح تعصب کے زہر سے بھری ہوا کو اپنا محسن سمجھ لیا ہے ، ایسے میں کسی کی شخصیت مشعل راہ بن سکتی ہے تو وہ شبلی ہی کی شخصیت ہے ، ان کی فکر اور لائحہ عمل کی جو معنویت ان کے جیتے جی تھی وہی معنویت آج بھی ہے جب ان کی پیدائش کو ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں اور صرف ۷ سال بعد موت کو بھی ۱۰۰ سال مکمل ہو چکے ہوں گے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہی مسائل آج بھی ہمیں درپیش ہیں جو ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تھے ، ان مسائل کو نہ تو علماء کی طرح دنیا کی مختلف قوموں یا برادرانِ وطن کے مختلف طبقوں سے الگ تھلگ رہ کر حل کیا جا سکتا ہے نہ ۱۸۸۵ء کے بعد کے سرسید کی طرح حکمراں طاقتوں کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے ، اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو عورتوں کی تعلیم ، مغربی تعلیم ، تاریخ ونصاب کی غیر متوازن کیفیت اور برادرانِ وطن کے درمیان پلنے والے دہشت گرد ٹولوں کی صورت میں جو خطرات درپیش ہیں انھیں شبلی کی ہی فکر ونظر کی روشنی میں سمجھنے اور انہی کے لائحہ عمل کے مطابق دور کرنے کی ضرورت ہے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ شبلی زندگی کے حقائق ومسائل کے بارے میں جو فیصلے صادر کرتے تھے وہ ہر رخ اور ہر زاویے پر محیط ہوتے تھے ، ان کے نزدیک ماضی میں محصور ہو جانا بھی غلط تھا اور تجدد پسندی کے نام پر روایات سے

یکسر منحرف ہو جانا بھی، تعلیم کے بارے میں ان کا نظریہ تھا کہ قدیم علوم زمانے کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے اور محض جدید علوم دین و مذہب سے بیگانہ بنا دیتے ہیں، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کو وہ ناپسند کرتے تھے، اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ عورتیں مردوں کی طرح حالات زمانہ سے باخبر، مہذب و تعلیم یافتہ اور تحریر و تقریر کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوں، مگر اس کے ساتھ وہ اس بات کے بھی خواہش مند تھے کہ مسلمان مرد و عورت اپنے اقبال گزشتہ سے واقف ہوں اس لیے انھوں نے اپنے علمی منصوبے یا لائحہ عمل میں اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ:

☆ یہ بتایا جائے کہ جدید فلسفوں کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں اور پھر ان مسائل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

☆ جدید یورپ میں جس قسم کے موضوعات پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں ان میں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرزِ تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرزِ تصنیف کیا ہے؟ مثلاً تاریخ اسماء الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقاتِ مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں انھیں موضوعات پر یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کیے گیے ہیں، اس لیے موازنہ کر کے یہ واضح کیا جانا چاہیے کہ دونوں کی مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح دی جا سکتی ہے؟

☆ خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر ...... وغیرہ کی تاریخ مرتب کر کے ان پر تبصرہ لکھا جائے تا کہ عام لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیوں کر بڑھے، کس کس زبان میں ان میں کیا کیا اضافے ہوئے اور کن اسباب سے ہوئے؟ ان کا کتنا حصہ صحیح ہے اور کتنا حصہ تنقید و اصلاح کا محتاج ہے؟

☆ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن پر تاریخ کی روشنی میں مضامین لکھے جائیں مثلاً انتظامِ عدالت، انتظام محاصل، تعلیماتِ تجارت، پبلک ورکس، فوجی نظم و نسق، معاشرت ...... وغیرہ پر مورخانہ دیانت کا لحاظ رکھتے ہوئے بحث کی جائے تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا کیا اضافہ ہوا؟

جن ضرورتوں، حکومت کے منصوبوں یا سیاسی تعلیمی تبدیلیوں نے شبلی کو مندرجہ بالا لائحہ عمل

مرتب کرنے کی تحریک دی تھی وہ آزاد ہندوستان میں بھی موجود ہیں اس لیے شبلی کی عصری معنویت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

ملک کے آزاد ہونے کے ۳۳ برس پہلے ہی وہ انتقال کر چکے تھے، ان کے سامنے یہ بھی واضح نہیں ہوسکا تھا کہ آزاد ہندوستان میں کس قسم کی حکومت ہوگی اور وہ کن خطوط پر کام کرے گی، اس کے باوجود ۱۸۸۵ء کے بعد کے سرسید احمد خاں اور مسلم لیگ سے اختلاف کا اظہار کر کے انھوں نے واضح کر دیا تھا کہ مخلوط معاشرے میں جہاں بہت سے مذاہب اور زبانیں ہوں، زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کے آداب بھی مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ان کی تحریریں اسلامی احساس سے خالی نہ ہونے کے باوجود تعصب اور منافرت کے جذبات سے عاری ہیں، ان میں کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کے لیے نفرت نہیں ہے، ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، نقطۂ نظر کے سبب ان کو معتوب نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے عقل اور تاریخ کی روشنی میں اس طرح لکھا ہے کہ ''ماضی و مستقبل میں اسلامیانِ ہند کے ہند سے تعلق کی نشاندہی ہو سکے''

اگر آج وہ زندہ ہوتے اور ہماری قومی حکومت کی تعلیمی پالیسی، نصاب، ثقافتی دہشت گردوں کے خواب اور روشن خیالی کی مذہب واخلاق دشمن روش دیکھتے تو ان کا بھی علمی محاسبہ کرتے، کچھ اور نکات بھی ہیں جو شبلی کی عصری معنویت کو اجاگر کرنے اور ان کے تاریخی شعور کی افادیت کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، شرط ہے تو آج کے تناظر میں ان کے خیالات کا مطالعہ کرنے کی۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اس لیے ان کی ''یادگار شبلی'' کا اختتام ان سطور پر ہوا ہے:

> ''مولانا شبلی کی زندگی میں سبق اور ہمت آموزی کا بڑا سامان ہے، خوش قسمت تھے وہ لوگ جو ان سے براہِ راست فیضیاب ہوئے، لیکن علامہ کا اصل سرمایۂ حیات صفحۂ قرطاس پر ثبت ہے، اس سے مستفید ہونے کا ہمیں بھی پورا موقع حاصل ہے:
>
> صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے (۶)

☆☆☆

ماخذ

(۱) اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، کراچی۔

(۲) ایم، حبیب خاں، اردو کے کلاسیکی شعراء، جلد اول علی گڑھ ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۵۔

(۳) Thompson Loo. central india during the Rebellion of 1857 1858. London- 1860 Page. 36.

(۴) ''آثار الصنادید'' کے پہلے ایڈیشن کے چوتھے باب سے ۱۲۰ مشاہیر کا حال معلوم ہوتا ہے بعد میں جو نسخے شائع ہوئے ان میں سے یہ باب حذف کر دیا گیا ہے، کافی عرصہ بعد انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس باب کو ''تذکرۂ اہل دہلی'' کے عنوان سے شائع کیا۔

(۵) مہدی افادی۔ افادات مہدی۔

(۶) ڈاکٹر شیخ محمد اکرم، یادگار شبلی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۵۶۔

☆☆☆

کے شعری سرمائے کو کیا اعتبار بخشتا ہے؟ اس سوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اُن کی اردو شاعری کا مطالعہ کیا، یہ ایک صدی جوان کی شاعری میں زندہ عناصر اور میرے طالب علمانہ مطالعے کے درمیان پھیلی ہوئی ہے کم سے کم اردو کی تین نسلوں کے تاثرات پر مشتمل ہے، ان تاثرات میں مولانا شبلی نعمانی کے حوالے سے معاندانہ جذبات کا عمل دخل بھی بہ آسانی نظر آتا ہے۔ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی کچھ ناقدین شبلی کی شعری حیثیت کو ان کی کردار کشی کے لیے موضوع بحث بنائے ہوئے ہیں۔ یہ مختصر مطالعہ شبلی کی اردو شاعری میں ان زندہ عناصر کی تلاش ہے جو ان کے سچے تخلیقی جوہر کے آئینہ دار ہیں اور ایک صدی گزرنے کے بعد جن کی لو مطالعۂ شعر کے نئے قارئین کو متاثر کرتی ہے۔ فن جس کی تخلیق کے لیے اخلاص کو اساس کا درجہ حاصل ہے اس اثاثۂ شعر کا حسن ہے اور اسی سبب اس میں تاثیر آج بھی —— ایک صدی گزرنے کے بعد بھی —— موجود ہے۔ شبلی کا یہ حصۂ شعر دو بنیادی جذباتی دھاروں سے عبارت ہے، ایک دھارا اُن کے ملی جذبات سے پھوٹتا ہے اور دوسرا اُن کی ذاتی و قلبی واردات کا آئینہ دار ہے۔

جہاں تک مولانا شبلی کے قومی و ملی جذبات کا تعلق ہے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اُن کی زندگی، تحریروں اور دوسری مساعی کا زیادہ تر حصہ قومی و ملی مقاصد کے حصول ہی کے بارے میں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی صورت حال میں اسلام کی گراں قدر شخصیات اور تاریخی واقعات کا بیان اُمتِ مسلمہ کے اندر مذہبی جذبات واحساسات کی بازیافت ہی نہیں، اُن کے اندر مذہبی و ملی شعور کو عام کرنے کی شعوری کوشش بھی ہے۔ ان کی تصنیفات کا غالب رُخ اسلاف کے اوصاف و کردار کا وہ بیان ہے جس نے مسلمانانِ ہند کو اپنی روایات و تاریخ اور مذہب و اکابرین کے بارے میں نہ صرف اعتبار بخشا بلکہ ان کے اندر ایک روح تازہ پھونکی۔ ان کی اردو شاعری کا ایک حصہ بھی ایسے ہی ملی و قومی احساسات سے عبارت ہے۔

شبلی کی اردو شاعری کا بڑا حصہ واقعیت نگاری پر مشتمل ہے۔ وہ جس ماحول میں رہ رہے تھے اور انھیں جس طرح کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل درپیش تھے انھوں نے اُن کو قلم بند کیا، ان کی شاعری کے لب و لہجے میں آرٹ سے زیادہ کرافٹ کا پرتو نظر آتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو اپنے مرکزی ذریعۂ اظہار کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ ایک ذیلی شوق کے طور پر اپنایا۔ انھوں نے اپنی

تحریروں خصوصاً مکاتیب میں اپنے اس رویے کی نشاندہی بھی کی ہے جو ان کی شعر گوئی سے متعلق ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''.......... میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے یہ جو کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں شاعری نہیں تفریح طبع ہے۔''

(مکاتیب شبلی، جلد اول، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء، ص ۳۴۱)

تاہم انھوں نے نمایاں حد تک شاعری کی، اور قابل ذکر حد تک شعری اثاثہ اردو کو دیا، یہ شاعری شبلی کے معاصر واقعات سے متعلق ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے زمانے کی سیاسی اور معاشرتی فضا میں جنم لینے والے واقعات کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اُن کا زیادہ کلام موضوعاتی نظموں سے متعلق ہے بہ قول ڈاکٹر شمس بدایونی:

''ان نظموں کا تعلق اپنے عہد کی تحریکات، سیاسیات اور بعض قومی و ملی مسائل سے ہے چند نظمیں جنھیں مذہبی یا اخلاقی شاعری کے ضمن میں رکھا جا سکتا ہے یقیناً نصیحت و موعظت اور مقصد و افادیت سے مملو ہیں، باقی کلام وقتی اور ہنگامی شاعری کے ضمن میں آتا ہے لیکن اس کی ادبی اہمیت اور تاریخی افادیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

[شمس بدایونی ڈاکٹر ''شبلی بحیثیت اردو شاعر'' مشمولہ ''شبلی کی علمی و ادبی خدمات'' خلیق انجم (مرتب) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی، ۱۹۹۶ء ص ۲۱۰]

شبلی نعمانی کی اردو شاعری کے موضوعات کا جائزہ لیں تو ان میں سرسید تحریک، قصص اسلامی، مسلم لیگ اور احرار، اہم عصری واقعات و حادثات نمایاں ہیں۔ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو غفلت سے نکالنے کے لیے خاص طور پر شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس سے وہی کام لیا جو مولانا حالی، اکبرالٰہ آبادی اور بعد میں علامہ اقبال نے لیا۔ موضوعات کے حوالے سے ان اکابرین میں حیرت انگیز حد تک مماثلتیں نظر آتی ہیں۔

شبلی کی قومی مسدس کو دیکھیے، اس میں موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب بھی ایسا ہے جسے بعد میں علامہ اقبال نے شکوہ اور جواب شکوہ کے لیے استعمال کیا، یہاں پر پروفیسر آل احمد سرور کے اس قول کی صداقت کا اندازہ ہوتا ہے، جنھوں نے کہا ہے:

"......شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اقبال کہاں ہوتے۔"

(آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ، ۱۹۴۹ء، ص ۲۱۹)

علامہ اقبال نے شکوہ کا خمیر جن موضوعات پر اٹھایا ہے اُردو شاعری میں اس کی اولین جھلک مثنوی کے انداز میں مسدس حالی اور مولانا شبلی کے اسی قومی مسدس میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اقبال نے شکوہ کے لیے جس بحر اور آہنگ کا استعمال کیا وہ بھی مولانا شبلی کے قومی مسدس ہی سے متعلق ہے، مولانا شبلی کی قومی نظموں میں کانپور کی مسجد کے حوالے سے لکھی جانے والی نظم اُن کی قومی دردمندی کا نمایاں اظہار ہے۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے ☆ دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خورد سال ہیں، جو چپ ہیں خود مگر ☆ بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر ☆ نیند آ گئی ہے، منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا ☆ جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا ☆ ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

(کلیاتِ شبلی اردو، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۸۲)

اس کے علاوہ شہر آشوبِ اسلام، خلافت فاروقی کا ایک واقعہ، ہمارا طرزِ حکومت، عدلِ جہانگیری، شغل تکفیر، مذہب یا سیاست جیسی نظمیں ان کے سیاسی اور ملی شعور کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہیں۔ ان نظموں کے حوالے سے کبھی کبھی یہ بات اٹھائی گئی ہے کہ ان میں محض شاعری ہے اور الفاظ تو اکٹھے کر دیے گئے ہیں لیکن زبان کا وہ رس، لوچ اور ملائمت نہیں جس کا یہی شاعری تقاضا کرتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ شبلی کی نثر نگاری کا ذکر ان کی شاعری پر غالب رہا لیکن اگر اردو شاعری میں سیاسی اور ملی رجحانات کے ارتقائی سفر کا احوال قلم بند کیا جائے تو اس میں شبلی اپنی مذکورہ بالا نظموں کے حوالے سے ایک اہم نام اور مقام رکھتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی فضا کے بعد امت مسلمہ ہندوستان میں جس ذہنی خلفشار کا شکار رہی، اس کے اندر قومی اعتماد اور وقار کے لیے ایسی نظموں کی تخلیق ضروری تھی۔ آج جب کہ اردو شاعری ایک سو سال آگے نکل آئی ہے علامہ اقبال اور دوسرے شعرا کے رچے ہوئے شعر اور علمی انداز کے سبب اظہار و بیان کے اسالیب پختہ ہو چکے ہیں۔ آج شبلی کے

شعری انداز کو Prosaic یا غیر شاعرانہ ٹھہرانا مناسب نہیں، مقصدی فن جس اسلوب کا تقاضا کرتا ہے وہ شبلی کی ان نظموں کے اندر موجود ہے۔ اس زمانے میں یہ نظمیں قارئین کو متاثر کرتی رہیں اور شبلی اس حوالے سے اپنی مقصدیت کے اظہار میں کامیاب بھی رہے۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ ان نظموں کے فن پر بھی بحث ہو سکتی ہے۔ ان میں استعمال ہونے والے لفظیات، تراکیب، تلمیحات، قرآن واحادیثِ رسول اکرمؐ کے حوالے اور خالص شعری اسلوب کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ شعری اسلوب کے حامل فن پاروں سے مراد شبلی کی نظم نگاری میں وہ ٹکڑے ہیں جو تاثیر اور اخلاص کے حوالے سے آج بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں اور جن کے اندر اظہار اور بیان کی وہ سچی کیفیات درآئی ہیں جو تخلیقی شاعری کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

شبلی کی اُردو شاعری کا تذکرہ ان کے جذباتی سرمایۂ شعر کے بغیر یقیناً ادھورا رہے گا۔ یہ حصہ شعر شبلی کی تخلیقی شاعری کا وہ جوہر ہے جس کی بنیاد میں اخلاص اور تاثیر کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان شعروں کے ساتھ ناقدین نے کم کم انصاف کیا، بعض نے شبلی کی شاعری میں ان اشعار کا ذکر گناہ سمجھا۔

بعض ناقدین نے اس مختصر مگر اہم سرمائے کے حوالے سے شبلی کے کرداری اور نفسیاتی تجزیہ کو موضوع بنایا اور شبلی کی کردارکشی کی کوشش کی۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں مولانا شبلی کے حوالے سے پروفیسر فرمان کا مضمون ایسے اشعار کی سرسری نشاندہی کا حامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک صدی گزرنے کے بعد کیا ہم اس سچے تخلیقی سرمایۂ شعر سے انصاف کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس کے تجزیے کو مولانا شبلی کی شخصیت سے الگ (Detach) کر کے اسے خالص شعری سرمایہ کے طور پر کبھی زیرِ تنقید نہیں لا سکتے؟

شبلی کی اردو شاعری کے موضوعات کم و بیش وہی ہیں جو ان کی زندگی، مقالات اور دوسری تصانیف کے موضوع ہیں یعنی اخلاقی، مذہبی، سیاسی، علمی وغیرہ۔ انھوں نے سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کے بعض واقعات کو منظوم کیا ہے۔ ان واقعات میں اسلامی آداب و اخلاق، عدل وایثار اور جرأت و صداقت کا موثر بیان ہے۔

اسی طرح سیاسی نظموں میں ایسے واقعات واحوال کا اظہار ہے جو شبلی کے زمانے میں

امت مسلمہ اور خصوصا برصغیر کے مسلمانوں کو درپیش رہے ان میں سیاسی شخصیات، جماعتیں اور ان کے مقاصد اور اطوار کے حوالے سے نظمیں ہیں۔ علمی اور تعلیمی نظموں میں علی گڑھ یونیورسٹی، ندوہ، نصاب تعلیم اور الحاق کے مسائل کے حوالے سے نظمیں ہیں۔

یہ نظمیں زیادہ تر مثنوی اور غزل کی ہیئت میں ہیں، شبلی نے اپنے مخصوص انداز مکالمہ کے ذریعے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ کئی نظموں میں سوال جواب کی اس تکنیک کو استعمال کیا، کانپور کی مسجد کے حادثے میں شہید ہونے والوں کے بارے میں بھی نظم سوال ہی سے شروع ہوتی ہے۔ صداقت نگاری کی تاثیر کے سبب یہ نظمیں ہماری قومی شاعری کا ایک اہم حصہ ہیں اور اسی حوالے سے اپنی مخصوص حیثیت کی حامل ہیں۔

شاعری جس میں ہم تجربے مستعار لیتے ہیں اور Acquir اور Borrow بھی کرتے ہیں اور جس میں شاعر کا 'میں' اس کا اپنا 'میں' نہیں ہوتا پورے معاشرے کا 'میں' بن جاتا ہے یا بن سکتا ہے، یہ امر جسے تخلیقی لغات میں Depersonalization کہا جاتا ہے، ہر زبان اور شاعر کی شاعری میں عام ملتا ہے۔

شبلی کے ان اشعار کو اس حوالے سے پڑھیں تو شاید تخلیقی شعر کے کئی سچے تجربات ومشاہدات کے دَر وا ہوں۔ ہماری تنقید کا المیہ یہ ہے کہ ہم مذہبی شخصیات کے حوالے سے کی جانے والی شاعری میں Detachment اور Depersonalization کے قائل ہی نہیں، ہمیں یہ حصہ سچا ہوتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگتا یا اچھا لگتے ہوئے بھی اس کا ذکر مناسب نہیں لگتا۔ اگر شبلی کی اردو شاعری پر گفتگو ہوگی تو یہ کیسے ممکن ہے اس حصہ شعر کو پیش نظر نہ رکھا جائے، درخور گفتگو نہ سمجھا جائے، نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ شبلی کی اردو شاعری کا یہی حصہ اخلاص اور اظہار کے اس وفور کا حامل ہے جس کے مقابلے میں ان کی دوسری شاعری کی تاثیر اور اثرات کم کم ہیں۔

مجھے یہ کہنے دیجیے کہ شبلی کی شاعری میں جذباتی حوالے سے کی جانے والی شاعری اخلاص، تاثیر، شعری علائم و رموز، گلہ شکوہ کے روایتی اسالیب، بحور، ردیفوں کی برجستگی کے حوالے سے زندہ رہنے والی تخلیقی شاعری ہے مگر اس سے حظ اٹھانے کے لئے مولانا شبلی کی ہمہ گیر علمی شخصیت کے پیچھے اس دھڑکتے ہوئے دل کی سچائی محسوس کرنا ہوگی جو یگانگت و وابستگی کے جذبے سے پھوٹتی

ہے۔ تخلیقی جوہر رکھنے والے کی ہڈیوں میں آگ سلگاتی ہے۔ اس کے اظہار کو دلآویزی سے آشنا کرتی ہے، اس کے لب ولہجہ کو نادرہ کاری کی سچائی اور اہمیت سے مہمیز دیتی ہے، لفظوں کو دوام بخشتی ہے اور اوراق پر سدا مہکنے والے گل وگلزار کھلاتی ہے۔

سلسلۂ دار المصنفین میں ۲۴ ر نمبر پر کلیات شبلی اردو شائع ہوا جس کی اشاعت کا اہتمام مولانا مسعود علی ندوی نے کیا، اس کلیات میں شبلی نعمانی کی اردو مثنوی، قصائد، مسدس، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نظموں کا مکمل مجموعہ، کی ذیلی وضاحت بھی شامل ہے، اس مجموعہ کی آخری نظم درج ذیل ہے:

عطیہ بیگم (بمبئی) کی شادی

بمبئی کی مشہور مسلمان خاتون عطیہ بیگم کی شادی ایک نومسلم یہودی نقاش ومصور سے ہوئی اس پر شاعر نے نئے نئے مضامین پیدا کر کے عطیہ بیگم کو تحفہ بھیجا۔

بزبان عطیہ بیگم

''کھینچ'' سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لیے ننگِ قرابت سے مجھے دُوری تھی
آپ ''نقاش ہیں'' اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے مجھ کو جو ''کھینچا'' تو یہ مجبوری تھی

اس قطعہ کے بعد جو کلیات شبلی اردو کے آخری صفحہ (۱۲۱) پر ہے۔ ایک شعر ہے اور وہ بھی عطیہ کے حوالے سے ہے

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

یہ اس صفحہ اور کلیات کا آخری شعر ہے، حیرت ہوتی ہے کہ ان اشعار میں ایک چار مصرعی قطعہ اور اس منفرد شعر کے علاوہ کلیات اردو میں عطیہ کے حوالے سے شبلی کی کوئی غزل، قطعہ یا شعر موجود نہیں؟

کیا کلیات کے مرتب مولانا سید سلیمان ندوی کی رسائی میں وہ مختصر مگر موثر شعری مواد موجود نہیں تھا جو شبلی نے عطیہ کے حوالے سے لکھا؟ یا اسے شعوری طور پر کلیات سے باہر رکھا گیا، اگر

اس کلیات اردو کو اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نظموں تک ہی محدود رکھنا تھا تو ان آخری تین اشعار (ایک قطعہ اور ایک شعر) کو بھی شامل نہ کیا جاتا۔ مولانا شبلی کے اردو اشعار کی جمع آوری میں مرتب کلیات کی خواہش اور کوشش کا اندازہ اس امر سے لگائیں کہ انھوں نے متفرقات کے ذیل میں (ص ۱۱۷پر) ایک قطعہ کا صرف ایک مصرع حاشیے کے ساتھ دیا ہے۔

.... ☆ ....

.... ☆ فرشتے میرے ہاتھوں سے ٹُنی لیتے جاتے ہیں

افسوس ہے کہ یہ قطعہ نہیں ملا ۱۹۱۳ء میں زمیندار یا ہمدرد میں چھپا تھا جامع اوراق کو صرف آخری مصرع یاد ہے ناظرین میں سے جن صاحب کو یہ قطعہ مل جائے اس کے بقیہ مصرع لکھ لیں اور مجھے بھی اطلاع دیں تو عین نوازش۔' (کلیات شبلی (اردو) ص ۱۱۷)

ایک طرف تو شبلی کے اردو کلام کی جمع آوری کے حوالے سے ایک ایک مصرع کی تلاش اور خواہش اور دوسری طرف سامنے بہ آسانی دستیاب ہونے والے کلام کے بارے میں دانستہ عدم توجہیں۔

بہتر ہوتا اس کلام کو بھی شامل کلیات کرلیا جاتا، یہ کلام بعض لوگوں کے لیے اچھا نہ ہو مگر سچا ضرور ہے، شبلی کی زندگی کے ایک جذباتی رُخ کا حامل۔ اس کے موضوعات اگر چہ فارسی اور اردو غزل کے عام مروّجہ مضامین ہی سے پھوٹتے ہیں مگر ان میں بین السطور جھلکنے والی دلچسپی، محبت آمیز طنز اور الفت آشنا لب ولہجہ کی مہک اتنی نمایاں ہے کہ اسے شبلی کی دوسری واقعاتی، سیاسی اور مذہبی شاعری کے لب ولہجے سے بالکل علیحدہ طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ ان اشعار میں جگ بیتی کی بجائے آپ بیتی کا جذب ہے۔ میں نے جذب کا لفظ بہت محتاط انداز میں کہا ہے، یہ اشعار اپنی نفسیاتی صداقت (Psychic Reality) میں اتنے واضح، دلآویز اور پُر تاثیر ہیں اور اپنے تخلیقی پس منظر میں ایسے محرکات رکھتے ہیں کہ انھیں کسی طرح شبلی کی شعری اور تخلیقی متاع سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

شبلی کے اردو کلیات کو مرتب کرتے ہوئے یا شبلی کی اردو شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ان کا ذکر نہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے آگرہ کی تاریخ لکھتے ہوئے تاج محل کو نظر انداز کر دیا جائے۔

☆☆☆

ادبی تحقیق کی روایت میں شبلی کی اولیات

ڈاکٹر شمس بدایونی ☆

اس عنوان پر گفتگو کرنے سے پیشتر یہ وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تحقیق مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کو محقق تسلیم نہیں کرتی، یہی نہیں بلکہ اردو کے کسی بھی بڑے محقق نے ادبی تحقیق کے ظہور وشیوع میں بھی اُن کی حصہ داری کا ہنوز اعتراف واظہار نہیں کیا ہے۔ (۱) بڑے محقق سے میری مراد صرف رجحان ساز اور روایت ساز محققین سے ہے، جن میں سر دست صرف چار پانچ نام ہی پیش کیے جا سکتے ہیں، حافظ محمود شیرانی (ف ۱۹۴۶ء) مولانا امتیاز علی خاں عرشی (ف ۱۹۸۱ء) قاضی عبدالودود (ف ۱۹۸۴ء) رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) اور پروفیسر نذیر احمد (پیدائش ۱۹۱۵ء)

عصر حاضر کے محقق رشید حسن خاں نے مولانا شبلی کی بابت لکھا ہے:

''انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ دراصل حالی وشبلی کا عہد تھا، اُس زمانے میں ادبیات کی دنیا میں ان دونوں کے اثرات شریک غالب کی حیثیت سے کارفرما رہے اور اُن کے انتقال کے کچھ دن بعد تک یہ اثرات اُسی طرح کام کرتے رہے، مولانا شبلی کی خوش مذاقی، انشا پردازی اور آگہی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے مزاج میں رومانیت کا غلبہ تھا، جس کا اثر ان کے انداز استدلال میں نمایاں ہے، بات پر اصرار اور بت گری و پرستش کا جذبہ ان کے یہاں ہمیشہ کارفرما رہا، اُن کی عبارت میں بھی ان عناصر کی جلوہ گری ہے۔ .... اُن کے یہاں تحقیقی سطح پر شک کرنے اور چھان بین کرنے کا رجحان کم تھا، مختصر یہ کہ وہ ناقد تھے، انشا پرداز تھے، خوش مذاق تھے اور اس صفت خاص میں بہت کم لوگ ان کے شریک نکلیں گے،

☆ 58، نیو آزاد پُرم کالونی، آئزٹ نگر، بریلی، یوپی

لیکن وہ 'محقق' نہیں تھے، تحقیق جس کم یقینی، غیر جذباتی انداز فکر وانداز اظہار اور صحیح معنوں میں سنگ دلی کی طلب گار ہے، یہ چیزیں ان کے حصہ میں کچھ کم آئی تھیں"۔

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ ص ۴۲)

رشید حسن خاں کے مذکورہ صدر بیان کے بعد راقم الحروف کے اختیار کردہ عنوان (ادبی تحقیق کی روایت میں شبلی کی اولیات) کی کیا کچھ بھی وقعت رہ جاتی ہے؟

یہ غور طلب ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اپنے تمام تر ذوق تحقیق، مورخانہ شعور وآگہی، مختلف علوم وفنون پر فاضلانہ دسترس، تصنیفی وتالیفی مہارت، نادر موضوعات کا انتخاب، مواد کی ترتیب وتنظیم، عالمانہ استدلال، نایاب وکمیاب مراجع ومصادر کی تلاش وشناخت، جیسی خصوصیات اور بعض صورتوں میں امتیاز رکھنے کے باوجود کیا ابتدائی دور کے محققین کی صف میں بھی جگہ پانے کے مستحق نہیں؟ اس صورت حال کی بہ ظاہر پانچ وجوہ معلوم ہوتی ہیں

۱- پہلی وجہ پروفیسر خلیق احمد نظامی (ف ۱۹۹۷ء) کے بقول یہ ہے:

"اسلامی ہندوستانی تاریخ کو مسخ کرنے کا کام جب خطرناک حدتک پہنچ گیا تو اصلاح حال کے لئے بعض مصنفین نے اپنا قدم اٹھایا، پُر فریب ذہنوں نے ان کے دلائل پر غور کرنے کے بجائے اُس سارے لٹریچر کو جوابی اور معذرت آمیز کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کردیا، اور مطالعے سے پہلے ہی اُن مصنفین کے انداز تحقیق کو مشتبہ بنادیا۔

(شبلی بحیثیت محقق معارف مارچ ۱۹۸۶ء) بہ حوالہ دار المصنفین کی تاریخ ج ۱، ص ۱۴۹)

۲- دوسری وجہ شعر العجم (۱۹۰۸ء - ۱۹۱۰ء) پر حافظ محمود شیرانی کی احتسابی تنقید کے اثرات مابعد ہیں، جس نے شبلی بظاہر تحقیق کے میدان سے باہر لا کھڑا کیا، شیرانی نے شعر العجم کی صرف دو جلدوں کی (تعداد صفحات ۳۵۶+۳۰۲=۶۵۸) کا احتساب ۶۱۰ صفحات پر کیا تھا جو پہلی بار "تنقید شعر العجم" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے شائع ہوا، اس سے پیشتر یہ احتساب انجمن کے رسالے "اردو" میں قسط وار شائع ہوتا رہا تھا، (اکتوبر ۱۹۲۲ء تا جنوری ۱۹۲۷ء) اس احتساب کا اثر یہ ہوا کہ شبلی کے معرفین بھی یہ لکھنے پر مجبور پائے گئے کہ شبلی بنیادی طور پر تحقیق کے مردِ میدان نہیں تھے، ادب میں وہ صرف نظریاتی اور عملی تنقید کے بنیاد گزاروں میں ہیں، اس معنی

میں وہ محقق نہیں جس معنی میں شیرانی نے انھیں تصور کیا، بایں سبب ان کے یہاں تحقیقی تسامحات کی تلاش بے معنی ہے، اس طرح گویا محمود شیرانی کے جملہ اعتراضات اور گرفت کو من وعن قبول کرلیا گیا، حالانکہ شعرالعجم کے جن بیانات، جس طریقۂ استدلال اور مصادر ومراجع پر شیرانی نے عموماً گرفت کی تھی، اُس سے مشابہ بیانات ومصادر اُن کی اپنی تحقیقی کتاب '' پنجاب میں اردو'' (باراول ۱۹۲۸ء) میں درآئے ہیں، جن کی گرفت رشید حسن خاں نے کی ہے، (ملاحظہ کریں، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ ص: ۶۸ تا ۷۴ انھوں نے اس کتاب کی بابت واضح الفاظ میں لکھا ہے:

> یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب نے اس کتاب میں غیر معتبر حوالوں کو بھی بلاتکلف قبول کرلیا ہے، بیاضوں اور موخر تصانیف کی بنیاد پر جس کلام کا انتساب درست سمجھا گیا ہے، تحقیق کے نقطۂ نظر سے وہ نادرست ہے، شیرانی صاحب نے تو پنجاب میں اردو کا مولد ثابت کرنا چاہا تھا اور اس کے لئے انھوں نے ہر طرح کے ماخذ سے کام لیا، یہ انداز تحقیقی کم اور جذباتی زیادہ تھا۔ (حوالہ سابق ص ۲۹۴)

ادب میں شبلی کی تحقیقات پر عدم توجہ کی بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ شبلی کو سرسید کے حریف کے طور پر پیش کیا جانے لگا، اس سلسلے میں مولوی عبدالحق (ف ۱۹۶۱ء) محمد امین زبیری (ف ۱۹۵۸ء) شیخ محمد اکرام (ف ۱۹۷۳ء) ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ نے شبلی کی علمی عظمت کو مشتبہ بنانے اور ان کی عالمانہ شخصیت کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھارکھی اور یہ سلسلہ ادبی حدود سے تجاوز کر کے کردار کشی تک جا پہنچا، ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

> '' ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون (مراد تنقید شعرالعجم) مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا تھا، مولوی صاحب کا علامہ شبلی سے دل صاف نہیں تھا، اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مولوی صاحب سرسید اور حالی کے زبردست حامی بلکہ عاشق تھے، اس کے برعکس شبلی کو سرسید اور حالی دونوں سے بعض معاملات میں اختلاف تھا، سرسید سے یہ اختلاف زیادہ تھا، مولوی عبدالحق نے شبلی پر مضمون لکھ کر (لکھوا کر) چھاپنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان پر ایک ایسا الزام بھی لگایا جس سے آج تک علامہ کو برءت حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ (حرف آغاز مشمولہ شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں ص ۷)

خود مولوی عبدالحق نے خطوطِ شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے:

مولوی شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے، زمانہ کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے، مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے، ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں، اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گے۔ (خطوطِ شبلی ص: ۳۶)

۲۶-۱۹۲۵ء کا یہ بیان کس قدر غیر ذمہ دارانہ ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں، اسی طرح کی کوششوں نے سرسید و شبلی کے معتقدین کے درمیان ایک مستقل کشمکش کی بنیاد رکھ دی، حالی و شبلی کے بعد اس عہد پر سب سے طاقتور اثر مولوی عبدالحق کا تھا، ان اثرات سے شبلی کی علمی مقبولیت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچنا تھا سو پہنچا۔

۳- تیسری وجہ شبلی کی جانب اردو کے بلند پایہ محققین کا ملتفت نہ ہونا ہے، غالب و اقبال، سرسید و پریم چند کی طرح شبلی کو اردو تحقیق میں ایک مستقل موضوع کی صورت میں ابھی قبول نہیں کیا گیا ہے۔ یونیورسٹیز میں لکھے جانے والے علمی مقالوں اور دارالمصنفین کے رفقا کی علمی تحریروں کے علاوہ بلند پایہ اور نام ور محققین کی کتب تو کجا مضامین بھی ان پر نہ ہونے کے برابر ہیں، جب کہ شبلی سے کم تر درجے کے ادیبوں و شاعروں پر ہمارے محققین نے قلم فرسائی کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ (۲)

۴- چوتھی وجہ یہ ہے کہ ادبی تحقیق کی تقریباً ایک صدی پر مشتمل روایت کا سلسلہ وار تاریخی مطالعہ و جائزہ ابھی تک نہیں لیا جا سکا ہے، اس صورت میں یہ کس طرح طے پائے کہ تحقیق کی گذشتہ ایک صدی کتنے ادوار پر مشتمل تھی؟ کس دور کے مصنفین کے تحقیقی رجحانات کیا تھے؟ تحقیق کے کون سے اصول کس دور میں رائج ہوئے؟ کس دور کے مصنف کا تصور تحقیق کیا تھا؟ اور اس کی تصانیف میں تحقیق کے کون سے عناصر کام کر رہے تھے؟ کن اصولوں کو اس نے کب اور کیوں اختیار کیا تھا؟ یہ اصول علم کی کس شاخ، کس شعبے سے اخذ کیے گئے؟ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات ہنوز تشنۂ مطالعہ ہیں۔

۵- پانچویں وجہ جو میرے نزدیک سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ شبلی کے علمی کام کو ان

کے اپنے عہد کی علمی و تحقیقی روایت کے تناظر میں نہیں دیکھا گیا، ہم دور حاضر کے دریچوں سے ماضی کا منظر نامہ دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمیں سو برس پرانے کاموں میں تحقیق و تفحص کی جگہ، رومان و پرستش کی کار فرمائی نظر آتی ہے، ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہر عہد کے اپنے فکری و فنی انداز و اطوار، تقاضے اور حدود ہوتی ہیں، اُس کا اپنا مزاج، ماحول، اقدار اور روایت ہوتی ہے، اس کے اپنے معلوم ماخذات اوران سے استفادے کے طریقے ہوتے ہیں، اُس کا اپنا ذہنی معیار اور طلب ہوتی ہے، کیا شبلی کی تحقیقات کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھا گیا؟ ''تنقید شعر العجم'' اور اسی نوعیت کی دوسری تحریروں کو دیکھنے کے بعد اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ شبلی کی تحقیقات کا کہیں موخر ماخذات اور کہیں تحقیق کے موخر اصولوں کی بنیاد پر رد کیا گیا، پروفیسر نذیر احمد نے اپنی کتاب 'حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعہ کے پیش لفظ میں قدرے احتیاط کے ساتھ لکھا ہے:

محقق یا مورخ کے پیش نظر جو ماخذ نہ ہوں اور اگر چہ ان ماخذ کی روشنی میں ان کے نتائج ناقص ہوں، تو اُس سے مورخ و محقق پر اعتراض لازم نہیں آتا، ہمارے محققین اکثر اس نکتہ سے غفلت برتتے ہیں، شیرانی صاحب کی تحریروں میں بعض جگہ ہمیں یہ نقص نظر آتا ہے، اگر یہ نکتہ پیش نظر ہو تو تحقیق میں جو تلخی پیدا ہو جاتی ہے، وہ ختم ہو جائے۔ (ص ۷)

بیسویں صدی کے نصف دوم میں فن تحقیق کو ادب میں پذیرائی حاصل ہوئی، اب تک کی معلومات کے مطابق فن تحقیق پر پہلی کتاب ۱۹۶۸ء میں بمبئی سے باسم 'مبادیات تحقیق' شائع ہوئی تھی، جس کے مصنف عبدالرزاق قریشی (ف ۱۹۷۷ء) تھے۔ لیکن ماہنامہ آج کل دہلی کے تحقیق نمبر (اگست ۱۹۶۷ء) کو ادبی تحقیق کے فن کو مدون و مشتہر کرنے کا نقطۂ آغاز مانا جاسکتا ہے، مبادیات تحقیق (۱۹۶۸ء) سے تحقیق شناسی (۲۰۰۳ء) تک تقریباً دو درجن کتب ادبی تحقیق اور تدوین کے فن پر مرتب وشائع ہو چکی ہیں لیکن اکثر کا تعلق پی ایچ ڈی کے لئے لکھے جانے والے علمی مقالوں سے ہے، ان میں قابل ذکر کتب کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہیں، دوسری زبانوں کے بالمقابل اردو کے جن محققین کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں، وہ بھی چھ یا سات سے زیادہ نہیں، مثلاً حافظ محمود شیرانی (اردو تحقیق کے معلم اول) مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر حنیف نقوی وغیرہ، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیا محمود شیرانی

سے قبل اردو تحقیق کا رجحان بالکل مفقود تھا؟ یا تنقید کی طرح اُس کے نقوش بھی علمی و ادبی کتابوں میں موجود تھے، کیا تحقیق صرف مذہبی اور تاریخی کتب تک محدود تھی؟ کیا مذہبی تاریخی اور سوانحی تحقیقات ادبی تحقیق کے زمرے میں نہیں آتیں؟ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ تحقیق بجائے خود ایک عمل ہے، جس کا ظہور تاریخ میں بھی ہو سکتا ہے اور سوانح میں بھی، مذہبی علوم بھی اس کے دائرہ کار میں آسکتے ہیں اور زبان و لغت بھی، تنقید میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے اور کسی کتاب کی ترتیب و تدوین میں بھی، تحقیق حقائق و معلومات کو کچھ اصولوں اور ضابطوں کی روشنی میں پرکھ کر پیش کرتی ہے اور ان نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جو کسی شخصیت یا فن پارے کی افادیت کو حقیقت واقعہ کی بنیاد پر مستحکم کرتے ہیں اور علمی و ادبی روایت کے دھارے سے جوڑتے ہیں، اسی سلسلے کی دوسری بات یہ ہے کہ اردو میں تحقیق کو ایک باقاعدہ اور علاحدہ فن کے طور پر قبول کرنے کا رجحان مغرب سے لیا گیا اور آج اس نے ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت حاصل کر لی ہے، لیکن تحقیق کے نقوش ہمارے مذہبی علوم میں پہلے سے موجود تھے، خصوصاً حدیث اور فن اسماء الرجال میں تحقیق کے بغیر دو قدم بھی آگے نہیں بڑھا جا سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ تحقیق کی بعض اصطلاحات دراصل حدیث و رجال ہی کی اصطلاحات ہیں، اس صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ شبلی تحقیق کے عمل سے ناواقفِ محض ہوں، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمدن و ترقی کے دور میں جو چیزیں علم و فن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ان کا ہیولیٰ بقول مولانا شبلی:

> "پہلے سے موجود ہوتا ہے، اور تمدن کے زمانے میں وہ ایک موزوں قالب اختیار کر لیتا ہے اور پھر ایک خاص نام یا لقب سے مشہور ہو جاتا ہے۔ (الفاروق ص۲)

تحقیق اور اصول تحقیق کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، سرسید و شبلی کے عہد میں ان کی حیثیت ایک ہیولے کی سی تھی لیکن بعد میں جب ان اصولوں کو ایک خاص شکل میں ترتیب دیا گیا تو اس کا نام تحقیق پڑ گیا۔

مولانا شبلی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تصنیفی عمل میں استدلال اور اثبات مدعا کے لئے تحقیق کے کچھ ایسے اصولوں اور ضابطوں سے کام لیا جو اس عہد کے کسی دوسرے مصنف کے یہاں تواتر و اہتمام کے ساتھ نظر نہیں آتے، یہ اصول و ضابطے ہی آج ادبی تحقیق کی اولین روایت

قرار دیے جاسکتے ہیں، تاریخی طور پر ان میں سے بعض شبلی کی اولیات ہیں، سطور ذیل میں ان پر اجمالاً روشنی ڈالی جارہی ہے۔

ماخذ و مواد کی تلاش و تفتیش

ہر مصنف کتاب کی تصنیف سے پیشتر متعلقہ ماخذ و مواد جمع کرتا ہے، اس کے بعد قلم اٹھاتا ہے، لیکن شبلی نے اس سلسلے میں یہ پیش قدمی کی (باستثنائے سرسید احمد خاں) کہ عربی و فارسی کے علاوہ دوسری غیر ملکی زبانوں کے علمی کام کو بھی ترجیحاً پیش نظر رکھا یا کم از کم اس سے واقفیت حاصل کی، مواد و ماخذ کی تلاش میں علمی سفر کیے، ملکی اور غیر ملکی کتب خانوں کی خاک چھانی، ارباب علم کے ذاتی ذخیروں کی چھان بین کی، علمی استفادے کے لئے دوسری غیر ملکی زبانیں سیکھیں، (۳) عالم اسلام اور یورپ میں شائع ہونے والی ہر نئی کتاب کو حاصل کیا، مواد کی تلاش اگر مکمل نہ ہوسکی تو اپنے تصنیفی کام کو موخر کردیا، اس سلسلے میں ان کی اپنی تحریروں سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، ''سیرت النعمان'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> 'المامون' کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اس تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر آنہیں چکیں۔ (ص:۳)

'سیرۃ النعمان' ہی کے دیباچہ میں عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں امام ابوحنیفہؒ کی سوانح پر ۲۷ کتب کی فہرست دی ہے، حاشیہ میں لکھا ہے:

> ''روم و مصر کے سفر میں مذکورہ بالا فہرست کی اکثر کتابیں میری نظر سے گزریں لیکن مہتم بالشان اور مفید معلومات کے لحاظ سے کوئی کتاب ایسی نہ نکلی جس سے میری ناچیز تالیف میں معقول اضافہ ہوسکتا۔ (ص:۱۰)

سفرنامہ روم و مصر و شام میں ایک سرخی ہے 'کتب خانہ خدیویہ' اس سرخی کے تحت کتب خانہ

کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے عربی زبان کے ۳۲ علوم پر مشتمل کتب کی موضوع وار تعداد دی ہے جس کی میزان ۱۴۷۰۵ ہے (ص ۱۷۸) بعد میں تفسیر، حدیث، تاریخ اور ادب میں نادر و نایاب کتابوں کی کتب خانہ میں موجودگی سے مطلع کیا ہے اور کتب کے نام تحریر کئے ہیں، اسی سفرنامہ میں لکھا ہے:

''اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلیم و تعلم کا چرچا ہے وہ ہندوستان، عرب، مصر، شام بلادِ مغرب، فارس و ایران ہیں، ان میں سے اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو نہیں دیکھا ہے وہ ایسے قوی وسائل سے معلوم ہے کہ دیکھنے کے برابر ہے۔ (ص:۷۷)

مکاتیب میں نادر و نایاب کتب، مخطوطات وغیرہ کا کثرت سے ذکر آیا ہے، صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہو سکتی ہیں نہ حافظہ ان کے لئے کافی ہی ہے، ہر روز دو تین میل پیادہ سیر کرتا ہوں، کیوں کہ کتب خانے دور دور واقع ہوئے ہیں..... ترکی پڑھنی میں نے شروع تو کی ہے، دیکھئے پوری بھی کر سکتا ہوں یا نہیں۔ (خط نمبر ۲ بنام شیخ حبیب اللہ، مکاتیب شبلی ج ا ص ۱۲)

مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ ہو گیا ہوں، علمی زمین نے اپنے خزانے اُگل دیئے ہیں، کیا کہوں اپنے علما کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔ (خط نمبر ۳۲، بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی مکاتیب ج ا، ص ۱۳۲)

ہاں مرزا کامران کا دیوان، اکبری کتب خانہ کا نہایت مستند دیکھا، شاہجہاں اور جہاں گیر کے خاص ہاتھ کی تحریر ہے، میں نے فوٹو لیا اور متعدد کاپیاں کرائیں کہ اور شوقینوں کے بھی کام آئے۔ (خط نمبر ۶۰، بنام شروانی ج ا، ص ۱۵۹)

اعجاز خسروی کا ایک عجیب و غریب نسخہ ہاتھ آیا، امیر کی وفات کے دس برس بعد کا لکھا ہوا ہے، نہایت صحیح اور سرتا پا محشی ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ لفظی رعایت میں ایک لفظ کے کئی

ٹکڑے میں بھی کوئی رعایت ہے تو اس قدر ٹکڑا سرخ لکھا ہے، مثلاً باغ کی رعایت میں 'بو' کا لفظ آ گیا ہے تو 'بو' کو سرخ لکھا ہے، تمام کتاب میں یہ التزام ہے، اس قدر دیدہ ریزی شاید خود مصنف نے کی ہو۔ (خط نمبر ۸۹، بنام شروانی ج ۱، ص ۱۸۹)

سیرت کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں دیکھنی ہیں، انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں، ان سے کذب و افترا کا عجیب منظر سامنے آ جاتا ہے۔ (خط نمبر ۱۰۲، بنام شروانی ج ۱، ص ۲۰۰)

آج وہ حمائل لے لی، دو سو پچاس نذرانے کے دیئے، کل ۴۲ برس کا ہے، تاہم ایک چیز ہے ایران کا خاتم الخطاطین احمد تبریزی تھا، آغا خاں اول کے بھائی نے اس کو ایران سے بلوا کر لکھوایا تھا، اول سے آخر تک مطلا ہے، یعنی ہر سطر پر طلائی ٹکڑے ہیں، اور تقطیع نہایت موزوں ہے۔ (خط نمبر ۱۱۷، بنام شروانی ج ۱، ص ۲۱۱)

شبلی کے معاصر خواجہ غلام الثقلین (ف ۱۹۱۵ء) کا حسب ذیل بیان اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ مواد کی تلاش و تفتیش میں کس قدر حساس تھے، وہ لکھتے ہیں:

شکستہ پا مصنف ایک ایک واقعے کی چھان بین کے لئے کبھی لکھنؤ ہوتا تھا اور کبھی کلکتے کے لئے بادیہ پیما، کبھی مطبوعات جدیدہ کی کھوج میں بمبئی پہنچتا تھا اور معاً کتب قدیمہ کی تلاش میں کبھی مشرق میں بانکی پور اور کبھی حیدر آباد کا رخ کرتا تھا، ضعیف البصر مصنف ایک بوریئے پر اس طرح آرام کرتا تھا کہ داہنے بائیں، سرہانے یا پائینتی کتابوں کا انبار ہوتا تھا، بوسیدہ اور کرم خوردہ اوراق اس کے ہاتھ میں ہوتے تھے، صبح کے دھندلے نور سے شام کی تاریک روشنی تک پائے نگاہ اوراق کہنہ کے سینکڑوں میل کا روزانہ سفر طے کرتے تھے اور پھر نہیں تھکتے تھے۔ (کسوف الشمس ص ۳۵)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی جو شبلیات کے ماہر کے طور پر پہچان بنا رہے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب میں شبلی کے اس وصف کا متعدد جگہ ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

مولانا نے مقدمہ ہی میں ''یورپین تصنیفات'' کا عنوان قائم کر کے .... اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق اہل مغرب کے عہد بہ عہد افکار و خیالات پر روشنی ڈالی ہے

........اس ضمن میں مولانا نے مستشرقین کی اُن کتابوں کی فہرست بھی پیش کی ہے، جن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''ان میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔'' راقم عرض کرتا ہے کہ یہ ۳۷ کتابیں ہیں، ان کا زمانہ تصنیف ۱۸۱۵ء سے ۱۹۰۹ء تک کے عرصے کو محیط ہے، ان کے مصنفین میں ۱۶ کی وطنی نسبت انگلستان سے ہے سات کی جرمنی سے، سات ہی کی فرانس سے ۲ کی ہالینڈ سے، ایک کا وطن اٹلی ہے اور ایک کی وطنی نسبت مذکور نہیں۔ (مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار ص، ۴۷)

یہ حقیقت ہے کہ اگر شبلی کی جملہ تصانیف و مقالات کے مصادر و ماخذات کی فہرست سازی کی جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے درست لکھا ہے:

شبلی کی شخصیت میں ذوق تحقیق، اور ذوق جمال، کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ان کی علمی زندگی کے یہ بنیادی محرکات تھے، ان کا ذوق تحقیق ماخذ کی تلاش میں ان کو سرگرداں رکھتا تھا، وہ عربی، فارسی انگریزی، فرانسیسی، جرمن ہر زبان کی علمی کوششوں سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے، یورپین زبانوں کے لٹریچر سے واقفیت نہ صرف اس لئے ضروری تھی کہ مستشرقین کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے بلکہ اس لئے بھی کہ جدید انداز تحقیق سے پوری طرح آگاہی ہو سکے۔ (فکر و نظر، شبلی نمبر ص ۱۰۵)

حوالوں کا فٹ نوٹ میں اندراج

شبلی سے پیشتر کے مصنفین اور شبلی کے معاصرین جب کسی کتاب کا حوالہ دیتے تھے تو کتاب اور اس کے مصنف کے نام کے اندراج کو کافی سمجھتے تھے، یہ حوالہ بھی متن کا حصہ ہوتا تھا۔ شبلی نے حوالوں کا اندراج فٹ نوٹ میں کیا، جلد نمبر اور صفحہ نمبر لکھنے کا بھی اہتمام کیا، مقام اشاعت سے بھی مطلع کیا، دیباچوں میں اہم ماخذات کی فہرست اور طریقۂ ترتیب پر بھی روشنی ڈالی، اگر چہ حوالہ نویسی کے جدید طریقوں کے مطابق شبلی کے حوالوں میں جہاں تہاں کچھ کھانچے نظر آتے ہیں، لیکن ان کے اپنے عہد میں جب حوالوں کو درج کرنے اور اہتمام کے ساتھ ان سے مطلع کرنے کا رواج ہی نہیں تھا شبلی نے اپنی تصانیف و مقالات میں اس کا التزام کیا، مثال میں ان کی تصانیف کے قدیم

ایڈیشن دیکھے جاسکتے ہیں۔

راوی اور روایت

ادبی تحقیق کا یہ بنیادی مسئلہ ہے کہ راوی یا روایت کی حیثیت کیا ہے؟ معتبر، نامعتبر، یا مشکوک اسی پر مصنف کے استدلال اور اس کے نتائج کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر راوی یا روایت مشکوک ہے تو مصنف کے استدلال اور بیانات کو غیر اطمینان بخش اور ردو قبول کے درمیان معلق تصور کیا جائے گا اور اگر نامعتبر ہے تو استدلال اور نتائج کو سرے سے رد کردیا جائے گا۔

شبلی نے اپنی تلاش وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے دوران بڑی حد تک مذکورہ امور پر غور کیا ہے، ان کے عہد میں چوں کہ فن تحقیق کے اصول وضع نہیں ہوئے تھے اور نہ عملی تحقیق کا اردو میں کوئی نمونہ ہی موجود تھا جس سے اصول تحقیق کے اطلاق کی جہت طے کی جاسکے، لے دے کے سرسید اور حالی کے نمونے تھے جن سے کچھ کچھ روشنی حاصل کی جاسکتی تھی باقی سناٹا، لہٰذا انھوں نے خود ہی اپنی تحقیقات کا نظام مرتب کیا اور اپنی تصنیفات پر اس کا اطلاق کر کے عمل تحقیق کے ابتدائی انداز واسلوب کو متعارف کرایا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

> انھوں نے مغرب کے اُن اصولوں کو قبول کیا جو اس تحقیقی میدان میں رہبر و رہنما کا کام انجام دے سکتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اصول اسناد اور اسماء الرجال کی اس طرح تشریح کی کہ جدید تحقیقات کے اصول اس کے دامن میں سما گئے۔ (فکر ونظر، شبلی نمبر، ص ۱۱)

لہٰذا ان کی تحقیقات کو آج کے اصول تحقیق اور معیار پر پرکھنا ایک طفلانہ بھول ہوگی۔

شبلی کے موضوعات کا دائرہ وسیع تھا، مذہب، تاریخ، ادب، فلسفہ، کلام، نصاب ونظام تعلیم وغیرہ۔ ان میں بیشتر کا تعلق، واقعات اور روایت سے تھا، واقعات منتشر اور متضاد روایتیں بہ کثرت مگر ہم نفس مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف، ان میں اول صحت، دوم تطبیق پیدا کرنا اور سلسلہ وار ان کو ایک لڑی میں پرونا ایک دشوار گزار مرحلہ تھا، یہ مرحلہ راویوں کو پرکھے اور روایتوں پر نقد وجرح کیے بغیر طے کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا شبلی نے اپنی بساط بھر راویوں کو پرکھا اور روایتوں کی تنقیح کی، انھوں نے 'الفاروق' کے حصہ اول کی تمہید میں 'واقعات کی صحت کا معیار' عنوان

سے لکھا ہے:

''واقعات کے جانچنے کے صرف دو طریقے ہیں، روایت و درایت، روایت سے یہ مراد ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کے ذریعے بیان کیا جائے جو خود اس واقعے میں موجود تھا یا اس سے لے اگر اخیر راوی تک روایت کا سلسلہ متصل بیان کیا جائے، اس کے ساتھ تمام راویوں کی نسبت تحقیق کیا جائے کہ وہ صحیح الروایہ اور ضابطہ تھے یا نہیں۔

درایت سے یہ مراد ہے کہ اصول عقلی سے واقعہ کی تنقید کی جائے۔ (ص: ۱۱-۱۲)

دِرایت کے جن اصولوں کو انھوں نے اس کتاب میں اپنے لئے منتخب کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

۱- واقعہ مذکورہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲-اس زمانہ میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳- واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں۔

۴- اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں اس کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

۵- راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

۶- اس بات کا اندازہ کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیئے ہیں۔ (الفاروق ص ۱۵-۱۴)

تحقیق کے مرحلے میں انھوں نے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کو بھی تلاش کیا اور نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کے معیار پر بھی نظر رکھی، روایت کو دِرایت کی کسوٹی پر بھی پرکھا اور روایت میں قیاس کی حیثیت پر بھی توجہ دی۔

مقدمہ سیرۃ النبی کو اگر ملاحظہ کیا جائے تو ان کی تحقیقات کے بعض اصولوں سے واقف ہوا

جا سکتا ہے، سید سلیمان ندوی نے مقدمہ کے آخر میں سیرۃ النبیؐ میں اختیار کردہ طور تحقیق کو ''نتائج مباحث مذکورہ'' کے عنوان سے ۱۰ ارشقوں میں درج کیا ہے، جن میں مولانا کے اختیار کردہ اصول تحقیق بھی آ گئے ہیں۔

علمی تحقیق کے ساتھ ساتھ شبلی کا ہدف مستشرقین کا رد بھی تھا، اس لئے ان کے دلائل واستناد کی نوعیت نفس مضمون کے لحاظ سے بدلتی رہتی تھی، مثلاً سیرۃ النبی، الجزیہ، حقوق الزوجین، الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی اور کتب اسکندریہ میں وہ روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے پر زیادہ زور دیتے ہیں، لیکن سوانحات میں وہ درایت سے بہت زیادہ کام نہیں لیتے، بعض جگہ وہ اپنے ممدوح کے فضائل میں کمتر درجے کی روایتیں بھی قبول کر لیتے ہیں لیکن اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔

تحقیق کے بنیادی طور پر دو مرحلے ہیں، انکشافِ حقائق اور استخراجِ نتائج، شبلی دونوں سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بعض مقامات پر انھوں نے اپنے اصل موضوع کو پیش نظر رکھا اور اس سے متعلق ضمنی مسائل پر جم کر تحقیق نہیں کی، بعض اختلافی مسائل میں بھی انھوں نے فیصلہ کن رائے دینے سے اجتناب کیا، سنین کے اندراجات کے اختلافات تو درج کر دیے لیکن محاکمہ کرنے سے احتراز کیا اور مرجح صورت وحیثیت سے مطلع نہیں کیا، لیکن اس طرح کی فروگذاشتیں ضمنی مسائل میں ہیں نفس مضمون میں نہیں۔

مختصر یہ کہ راوی اور روایت کی صحت جو آج ادبی تحقیق کا ایک اہم سوال بن چکی ہے، اردو ادب میں پہلی مرتبہ شبلی ہی نے اسے موضوع گفتگو بنایا اور اپنی تصنیفات کے دوران اس پر سوالات قائم کیے۔

تحقیق منسوبات (۴)

منسوبات ایک جدید تحقیقی اصطلاح ہے، جس کے تحت مجہول ومجعول کتب سے متعلق بحث کی جاتی ہے، اس اصطلاح کے تحت شعرا کے مخلوط کلام، جعل، سرقہ، الحاق، التباس، انتحال اور اسی نوعیت کے دوسرے اشکالات وتسامحات کو کوئی منہاج اور اصول طے کر کے رفع کیا جاتا ہے، اس فن کے علماء میں مقدار ومعیار کے لحاظ سے محمود شیرانی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور پروفیسر نذیر احمد کے نام ممتاز

ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ شبلی کو اس میدان میں بھی فضیلت تقدم حاصل ہے، شبلی نے الغزالی (۱۹۰۲ء) میں امام غزالیؒ سے منسوب چار کتب کے انتساب کا ''امام غزالی کی بحوث فیہ تصنیفات'' کے عنوان سے اجمالی جائزہ لیا ہے، رجال و تاریخ کی کتب میں ان چاروں کتابوں کو امام صاحب کی تصانیف میں شمار کیا گیا ہے، لیکن شبلی نے ان تصانیف کے مضامین کو امام صاحب کے معتقدات، نظریات اور منصب و حیثیت سے بعید خیال کرتے ہوئے ان پر تعریض کی اور داخلی شہادتوں کی بنیاد پر کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی، اس طرح کی منسوب کتب اور ان سے متعلق مسائل کو شبلی کس طرح حل کرتے تھے، ذیل کی مثال سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> سر العالمین: ہمارے نزدیک یہ کتاب بے شبہ جعلی ہے، اس کی طرز عبارت اور انداز تحریر امام صاحب کے طریقہ تحریر سے بالکل الگ ہے، جعل بنانے والے نے ایک چالاکی یہ کی ہے کہ جابجا امام الحرمین کی استاذی کا ذکر کیا ہے اور اپنی دانست میں اس کتاب کو اصلی ثابت کرنے کی یہ بڑی تدبیر خیال کی، لیکن صرف یہی ایک امر کتاب کے جعلی ہونے کی کافی دلیل ہے، امام صاحب کی یہ خاص عادت ہے کہ وہ اپنے ساتذہ اور شیوخ کا مطلق ذکر نہیں کرتے، ان کی تصنیفات میں بہت سے ایسے مواقع ہیں جہاں استاذ یا شیخ کا ذکر کرنا ضروری تھا، لیکن وہ بالکل پہلو بچا جاتے ہیں اور تصریح کا کیا ذکر کنایہ تک نہیں کرتے منقذ من الضلال میں نہایت ضروری موقع پر صرف اس قدر کہہ کر رہ گئے کہ شیوخ سے جس طرح میں نے تعلیم پائی ہے، اس کے مطابق مراقبے اور مجاہدے میں مشغول ہوا۔
>
> (الغزالی ص: ۴۴)

تدوین متن

اردو میں عالمانہ تدوین کی عمر بہت مختصر ہے، اس کی باقاعدہ ابتدا محمود شیرانی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کی، بعد میں دوسرے محققین نے بھی تدوین متن کے کام کیے، آج تدوین کا فن اردو میں تحقیق کی ایک شاخ کے طور پر متعارف ہے اور موجودہ دور میں اس فن کے سب سے بڑے عالم، رشید حسن خاں (ف ۲۰۰۶ء) اور پروفیسر نذیر احمد شمار کیے گئے ہیں، قابل ذکر بات یہ

ہے کہ تاریخی طور پر اس میدان میں بھی تقدم کی فضیلت شبلی ہی کو حاصل ہے، اگر چہ تدوین متن کے سلسلے میں اولین روایت کے طور پر سرسید احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) کی مرتبہ کتب آئین اکبری (طبع اول ۱۸۵۶ء) تاریخ فیروز شاہی (اول ۱۸۶۲ء) تزک جہاں گیری (اول ۱۸۶۴ء) کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن ان تینوں کا تعلق فارسی زبان سے ہے، اب تک کی دریافت کے مطابق اردو زبان میں تدوین کی اولین روایت شبلی کا مرتبہ تذکرہ "گلشن ہند" ہے۔

گلشن ہند شعرائے اردو کا قدیم تذکرہ ہے جو علی ابراہیم خان کے فارسی تذکرے گلزار ابراہیم (سال تالیف ۱۷۸۴ء) کا اردو ترجمہ ہے، اسے مرزا علی لطف (ف ۱۸۲۲ء) نے جان گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں اردو میں تالیف کیا، یہ صرف ترجمہ نہیں بلکہ حذف واضافہ معلومات کے لحاظ سے ایک علاحدہ تذکرے کی صورت اختیار کر گیا ہے، گلزار ابراہیم میں شامل ۳۲۰ شعراء میں سے اس میں صرف ۶۸ شعراء کو شامل کیا گیا ہے، لطف کا اپنا ترجمہ بھی شامل ہے، اس طور گلشن ہند میں شامل شعراء کی تعداد ۶۹ ہو گئی ہے۔

۱۳۲۰ھ/۳-۱۹۰۲ء میں حیدر آباد کی موسیٰ ندی کی طغیانی میں بہتا ہوا گلشن ہند کا قلمی نسخہ مولوی غلام محمد مددگار ریگینٹ کونسل دولت آصفیہ کی ملکیت میں آیا، انھوں نے اسے شبلی کی خدمت میں پیش کر دیا اور بقول عبد اللہ خاں:

> علامہ موصوف نے اس کو بدرجہ غایت پسند کیا اور انجمن اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا، لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی، اور علامہ موصوف نے ہم کو اس کے شائع کرنے کی رائے دی، اور خود اس کے ایڈٹ کرنے کا وعدہ کیا، چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی اور اس پر کچھ نوٹ بھی لگایا ہے جو بجنسہ چھاپ دیئے گئے ہیں۔ (پبلشر کی التماس مکتوبہ ۱۶/نومبر ۱۹۰۶ء)

اس وقت شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے، (۵) (۴/نومبر ۱۹۰۳ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء) انجمن اپنے محدود وسائل کے سبب اسے شائع نہ کر سکی، بعد میں عبد اللہ خاں ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد نے ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے چھپوا کر حیدر آباد سے مع دیباچہ لطف و مقدمہ مولوی عبد الحق اسے شائع کر دیا، تذکرے پر شبلی کی کوئی تعارفی تحریر نہیں ہے، پروفیسر نثار احمد فاروقی

(تلاش غالب ص:۲۹۶) اور رفاقت علی شاہد (تحقیق شناسی ص:۱۵) نے تذکرے پر شبلی کے مقدمے کی اطلاع دی ہے جو غلط ہے

گلشن ہند تذکرے کا دوسرا ایڈیشن محی الدین قادری زور (ف ۱۹۶۲ء) نے مرتب کیا، انھوں نے گلزار ابراہیم اور گلشن ہند بر تذکرہ گلزار ابراہیم اور بدون دیباچہ لطف بر گلشن ہند، ۱۹۳۴ء میں مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوا، اس کے شروع میں طبع اول پر شامل عبداللہ خاں کی تحریر بہ عنوان ''پبلشر کی التماس'' کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (مکتوبہ ۱۶ر نومبر ۱۹۰۶ء) لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس پر سرورق طبع اول کا چسپاں ہے، جس سے بادی النظر میں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ طبع اول ہی ہے، بعض قلم کاروں کو تسامح بھی ہوا ہے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے رسالہ نگار کراچی (مئی، جون ۱۹۶۴ء) کے ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' میں لکھا ہے:

> گلزار ابراہیم کو ۱۹۰۶ء میں گلشن ہند کے ساتھ عبداللہ خاں نے حیدآباد دکن سے شائع کیا، اس میں مولوی عبدالحق اور محی الدین قادری زور دونوں کے مقدمات شامل ہیں، مولوی صاحب کا مقدمہ گلشن ہند میں اور زور کا مقدمہ گلزار ابراہیم پر ہے، یہ تذکرہ دراصل زور کا مرتب کیا ہوا ہے، اس میں انھوں نے گلشن ہند اور گلزار ابراہیم دونوں کی عبارتیں درج کردی ہیں اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے، اسے واضح کردیا ہے۔ (نگار، تذکروں کا تذکرہ نمبر ص ۷۳)

ص:۱۸۰ دراصل طبع دوم پر دو سرورق استعمال کیے گئے تھے، ایک سرورق پر پتنگی کاغذ پر چسپاں کیا گیا تھا، جس پر مرتب کی حیثیت سے سید محی الدین قادری زور کا نام درج تھا، اور دوسرا سرورق طبع اول کے مطابق تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتنگی کاغذ کا سرورق کمزور ہونے کے سبب ضائع ہوگیا اور طبع اول کا سرورق باقی رہا جو تسامح کا سبب بنا۔ راقم الحروف نے طبع اول دوم دونوں نسخوں کو دیکھا ہے، سطور آئندہ میں طبع اول ہی سے گفتگو کی جائے گی۔

شبلی کے مرتبہ گلشن ہند پر تفصیلی مضمون محمد الیاس الاعظمی صاحب نے لکھا ہے، اس مضمون میں انھوں نے تصحیح متن و تحشیہ نگاری کے سلسلے میں شبلی کی کاوشوں کا جائزہ لیا ہے، اور کثرت سے مثالیں درج کی ہیں، انھوں نے لکھا ہے:

''گلشن ہند کی تصحیح وتدوین میں علامہ شبلی نے کن اصولوں کو پیش نظر رکھا تھا اس کی انھوں نے کہیں وضاحت نہیں کی ہے، البتہ ان کے قلم سے جو حواشی ووضاحتی نوٹ ہیں ان سے طریقہ تصحیح وتدوین کا اندازہ کسی قدر ضرور ہوتا ہے، اور اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ہی تحقیق وتدوین کے اصولوں سے بڑی حد تک کام لیا ہے، انھوں نے اصل سے (تحقیق ومراجعت بھی کی ہے اور (۲) وضاحتی وتشریحی نوٹ بھی لکھے ہیں (۳) بعض اضافے بھی کیے ہیں (۴) املا کی تصحیح بھی کی ہے اس کے علاوہ (۵) مفید علمی وتنقیدی حواشی لکھے ہیں، ان ہی پانچ بنیادی امور سے تذکرہ گلشن ہند مزین ہوکر طبع واشاعت کی منزل سے گزرا۔ (تذکرہ گلشن ہند اور علامہ شبلی نعمانی ہماری زبان دہلی، ۲۲، ۲۸ر جنوری ۲۰۰۵ء)

راقم الحروف نے شبلی کے حواشی کو شمار کیا یہ تعداد میں ۴۲ ہیں، (لطف کے دیباچہ کے حواشی اس تعداد میں محسوب نہیں) جن کی نوعیت یہ ہے:

الفاظ کے مطالب اور مفہوم اشعار کے سلسلے میں	۱۳
مبہم عبارت کی وضاحت کے سلسلے میں	۵
الفاظ کی صحت کے سلسلے میں	۲
اضافی معلومات کے سلسلے میں	۴
تصحیح معلومات کے سلسلے میں	۱
تنقیدی حواشی	۵
قرأت درست کرنے کے سلسلے میں	۴
تصحیح اور قیاس تصحیح کے سلسلے میں	۴
اضافہ کلام کے سلسلے میں	۱
انتساب اشعار کے سلسلے میں	۲
املا کے بارے میں	۱
کل تعداد	۴۲

حواشی کے مذکورہ فہرست سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تصحیح متن کے لئے شبلی کے پیش نظر

کوئی خاص اصول نہیں تھا، یہ حواشی تشریحی یا اشاراتی ہیں، تصحیح متن سے ان کا بالواسطہ تعلق نہیں، بیشتر حواشی نامانوس لفظوں کے مطالب، جملوں کے صحیح تلفظ یا ساخت سے متعلق ہیں، یہ حواشی ایک چھوٹے چھوٹے ایک ایک فقرے یا سطر ونصف سطر پر مشتمل ہیں، ایک سطر سے زائد کے حواشی صرف نو ہیں۔ ان میں طویل ترین حاشیہ ۴سطری ہے جو مولانا حالی پر نقد کی نوعیت رکھتا ہے۔ (ص: ۳۸)

مجموعی طور پر حواشی کارآمد ہیں لیکن کتاب کی نوعیت ترتیب کے لحاظ سے یہ متن کے حسب حال نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے اس کام کو دل جمعی کے ساتھ نہیں کیا اور نہ اسے اپنی تالیفات میں جگہ دی، مکاتیب شبلی کی دونوں جلدیں اور حیات شبلی اس کے ذکر سے خالی ہیں، ظاہر ہے اس طرح کا کام شبلی جیسی عبقری شخصیت کے لئے وجہ افتخار نہ اس دور میں ہوسکتا تھا اور نہ آج بن سکتا ہے، تاریخی طور پر اس کی اہمیت سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تصحیح متن کے لئے گلشن ہند کے خطی نسخے کا دوسرے دستیاب نسخوں سے تقابل ضروری تھا جو ممکن نہیں ہوسکتا (۷) متن میں جہاں تہاں جو خلا تھے وہ بڑی حد تک شبلی نے پُر کرنے کی کوشش کی لیکن بعض مقامات ان کی نظروں سے اوجھل رہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شبلی کی معلومات ان مقامات کا احاطہ نہیں کرسکتی تھی البتہ ان مقامات کی موجودگی ہی سے یہ خیال مستحکم ہوجاتا ہے کہ تصحیح وتحشیہ کا کام فرمائش پر عجلت میں کیا گیا ہے، ایسے چند مقامات حسب ذیل ہیں:

صفحہ ۷ پر لطف کی اس عبارت "کرم نام سی کی ندی سے کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے" کے پہلے ٹکڑے کی حاشیہ میں وضاحت کی ہے: "یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم تھا" یہ اطلاع وتصحیح درست نہیں، یہ معروف ندی ہے اور اس کا نام 'کرم ناسا' ہے، غالباً ناسا کو شبلی نے 'نام سی' پڑھا اور حاشیہ دے کر اس کے ابہام کو دور کیا، بہتر یہ تھا کہ ندی کے نام کے تصدیق کرلی جاتی۔

صفحہ ۲۳ پر تذکرہ نگار نے شیخ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کا ترجمہ دیا ہے، لیکن کوائف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتخلص بہ امین دہلوی) کے درج کردیے ہیں، تذکرہ نگار ان دو جدا جدا شخصیات سے واقف نہیں، اس نے شاہ صاحب اور ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز کی پس پردہ جوبھی کی ہے، مناقب معاویہ اور ابطال حسین میں ان کی دو کتابوں کا نام بھی لکھا ہے، شبلی نے اس ترجمہ پر دو حواشی دے کر اول تذکرہ نگار کی نیت کا خلاصہ کیا ہے، اور کتب کے نام کی صحت کرتے ہوئے مناقب

معاویہ کو فرضی قرار دیا ہے لیکن وہ یہ تصحیح کرنے سے قاصر رہے کہ شیخ ولی اللہ اشتیاق اور شاہ ولی اللہ دو علاحدہ علاحدہ شخصیات ہیں۔

صفحہ ۱۴۱ پر امین عظیم آبادی کا شعر ہے ۔

بتاں کے واسطے گھر بار گوا پنے بہا نکلا ☆ یہ طفل اشک میرا، عاشقی میں بے بہا نکلا

مصرعہ ثانی میں 'بے بہا' ہونا چاہیے تھا، اسی صفحہ پر ایک اور شعر ہے ۔

خط نے مارا ہے حسن پر شب خوں ☆ کیا ہی جھگڑا ہے سوائے کا

مصرعہ ثانی خارج از وزن ہے، 'جھگڑا' کے بعد یہ کتابت سے رہ گیا ہے، 'سوائے' کا محل نہیں کیوں کہ غزل کے قوافی آنے بہانے وغیرہ ہیں، یہ لفظ 'سوانے' ہونا چاہیے تھا، بہ معنی سرحد (کیا ہی جھگڑا یہ ہے، سوانے کا)

صفحہ ۴۳ پر اسی شاعر کا شعر ہے:

سیل آتی ہے تو آنے دو مرا کیا لے گی ☆ گھر میں اک میں ہوں پڑا اور کئی بھتے ہیں

غزل کے اشعار میں جیتے، پیتے، پیتے کے قافیے ہیں، بھتے کا محل نہیں، صحیح لفظ میتے ہونا چاہیے جو سیل کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ میر نے شکار نامے کے ایک بند میں اس لفظ کا استعمال اس طرح کیا ہے:

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند ☆ جراحت نے کئے ہیں میتے سر بند

غرض کہ شبلی کی یہ کاوش تاریخی طور پر اردو میں تصحیح متن کی اولیت کی روایت کا درجہ ضرور رکھتی ہے لیکن معیار و منہاج کے لحاظ سے یہ شبلی کے علمی مرتبے اور تصنیفی و تالیفی در و بست کی صلاحیت سے فروتر ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سطور بالا میں ادبی تحقیق کی روایت میں شبلی کی جن اولیات پر گفتگو کی گئی ہے وہ بالترتیب یہ ہیں:

۱۔ ماخذ و مواد کی تلاش و تفتیش

۲۔ حوالوں کا فٹ نوٹ میں اندراج

۳۔ راوی اور روایت

۴- تحقیق منسوبات

۵- تدوین متن

لیکن شبلی کے تحقیقی عمل کو صرف ان پانچ شقوں تک محدود نہ سمجھا جائے، یہ تو ان کی اولیت کی نشانیاں ہیں، ان کے اختیار اور وضع کردہ نظام تحقیق میں مشرق و مغرب کے بہت سے رہنما اصول تحقیق در آگئے ہیں ضرورت ہے کہ ان کی تصانیف و مقالات سے انھیں اخذ کر کے مرتب کیا جائے اور تحقیق میں ان کی حیثیت اور قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔

جہاں تک موجودہ دور میں شبلی کی معنویت کا سوال ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے تحقیق کے بعض ابتدائی اور اہم اصولوں کو تسلسل و تواتر کے ساتھ اپنایا اور تحقیق کے طریق کار کی روایت کو تقویت دی، جس کا فیض بعد کی تحقیق اور محققین کو پہنچا، پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے اپنے مضمون تنقید شعر العجم میں لکھا ہے:

''اگر علامہ شبلی کے کارنامے عالم وجود میں نہ آتے تو حافظ محمود شیرانی جیسی عظیم شخصیتیں بھی عالم وجود میں نہ آتیں، چراغ سے چراغ جلتا ہے، علامہ نے جو چراغ جلایا تھا اس کی روشنی میں دوسرے چراغ جلے ہیں۔ (حافظ محمود شیرانی، تحقیق مطالعے ص ۲۵۲)

دوسری صورت یہ ہے کہ سوانحات سے متعلق سلسلہ وار انھوں نے جو تحقیقی کام کیا [(المامون ۱۸۸۷ء) سیرۃ النعمان (۱۸۹۲ء) الفاروق (۱۸۹۸ء) الغزالی (۱۹۰۲ء) سوانح مولانا روم (۱۹۰۶ء) اور سیرۃ النبیؐ (۱۹۱۸ء)] اس نے بالآخر اردو میں ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کر لی، آج جامعات میں علمی و ادبی شخصیات پر پی ایچ ڈی کے لئے لکھے جانے والے علمی مقالات (تھیسس) کی تعداد بہت زیادہ ہے جو احوال و آثار، حیات و خدمات، سوانح و شخصیت، حیات و فن اسی طرح کے دوسرے عنوانات کے تحت کثرت سے لکھے جا رہے رہیں، مختلف علاقوں، مختلف ادوار اور مختلف اصناف ادب کے ادیبوں کی سوانحات اور علمی و ادبی کارگزاریوں پر لگاتار دادِ تحقیق دی جا رہی ہے یہ سب شبلی ہی کا فیضان ہے، اس فیضان کا شریک غالب کی حیثیت سے حالی کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حیات سعدی (۱۸۸۲ء) یادگار غالب (۱۸۹۷ء) حیات جاوید (۱۹۰۱ء) زندہ و جاوید رہنے والی سوانحات ہیں لیکن بقول مالک رام:

''حالی کا کام محدود سطح پر تھا، انھوں نے سیرت سے باہر قدم نہیں رکھا، ان کی مثال زیادہ سے زیادہ اسی میدان میں لوگوں کی رہنمائی کر سکتی ہے، اس سے عام تحقیقی ذوق اور تجسس کی خواہش نہیں پیدا ہو سکتی تھی، یہ کام ان کے ہم عصر مولانا شبلی نعمانی نے کیا، شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں، ان سب کتابوں میں واقعات کی تحقیق، ان کی ترتیب اور دروبست، اخذ نتائج وغیرہ پر ایک بات قابل تعریف ہے، اب ان موضوعوں سے متعلق کچھ اور لکھنا محال ہے۔ (اردو میں تحقیق ص: ۱۰-۱۱)

عصر حاضر میں شبلی کی معنویت کا یہ ایک ایسا زندہ، قوی اور توانا ثبوت ہے جس سے ان کے مخالفین بھی انکار کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ شیخ محمد اکرام کے ایک اقتباس پر اس مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کے متعلق اختلاف آرا شدت سے ہے، ان کے مخالفین کو تو اُن کے کمال فن میں بھی عیب نظر آتے ہیں اور جو لوگ ان کے معتقد ہیں وہ انھیں سرسید سے جا ملاتے ہیں .... تاہم یہ سچ ہے کہ سرسید کے حلقے میں پیر میکدہ کے بعد شبلی جیسی جامع الصفات حیثیت کوئی نہ تھی .... بہ حیثیت مجموعی وہ شاید سرسید کے بعد سب سے آگے آگے جاتے ہیں، آخر حالی، آزاد، محسن، اور وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے تھے، ایک یا دو یا تین کے، ان میں شبلی کی بوقلمونی کہاں سے آئے گی۔ .... قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کر دکھایا کیا وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔''

(موج کوثر ج ۳۱، ص ۲۳۴)

حواشی:

(۱) مالک رام (ف ۱۹۹۳ء) پہلے محقق ہیں جنھوں نے شبلی کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کیا، ۱۹۶۶ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ میں انھوں نے خطبہ صدارت دیا تھا، جس کا عنوان تھا ''اردو میں تحقیق'' (دہلی ۱۹۶۶ء) یہ اعتراف اسی خطبہ صدارت میں تھا جو ڈھائی صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) شبلی کی تحقیقات کا موضوع عموماً مذہبی شخصیات، مذہبی موضوعات یا تاریخ رہے ہیں، حدیث، قرآن،

تاریخ، کلام، فلسفہ عربی زبان وادب پر فاضلانہ دسترس کے بغیر شبلی کے کام کا تحقیقی جائزہ ممکن نہیں، اردو محققین کی صف میں جو نام ابھر کر سامنے آتے رہے ہیں ان میں کوئی بھی محقق ایسا نظر نہیں آتا جو ان علوم پر فاضلانہ نگاہ رکھتا ہو، سوائے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے شاید شبلی کے ساتھ بے اعتنائی کی ایک وجہ یہ بھی ہو، موجودہ دور کے محققین میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی مذکورہ اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں، انھوں نے شبلی کے مطالعے پر عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ صرف کیا ہے لیکن شبلی سے متعلق تحقیقات میں ان کی ابھی صرف ایک کتاب ''مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار'' اور بعض مضامین ہی منظر عام پر آسکے ہیں۔

(۳) سفرنامہ روم ومصر وشام میں انھوں نے پروفیسر آرنلڈ کو (جو مدرسۃ العلوم میں فلسفہ کے پروفیسر تھے) اپنا استاذ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''میں نے ان سے فرنچ زبان سیکھی ہے'' (ص ۸) سرسید احمد خاں کو ایک خط میں قسطنطنیہ سے اطلاع دیتے ہیں: میں نے ترکی پڑھنی شروع کی ہے اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ بقدر ضرورت واپسی کے وقت تک سیکھ لوں گا۔ (مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۱)

(۴) پاکستانی محقق ڈاکٹر نجم الاسلام (ف ۲۰۰۱ء) نے سندھ یونیورسٹی کے علمی مجلے تحقیق (ناشر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، ۹۷-۱۹۹۶ء) میں ''گوشہ تحقیق منسوبات'' مرتب کیا تھا، جس میں منسوبات اور مجہول ومجہول کتب پر قدیم وجدید محققین کے ۶۵ مقالات شامل ہیں، جو ۶۴۸ صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اس گوشہ کی ابتدا شبلی کے مضمون سے کرتے ہیں، انھوں نے اپنے تعارف میں لکھا ہے:

> اردو میں تحقیق منسوبات کی پہلی کوشش شبلی کی تحریر ہے جو ان کی تصنیف الغزالی میں امام غزالی کی مجوث فیہ تصنیفات کے عنوان سے آتی ہے......... یہ محض نقش اول ہے، ایک وسیع میدان کی طرف پہلا قدم .... اس میدان میں تقدم کی فضیلت شبلی کے حصے میں آئی .... شبلی کی فضیلت تقدم ہمیں تسلیم ہے۔
>
> (ص، ۴۹۲)

(۵) انجمن ترقی اردو کا قیام ۴ رجنوری ۱۹۰۳ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں عمل میں آیا، قیام کے بعد اس کے اولین سکریٹری مولانا شبلی قرار پائے۔ (انجمن ترقی اردو ہند کی علمی وادبی خدمات ص ۳۰-۲۹) دسمبر ۱۹۰۵ء میں شبلی نے انجمن کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا (حوالہ سابق ص ۵۱) شبلی کے زمانے میں انجمن کی تشکیل وتنظیم پر زیادہ توجہ صرف ہوئی لیکن پھر بھی ۱۴ کتابیں زیر قلم تھیں جو انگریزی کتب کے ترجموں کی سوانحات پر مشتمل تھیں، شبلی کے عہد میں صرف ۲ کتابیں

شائع ہوئیں۔

(۶) رفاقت علی شاہد نے شبلی کے مرتبہ گلشن ہند کو اردو تحقیق کا نقطہ آغاز مانا ہے لیکن وہ اپنے بیان میں گلشن ہند پر شبلی کے مقدمے کی اطلاع بھی دیتے ہیں جو غلط ہے۔ ان کا بیان حسب ذیل ہے:

اردو کی ادبی تحقیق کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں، محض ایک صدی تو گزری ہے، جب اردو میں ادبی تاریخی تحقیق کا رواج ہوا، اگر شبلی نعمانی کے مقدمہ تذکرہ گلشن ہند (از مرزا علی لطف، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۶ء) کو اس کا نقطہ آغاز مانا جائے تو تب سے آج تک اردو ادب کی تحقیق پر ہزاروں تحریریں .... وجود میں آچکی ہیں۔
(مقدمہ تحقیق شناسی، ص ۱۵)

(۷) محمد الیاس الاعظمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

تحقیق و مراجعت کا عام دستور یہ ہے کہ اصل سے مقابلہ و موازنہ کیا جائے تا کہ نقل میں اگر کوئی تسامح ہو گیا ہو تو اس کی اصلاح یا وضاحت کر دی جائے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب دوسرے نسخے موجود ہوں، لیکن چونکہ گلشن ہند کا کوئی نسخہ سرے سے دستیاب ہی نہیں تھا اور نہ آج تک دستیاب ہو سکا ہے اس لئے اس سے مقابلے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (ہماری زبان۔۲۲-۲۸ر جنوری ۲۰۰۵ء)

یہ بیان درست نہیں، ممکن ہے شبلی کے عہد میں اس کے تذکرے کا کوئی اور نسخہ دستیاب نہ ہو لیکن فی الوقت اس کے بارہ نسخے دریافت ہو چکے ہیں، (لطف حیات اور کارنامے ص ۱۳۰) اس کے چار نسخے انجمن ترقی اردو کراچی کی ملکیت ہیں، ان کا تعارف کراتے ہوئے افسر صدیقی مرحوم نے واقعات کے سلسلے میں لطف کی بعض لغزشوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ (ملاحظہ کریں مخطوطات انجمن ترقی اردو ج ا، ص ۱۲۳ تا ۱۳۱)

کتابیات

۱	ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	اتر پردیش اردو اکیڈمی	لکھنؤ ۱۹۹۰ء
۲	اردو میں تحقیق	مالک رام	جمال پرنٹنگ پریس	دہلی ۱۹۶۶ء

۳	الغزالی	علامہ شبلی نعمانی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڑھ ۱۹۹۷ء
۴	الفاروق	علامہ شبلی نعمانی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء
۵	المامون	علامہ شبلی نعمانی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڑھ ۲۰۰۳ء
۶	تحقیق شناسی (مجموعہ مقالات)	مرتب رفاقت علی شاہد	ندیم یونس پرنٹرز	لاہور ۲۰۰۳ء
۷	تذکرہ ماہ و سال	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	دہلی ۱۹۹۱ء
۸	تلاش غالب	پروفیسر نثار احمد فاروقی	غالب انسٹی ٹیوٹ	دہلی ۱۹۹۹ء
۹	جائزہ مخطوطات اردو ج ۱	مشفق خواجہ	مرکزی اردو بورڈ	لاہور ۱۹۷۹ء
۱۰	حافظ محمود شیرانی۔ تحقیقی مطالعے	پروفیسر نذیر احمد	غالب انسٹی ٹیوٹ	دہلی ۱۹۹۱ء
۱۱	خطوط شبلی	محمد امین زبیری	تاج کمپنی لمیٹڈ	لاہور ۱۹۳۵ء
۱۲	دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات ج ۱	پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڑھ ۲۰۰۳ء
۱۳	سفرنامہ روم و مصر و شام	علامہ شبلی نعمانی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء
۱۴	سیرۃ النبیؐ ج ۱	علامہ شبلی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڑھ ۲۰۰۳ء
۱۵	شبلی بحیثیت سیرت نگار	ظفر احمد صدیقی	عبارت آفسیٹ	دہلی ۲۰۰۴ء
۱۶	شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں	سید شہاب الدین دسنوی	انجمن ترقی اردو ہند	دہلی ۱۹۸۷ء
۱۷	کسوف الشمسین	نظامی بدایونی	نظامی پریس	بدایوں 1915ء
۱۸	گلشن ہند (مرزا علی لطف)	مرتبہ محی الدین قادری زور	انجمن اردو ہند	دہلی ۱۹۳۴ء
۱۹	مکاتیب شبلی ج ۱	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء
۲۰	موج کوثر ج ۳	شیخ محمد اکرام	ادبی دنیا	دہلی ۲۰۰۱ء
۲۱	تذکروں کا تذکرہ نمبر	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	نگار (کراچی)	مئی، جون ۱۹۶۴ء
۲۲	شبلی نمبر	شہریار	فکر و نظر (علی گڑھ)	جون ۱۹۹۶ء
۲۳	گوشہ تحقیق منسوبات	ڈاکٹر نجم الاسلام	تحقیق (جام شورو)	۹۷-۱۹۹۶ء

☆☆☆

مکاتیبِ شبلی میں عربی زبان وادب

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی ☆

عربوں اور عربی ادب کا ہندوستان سے نہایت قدیم رشتہ ہے، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے بہت پہلے عرب وہند کے تجارتی تعلقات کی شہادتیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں (۱) یہی تجارتی رشتے اشاعت اسلام کے اسباب ثابت ہوئے اور ہندوستان کی سرزمین نبوت محمدی کی کرنوں سے آبدار ہوئی، رفتہ رفتہ یہ سرزمین مدارس اور اسلامی مراکز کا گڑھ بنتی گئی (۲) عربی زبان وادب ہندوستانی مسلمانوں کے رگ وپے میں سرایت کر گئے، مدارس اور اسلامی مراکز سے آگے بڑھ کر یہاں کے کالجز اور جامعات میں بھی عربی زبان وادب کی تدریس کا آغاز ہوا، سرزمین ہند سے عربی زبان وادب کے بعض ایسے جید علماء پیدا ہوئے جن کی علمی جلالت شان کے حضور خود عرب سرنگوں ہوگئے، علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کا ایسے ہی جلیل القدر علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی قدیم اور جدید عربی ادب پر یکساں قدرت رکھتے تھے علامہ پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنھوں نے جدید عربی ادب سے ہندوستان کو آشنا کیا اور جدید عربی ادب کے فروغ کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں "لجنة الادب" کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس میں طلبہ اور اساتذہ عربی زبان میں مقالات اور قصائد پیش کرتے تھے، علامہ کو یہ فکر ہر وقت دامن گیر رہی کہ اگر ہندوستانی علماء جدید عربی زبان وادب سے ناآشنا رہے تو ہمارا تعلق عربوں سے منقطع ہو جائے گا، علامہ نے اسی نقطۂ نظر کے تحت ندوۃ العلماء میں جدید عربی زبان وادب کے چلن پر زور دیا، طلبہ کو تاکید کرتے رہے کہ وہ عربی تحریر وتقریر کی مشق کرتے رہیں، علامہ کی ان ہی توجہات اور تاکیدات کا نتیجہ ہے کہ آج ندوۃ العلماء ہندوستان میں عربی ادب کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

☆ ریڈر، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی مختلف تحریروں میں قدیم اور جدید عربی ادب کے مختلف مراجع ومصادر اور مختلف شعراء اور مصنفین پر اظہار خیال کیا ہے بالخصوص اپنے سفرنامہ اور مقالات میں بعض اہم عربی ادب کے گوشوں کو موضوع بحث بنایا ہے اسی طرح اپنے مکاتیب میں بھی مختلف مقامات پر عربی ادب کی بعض جہتوں پر اپنی قیمتی آراء پیش کی ہیں اس مضمون میں ان ہی جواہر پاروں کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی۔

مکاتیب کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے بیشمار مصادر ومراجع کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ان کے محاسن اور معائب پر روشنی بھی ڈالی ہے، عربی کے بہت سے مصادر جن کا حصول آج آسان تر ہے لیکن اس زمانے میں ان کی دستیابی ''لانا ہے جوئے شیر'' کے مترادف تھا ان کے لئے علامہ خطوط لکھتے، مختلف ناشرین اور اہل علم سے رابطہ قائم کرتے اور طالبین کتب کو ان تصانیف کے حصول کی رہنمائی کرتے، ان کتابوں کا قرآنیات، حدیث، اسلامیات، فقہ، تاریخ، انسان اور دیگر موضوعات سے تعلق ہوتا، ان خطوط میں عرب اہل قلم کو موضوع بحث بنایا گیا، مستشرقین کی خدمات اور علمی بد دیانتیوں کا ذکر کیا گیا، عربی تجارت اور دیگر مباحث پر اظہار خیال کیا گیا۔

عربی تصانیف:

علامہ شبلی نعمانی کے خطوط میں مصادر ومراجع اور نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، مسودات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ خطوط جو روم ومصر وشام سے مختلف شخصیات کو تحریر کئے گئے ان میں گراں قدر تصانیف کا انبار لگا ہوا ہے یہ وہ مصادر ومراجع اور تصانیف ہیں جن کا حصول کل تک ممکن نہ تھا بلکہ اہل علم ان کے عناوین سے بھی آشنا تھے مثلاً بخاری کی شرح ''عینی'' کے متعلق علامہ لکھتے ہیں:

> ''یہاں (قسطنطنیہ) آج کل عینی کی شرح بخاری چھپ رہی ہے، ۹ جلدیں چھپ چکی ہیں، بہت بڑی کتاب ہے، حنفیوں کو اس کی تلاش تھی وہاں کسی متصلب حنفی کو درکار ہو تو منگوا سکتے ہیں۔'' (۶)

علامہ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''المامون'' کے دوسرے حصے کی ترتیب وتسوید کے لیے جن مصادر کی ضرورت تھی انھیں اس طرح ذکر کیا ہے: تفسیر کبیر، نووی شرح مسلم، نصب الرایہ،

تخریج ہدایہ، ہدایہ، شرح مسلم، موطا امام محمد، میزان، الاعتدال، معانی الآثار، زیلعی کی ہدایہ، مقدمہ ابن الصلاح (۸) ایک خط میں امام غزالی کی ''مکاتبات'' کے مسودہ کا ذکر ہے، علامہ نے ایک خط میں یہ وضاحت کی کہ ''مثل السائر'' کے حاشیہ پر ''ادب الکاتب'' کو شائع کیا گیا ہے۔ (۱۰)

مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نام ایک خط میں امام غزالی کی معروف کتاب ''تہافتہ الفلسفتہ'' کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا ہے ''لیکن اصل چیز ان کی کتاب تہافت الفلسفہ کا ریویو ہے جس پر ابن رشد نے ردلکھا ہے، میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہا (علی گڑھ آنے سے پہلے) باوجود اس کے میری سمجھ میں وہ کتاب نہیں آئی، مولوی فاروق صاحب سے پڑھنا چاہا وہ بھی کترا گئے میں نے چند دفعہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیئے کہ ان کتابوں کی ریویو نہ ہوسکا تو فائدہ اس کے علاوہ پورے علم کلام کی تاریخ اور اس پر ریویو کو لکھنا پڑے گا'' اس کے علاوہ امام غزالی نے فقہ کے موضوع پر ''منخول'' اور ''مستصفی'' ترتیب دیا علامہ نے امام غزالی کی فلسفہ اسلامی کے موضوع پر ''حکمتہ الاشراق'' کا بھی ذکر کیا، فلسفہ ومنطق پر امام غزالی کی تصانیف محک النظر، مقاصد الفلاسفہ اور منتخل کو مذکورہ کتب میں شامل کیا، امام غزالی کے ضمن میں امام رازی کی مطالب عالیہ، نہایۃ العقول، اربعین اور مباحث مشرقیہ کے تذکرے کو مناسب تصور کیا۔

عمر کے آخری دنوں میں علامہ نے سیر الصحابہ کو بھی موضوع بحث بنانا چاہا اور فرمایا کہ اس موضوع پر استیعاب: قاضی عبدالبر، اسد الغابہ، اصابہ اور ابن کثیر شامی قابلِ ذکر اہمیت کی حامل ہیں مولانا نے ایک مخطوطہ ''کتاب الآلات'' کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (۱۵)

امام سیوطی کی ایک کتاب کے باب میں شیروانی صاحب کو تحریر فرماتے ہیں۔ سیوطی کی ''اشباہ والنظائر'' فن نحو میں ایک کتاب ہے اور فن نحو کی تاریخ اور فلسفہ ہے۔

فرید وجدی جدید عربی ادب کے ایک مایہ ناز صاحب قلم ہیں، اسلام پسند مصنفین میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ (۱۷) علامہ نے مقالات میں ان کی شخصیت پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی معلومات کو سطحی اور سرسری قرار دیا ہے (۱۸) شیروانی صاحب کے نام ایک خط میں فرید وجدی کی کتاب ''المراۃ المسلمہ'' کا ذکر کیا (۱۹) جو دراصل قاسم امین کی کتاب ''المراۃ الجدیدۃ''

کا جواب ہے، ہندوستان میں مولانا آزاد نے ''المرأۃ المسلمۃ'' کو اردو میں منتقل کیا۔ (۲۰)

مولانا نے یورپ کی علمی مہم جوئی کی تعریف کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں صراحت فرمائی کہ یورپ قدمائے اسلام کی تمام تصانیف کی اشاعت کا حد درجہ متمنی ہے ادھر ایسی قیمتی تصانیف یورپ کی علمی دل چسپی سے منظر عام پر آئی ہیں جن سے میں واقف نہیں تھا مثلاً ثعالبی کی تاریخ الفرس، کتاب المحاسن والمساوی بیہقی، عیون الاخبار ابن قتیبہ اور کتاب البخلاء للجاحظ عجیب کتابیں ہیں۔ (۲۱)

اپنے ایک دوسرے خط میں بعض عربی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے خصائص ابن جنی (۲۲) قسطاس المستقیم غزالی، میزان العمل غزالی، احاطہ فی تاریخ غرناطہ للسان الدین بن الخطیب اور مخصص لابن سیدہ کے نام لیے ہیں۔ (۲۳)

مولانا نے اپنے بعض خطوط میں تراجم کا بھی ذکر کیا ہے اسی توسط سے مشہور یونانی شاعر ہومر کی نظم الیڈ (۲۴) کا ترجمہ دائرۃ المعارف بیروت سے شائع کیا گیا ہے، (۲۵) اسی طرح موسیو لی بان کی فرنچ تصنیف کا ترجمہ ''روح الاجتماع'' کے نام سے عربی میں کیا گیا، مولانا شیروانی کو یہ بھی اطلاع دی کہ مصر سے ثمار القلوب للثعلبی شائع ہو گئی ہے، (۲۶) ایک مکتوب میں اصابہ جلد اخیر، ابن خلکان، نفح الطیب، عقد الفرید (۲۸) اور الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور کا ذکر کیا گیا ہے (۲۹) علامہ نے سمعانی کی ''کتاب الانساب'' (۳۰) کے متعلق رقم فرمایا کہ ''انساب سمعانی کا مکمل نسخہ مطبوعہ فوٹو ہاتھ آیا، بڑی ضخیم کتاب ہے اور نہایت مستند ہے۔'' (۳۱)

علامہ شبلی نے مولانا حمید الدین فراہی سے اپنے خطوط میں مختلف علمی بالخصوص قرآنی موضوعات پر گفتگو کی ہے، نیز انھیں نئی مطبوعات کے باب میں مطلع بھی کرتے تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں نے سیبویہ کی ''الکتاب'' اور شرح طوالع خرید لی ہیں۔ (۳۲) علامہ شبلی مولانا فراہی کو عربی اور انگریزی دونوں کا ماہر تصور کرتے تھے اسی لیے آپ سے ''الدروس الاولیہ'' (۳۳) کی تدریس کے لیے کہا جو ندوہ کے نصاب میں علامہ نے داخل کیا تھا، یہ طبعیات جدیدۃ کے موضوع پر ایک قابل قدر تصنیف تھی، اسے وہی پڑھا سکتا تھا جسے انگریزی بھی آتی ہو۔ (۳۴) ایک اور خط میں مولانا فراہی کو اطلاع دیتے ہیں کہ ابن تیمیہ کی کتاب العقل والنقل (چار جلدوں میں) اور محصل امام رازی مع نقد المحصل طوسی بھی چھپ کر منظر عام پر آ گئی ہے (۳۵) ایک مقام پر علامہ رقم طراز ہیں کہ ابن قیم کی

''اقسام القرآن'' اور کتاب فی القضاء والقدر'' نہ دیکھا ہو تو یہاں سے منگوا سکتے ہو۔ (۳۶)

مولانا سید سلیمان ندوی نے عربی میں ''جغرافیہ اور مسلمان'' کے موضوع پر مضمون لکھنے کے درمیان علامہ سے سوالات کیے تو جواب میں آپ نے تحریر کیا ''مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف میں جہاں جہاں حصہ ہائے زمین کا نام لیا ہے، آسیاء اور فا اور افریقہ لکھا ہے، شاید مروج الذہب میں بھی یہ الفاظ آئے ہوں (۳۷)

سید صاحب کے نام ایک خط میں رقم طراز ہیں کہ عبدالوہاب نجدی کی کتاب الہدی النبوی کے چند صفحات کی نقل بھیجو تو میں اس کے متعلق رائے قائم کر کے اس کی نقل کی اجازت دوں۔

تاریخ الاسلام ابراہیم بن عبداللہ کی جو عبارت تم نے نقل کی ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں، یہ باتیں اور کتابوں میں مذکور ہیں صرف یہود سے جزیہ نئی بات ہے لیکن اس کا ثبوت نہیں'' (۳۸)

علامہ نے سیرت ابن ہشام (۳۹) کی تعریف وتوصیف اس انداز میں بیان کی ہے ''سیرت شامی فی الوقع'' سب سے بڑی اور محققانہ کتاب ہے لیکن افسوس کہ ملتی نہیں، عماد بن کثیر کا پتہ لگاؤ، وہ بھی نہایت محققانہ اور محدثانہ ہے، عبدالوہاب نجدی کی سیرت کی نقل تم نے نہیں بھیجی، دولابی کے دو چار صفحے بھیج دو'' (۴۰) اپنے عزیز شاگرد کو یہ اطلاع دی کی ثعلبی کہ کتاب ''غرر تاریخ الفرس'' فرانس سے شائع ہو گئی ہے (۴۱) ایک خط میں مزید اطلاع دیتے ہیں کہ جو معجم الادباء کی چھٹی جلد آ گئی ہے، اس میں جاحظ کا بھی حال ہے، اس کی کتاب ''دلائل النبوۃ'' کے سو نسخے ایک وقت ایک مصنف نے لوگوں کے پاس دیکھے آج ایک صفحہ موجود نہیں۔'' (۴۲)

حضرت عائشہ پر سید صاحب کی معروف کتاب سے کون واقف نہیں؟ اس کی ترتیب وتسوید میں علامہ نے اپنے شاگرد کی خاص رہنمائی کی ہے، اسی تعلق سے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''مسند عائشہ میرے پاس ہے، میں دیدوں ا، طبقات میں لغویات زیادہ ہیں اس سے کیا فائدہ، بخاری، مسلم، ابوداؤد کافی ہیں'' (۴۳) ایک خط میں اہل مسکوہ کی تجارب الامم اور تہذیب التہذیب (۴۴) کا ذکر کیا ہے (۴۵) اسی طرح نکلسن کی کتاب Literary of the Arab کے متعلق فرمایا کہ صورتا میں نے دیکھی ہے۔ (۴۶)

قرآنیات

مذکورہ سطور سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ علامہ کو عربی مصادر و مراجع سے کتنی گہری عقیدت تھی نیز عربی نوادرات، مخطوطات اور مطبوعات تک رسائی کے لیے کس درجہ فکر مند تھے، اس عقیدت مندی اور فکر مندی کا تعلق صرف اور صرف بحث و تحقیق سے تھا، وہ اپنے علمی ذوق و شوق کے توسط سے ملت اسلامیہ کے اندر بھی تصنیفی اور تحقیقی سماں باندھنے کے آرزو مند تھے اسی لیے مولانا عبدالماجد دریابادی نے انھیں مصنف اور مصنف گر کے خطاب سے یاد کیا، عربی مصادر و مراجع کی طرح علامہ کے خطوط میں قرآنیات کا بھی ایک بڑا قیمتی سرمایہ موجود ہے، قرآنی تصانیف، قرآنی مباحث اور ماہرین و مفسرین قرآن کریم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

منشی محمد امین صاحب نے علامہ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ''نہیں قرآن مجید میں متعہ کے جواز کی کوئی آیت نہیں البتہ جنگ خیبر میں عارضی طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جائز کر دیا تھا اور پھر حرام کر دیا گیا، متعہ کا جواز زنا سے کچھ ہی کم درجہ پر ہے، ازواج کا مقصود زوجین کا ابدی تعلق ہے نہ فوری اور نہ وقتی۔

دوازدہ امام نے ہم لوگوں کی روایت کے موافق کبھی متعہ کو جائز نہیں کہا۔'' (۴۷)

مستعصم باللہ آخری خلیفہ بغداد کے دربار کا خوش نویس تھا اس کے ہاتھ کا قرآن لکھا ہوا لکھنؤ میں ایک کتب فروش کے پاس موجود ہے، اس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں ''یاقوت مستعصمی کے نسخہ قرآن کو آپ خود یہاں آکر دیکھیے، تین ہزار میں طے ہو جائے گا پورا نسخہ۔ (۴۸)

مولانا فراہی کے نام ایک مکتوب میں کچھ تفاسیر کے متعلق لکھتے ہیں ''نظام القرآن کا میں شوق سے خیر مقدم کروں گا، ابو مسلم ہی ایک شخص ہے جو دل و دماغ رکھتا ہے، وہ معتزلی ہے، اس کی تفسیر بارہ جلدوں میں ہے اور رازی کی تفسیر سے پہلے اسی کا نام کبیر تھا، میں نے اس کا کسی قدر حال اپنی نئی تصنیف علم الکلام میں لکھا ہے جو ابھی شائع ہوئی ہے، اس کا پورا نام محمد بن علی بن میریزد تھا، ۴۵۷ھ میں وفات ہوئی، بہت بڑا ادیب و معقولی تھا''۔ (۴۹)

علامہ کو مولانا فراہی سے غیر معمولی تعلق تھا اور یہ تعلق صرف علم و فضل کی نسبت سے تھا اس لیے بے تکلفی سے انھیں علمی مشورہ دیا کرتے تھے ان مشوروں سے علامہ کی خورد نوازی پوری طرح

عیاں رہتی، مثلاً تفسیر فراہی کے نام کے متعلق فرماتے ہیں ''نظام القرآن کو میں شوق سے دیکھوں گا اور اپنا معتد بہ وقت صرف کروں گا لیکن نام بدل دو یعنی الف گھٹا دو'' جاحظ اور عبدالقاہر نے بھی اس موضوع پر کتاب لکھی ہے، اس کا نام نظم القرآن تھا، نظام میں ذرا بھدا پن ہے۔ (۵۱)

ایک دوسرے خط میں علامہ نے تفسیر نظام القرآن کے حسن بیان کی تعریف کی لیکن اس نظم قرآن کے باب میں علامہ نے کسی حتمی رائے سے گریز کیا اور فرماتے ہیں۔

''ایک اور امر یہ ہے کہ تم صرف رابط چیزوں کو لے لیتے ہو حالاں کہ اعتراض یہ ہے کہ دو مربوط مطلب کے بیچ میں جو غیر متعلق باتیں آجاتی ہیں وہ سلسلۂ کلام کو برہم اور غیر منظم کر دیتی ہیں، ان کا تعلق اور ربط ثابت کرنا چاہیے ایک دوسرے خط میں اسی بے ربطی کا اظہار ان کلمات میں کیا اور پھر نظام القرآن کے اجزاء کو دیکھا اس میں شبہ نہیں کہ اب کی زیادہ وجوہ ربط معلوم ہوئے، لیکن جن دو آیتوں میں تم ربط بتاتے ہو، ان کے درمیان میں اور آیتیں آجاتی ہیں جو بظاہر ان دونوں سے بے تعلق معلوم ہوتی ہیں، تاہم مجموعی طور سے یہ کوشش بے سود نہیں۔ (۵۳)

تفسیر نظام القرآن کے ایک جزء تفسیر سورہ ابی لہب کے متعلق علامہ یوں رطب اللسان ہیں: تفسیر پر تم کو مبارک باد دیتا ہوں تمام مسلمانوں کو تمہارا ممنون ہونا چاہیے۔ (۵۴)

مولانا فراہی چوں کہ قرآنیات میں یکتائے روزگار تھے اور علامہ کو آپ کی عربی دانی اور قرآنیات پر پوری طرح اعتماد تھا اس لیے قرآنیات کے اکثر مسائل و مباحث کے متعلق مولانا فراہی سے دریافت کرتے، ایک سوال یوں ہے۔ ''سورۂ احزاب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج کی جو اجازت ہے اور عدل کی قید بھی اڑا دی گئی ہے یہ کیا بات ہے؟ (۵۵)

علامہ نے فراہی سے دو سوالات کی تفصیل یوں دریافت کی:

[۱] توریت میں بہ تصریح موجود ہے کہ حضرت اسماعیل بر سبع یا فاران میں آباد ہوئے، کتاب پیدائش باب ۲۵ درس ۱۸ میں یہ الفاظ ہیں: ''اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں بستے تھے، ان کا قطعہ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا۔''

ان عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل و ہاجرہ عرب میں نہیں آئے اس کے متعلق تمہاری کیا تحقیق ہے؟ اور کیا تورات سے بالکل قطع نظر کر لینی چاہیے؟

[۲] دوسری بات یہ ہے کہ بخاری کتاب الانبیاء میں ایک حدیث موضوع ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل جب مکہ میں آئے تو شیر خوار تھے لیکن تورات میں جہاں ختنہ کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جب حضرت اسماعیل کا ختنہ کیا تو ان کی عمر تیرہ برس کی تھی، ان دونوں میں کیوں کر تطبیق ہو سکتی ہے؟ (۵٦)

ایک خط میں لفظ ''مکہ'' کے باب میں سوال کیا گیا ''زبور ۸۴ آیت ٦ میں وادیٔ بکا کا لفظ ہے بعض یورپین کی رائے ہے کہ یہ بکہ ہے جو مکہ کا نام ہے لیکن موجودہ نسخوں میں اس کی شکل بکا کی ہے، اس کے متعلق تحقیق کر کے لکھو۔ (۵۷)

لفظ بکہ کی تحقیق مولانا نے علامہ کو روانہ کی لیکن مزید استفسارات کے خواہش مند ہوئے، فرماتے ہیں: وادی بکا، 'بکا' کا املا اس طرح لکھتے ہیں کہ 'بکاء' یہ بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ ایک نسخہ میں یہی معنی لیے ہیں، اس لیے عبرانی نسخہ دیکھو کہ کیا ہے؟ ایک دوسرے خط میں مزید رقم طراز ہیں کہ اشعار عرب میں جہاں کہیں مکہ کا ذکر ہو اس کی رہنمائی کرو اور عبرانی میں بکہ کا تلفظ 'بخا' ہے جس کا مفہوم رونا ہے، اس بنا پر زبور کی آیت کو نصاریٰ مکہ کے متعلق نہیں مانتے۔

[۳] ان آیتوں کا حوالہ لکھو جن میں قربانیوں کے لیے ''بکر'' ضروری ہے، بعض اور باتیں جو تم نے لکھیں ان کے حوالے نہیں نقل کیے۔

[۴] مزمور ۸۳ میں اوس وخزرج کا ذکر نہیں صرف اسماعیل کا لفظ ہے۔

[۵] مورۃ کے کیا معنی ہیں جس کو انگریزی میں تحریف کر دیا ہے۔

ایک مبسوط کتاب ایک انگریز نے صرف اس بحث پر لکھی ہے کہ حضرت اسماعیل ذبیح نہ تھے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے کوئی نسبی تعلق ہے، میں اس کو ساتھ لیتا آؤں گا، عبرانی عبارتیں بھی نقل کی ہیں اور مسلمانوں کے تمام استدلالات بھی۔

خاص کر قرآن مجید پر ایک انگریزی کتاب ہے وہ بھی ساتھ لاؤں گا۔

جرمن کے مشہور پروفیسر نولدیک اور ولہاوسن ہیں، جن کی تحریر تمام یورپ میں مستند ہے،

ان کا ترجمہ میں نے کرلیا ہے نولدیک نے صرف قرآن پر لکھا ہے۔'' (۵۸)

ایک دوسرے خط میں ''ذبیح'' کا مسئلہ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے ''تمہارے خط کا بہت انتظار ہے جس خط میں تم نے حضرت اسماعیل کے ذبیح ہونے پر آٹھ تو دلیلیں لکھی تھیں اس میں تورات کے نصوص نہیں نقل کیے وہ لکھ بھیجو مثلاً یہ کہ قربانی سے مراد خدمت ھیکل ہے، اولاد اسماعیل کا بڑے بال رکھنا وغیرہ وغیرہ۔'' (۵۹)

ایک خط میں آیت تخییر سے متعلق سوال کیا گیا '' آیت تخییر (ازواج) اعتزال، مظاہرہ ازواج، تینوں واقعے الگ الگ بیان کیے جاتے ہیں لیکن میرے نزدیک سب ایک ہی سلسلہ کے اور ہم زماں ہیں، ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے تم اپنی تحقیق لکھو۔

لیکن سب سے مقدم بحث یہ ہے کہ حضرت عائشہ اور حفصہ کا مظاہرہ ایسی کیا چیز تھی جس کے لیے خدا و ملائکہ و صالح المومنین کی اعانت کی ضرورت پڑی۔ (۶۰)

یہ پہلو علمی دنیا کے سامنے مخفی نہیں کہ علامہ نے اپنی تصنیف و تحقیق میں جگہ جگہ مولانا فراہی سے استفادہ کیا ہے اسی استفادے کی ایک صورت درج ذیل خط بھی ہے۔

''سورۂ براءت کے متعلق ایک اور امر نہایت اہم اور اساس مباحث عظیمہ ہے، یعنی یہ سورہ کب اتری، صحاح ستہ میں فتح مکہ کے بعد اس کا زمانہ ہے، یعنی ۹ ھ میں۔

لیکن بہ ظاہر صلح حدیبیہ کو جب کفار نے توڑ ڈالا ہے، اس کے بعد اور اسی کے متعلق یہ واقعہ معلوم ہوتا ہے، اس سورہ میں صاف مسجد حرام کے پاس جو معاہدہ ہوا تھا اس کا ذکر ہے اور یہ ذکر ہے کہ:

''اس پر جب تک کفار قائم رہیں تم بھی قائم رہو۔'' (۶۰)

ظاہر ہے کہ مسجد حرام کے پاس حدیبیہ کے سوا اور کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا لیکن فتح مکہ کے وقت تمام اہل مکہ مطیع ہو گئے اور پہلا معاہدہ بالکل بے تعلق ہو گیا اور پھر کوئی دوسرا معاہدہ نہیں ہوا اس لیے اگر یہ سورہ ۹ ھ میں اتری تو اس کا تعلق کس معاہدہ سے ہوا۔'' (۶۱)

سید سلیمان ندوی کے نام ارسال کردہ خطوط میں خاصے علمی مباحث موجود ہیں ایک خط میں قرآن مجید کے دو نسخوں کا ذکر ہے علامہ نے اس کا تعارف اس طرح پیش کیا: ''قرآن مجید قلمی ہے، جس کا صرف پہلا صفحہ طلائی ہے، باقی سادہ ہے وہ حکیم مرزا مہدی کا ہے، جو نخاس جدید کے دل

کے نیچے رہتے ہیں، ان کے مکان پر سائن بورڈ لگا ہوا ہے خود ان کو جا کر دے آؤ اور رسید لے کر میرے پاس بھیج دو، نواب علی حسن خاں کا قرآن بھی طلائی ہے لیکن وہ سراپا طلائی ہے دونوں میں امتیاز کر لینا آسان ہے۔ (۶۲)

قرآنیات سے متعلق ایک مکتوب اس طرح ہے کہ جو تم نے کعبہ کی تعمیر اور ذبح کے متعلق کچھ نہیں لکھا، قرآن مجید میں "فبشرناہ بغلام حلیم" جہاں ہے اس سے ہر شخص نے حضرت اسحاق کو مراد لیا ہے، کیوں کہ بشارت کا لفظ ان ہی کے متعلق دوسرے مواقع میں آیا ہے اور اسی کے بعد یہ آیت ہے "فلما بلغ معہ السعی" اس لیے اس سے بھی حضرت اسحاق مراد ہو سکتے ہیں اس کا کیا جواب ہے؟" (۶۳)

مذکورہ سوالات اور قرآنی مباحث سے واضح ہے کہ قرآنیات کے باب میں علامہ کو اللہ نے کس قدر وسعت نظر عطا کی تھی ان سوالات کے پیچھے دو باتیں ہیں ایک تو اس کے ذریعہ تلامذہ کی تربیت مقصود تھی اور ان کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو جلا دینا مطلوب تھا، علامہ کی تصانیف اور مقالات کی روشنی میں یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ قرآنیات پر آپ کی گہری دسترس تھی۔

عربی ادب:

ہندوستان کے تمام علماء کرام میں علامہ کو اس حیثیت سے بھی انفرادیت اور اولیت حاصل ہے کہ ہندوستان میں جدید عربی ادب کے تعارف وارتقاء میں علامہ کی غیر معمولی خدمات ہیں، مکاتیب میں بہت سے قدیم اور جدید موضوعات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے، ان مکاتیب میں عربی ادب کے بعض جدید موضوعات پر جس وقت اظہار خیال کیا گیا تھا اس وقت شاید ہی کوئی ان موضوعات اور شخصیات سے واقف ہو، علامہ نے ایک خط عربی تعلیم کے حوالے سے جدید اور قدیم کا مسئلہ حل کر دیا ہے، ترکی کے تعلیمی مسائل کو دیکھنے کے بعد علامہ نے اپنے تاثرات کو مندرجہ کلمات میں قلم بند کیا۔

افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقۂ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پر تو نہیں، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے، لیکن دونوں کے حدود جدا رکھی گئی ہیں، جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی، یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا

ہے۔''(۶۴)

علامہ شبلی نعمانی ایک عظیم شخصیت کا نام ہے جنھیں علوم اسلامیہ اور عربی زبان وثقافت سے گہرا ربط تھا اور عرب شخصیات سے متعلق آپ کو وافر معلومات تھیں، عرب شخصیات میں رشید رضا ایک بڑا نام ہے، علوم ومعارف کے مختلف میدانوں میں اپنی خدمات جلیلہ کی وجہ سے معروف ومقبول ہیں، جمال الدین افغانی محمد عبدہ کے خوابوں کو حقائق کا رنگ دینے میں حد درجہ جدوجہد کی، علامہ شبلی نعمانی کو بھی ان کی علمی واسلامی فتوحات کے سبب ان سے عقیدت تھی جس کا اظہار علامہ نے اس طرح کیا:

''سید رشید رضا مصر سے روانہ ہو گئے، ۲۲/ مارچ کو بمبئی آ جائیں گے، میں نے لکھ دیا تھا، اس لیے وہ لارڈ کچز سے مل کر اور ان کی رضامندی لے کر آتے ہیں، انھیں کو جلسہ کا صدر بنانا چاہیے اور یہ میں نے ان کو لکھ بھی دیا تھا، اس بات سے جلسہ کی عظمت ہوگی، ان کے نام کی وجہ سے اکثر لوگوں نے آنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔''(۶۶)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام ایک دوسرے خط میں رشید رضا مصری کے مقام ومرتبہ کو اس طرح اجاگر کیا ''آپ کا توسط مشکلات کو حل کر دے گا، دوسرے یہ کہ سید رشید رضا کی وقعت اور موجودگی اور پریسڈنٹی سے فائدہ اٹھایا جائے اس کے لیے بھی آپ کی ضرورت ہے۔(۶۷)

علامہ کی خواہش تھی کہ بنفس نفیس بمبئی جا کر رشید رضا مصری کا پرجوش استقبال کریں لیکن جلسے کے انتظامات میں مصروفیات نے آپ کو ہلنے نہ دیا لیکن پروفیسر عبدالقادر کو لکھتے ہیں کہ ''ندوہ کے سالانہ جلسے کی شرکت کے لیے مصر کے نامور عالم سید رشید رضا مصر سے چل چکے، ۲۲/ مارچ ۱۹۱۲ء کو بمبئی پہنچ جائیں گے ممکن ہو تو آپ بھی ان کا استقبال بندرگاہ پر کیجیے۔(۶۸)

جدید عربی ادب کی ایک معروف ومشہور شخصیت قاسم امین (۱۸۶۳-۱۹-۸) کا ذکر بھی مکاتیب شبلی میں موجود ہے، قاسم امین نے اپنی دونوں تصنیف ''المرأۃ الجدیدۃ'' اور ''تحریر المرأۃ'' سے اسلامی دنیا میں ایک اضطراب پیدا کر دیا اس کی تردید اور تائید میں بے شمار مضامین اور تصانیف ترتیب دی گئیں۔ قاسم امین کے بہت سے نسائی خیالات سے اختلاف ممکن ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ عورتوں کے مسائل پر توجہ دی جائے اور انھیں از کار رفتہ ہرگز

تصور نہ کیا جائے ،مولانا نے بھی قاسم امین کی لیاقت کا اعتراف کیا ہے ،فرماتے ہیں:

''باقی تعلیم کے متعلق مصر میں جو دو رسالے لکھے گئے ہیں یعنی ''تحریر المرأۃ'' اور ''المرأۃ الجدیدۃ'' وہ نہایت آزادی اور قابلیت سے لکھے گئے ہیں تحریر المرأۃ کا جواب المرأۃ المسلمہ بھی غایت عالمانہ اور فلسفیانہ طریقہ سے لکھا گیا ،اردو میں رسالے لکھے گئے ،مثلاً حقوق نسواں وغیرہ وہ عامیانہ رسالے ہیں ،قدیم اخلاق کی کتابوں میں مثلاً اخلاق جلالی اور احیاء العلوم میں بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق جستہ جستہ باتیں ہیں۔'' (۶۹)

قاسم امین ضرور ایک آزاد خیال صاحب قلم ہے لیکن اس کی فکر انگیزی اور بلند خیالی سے انکار ممکن نہیں ،عورتوں کے بہت سے زاویوں پر سوچنے کا یہ انداز اچھوتا اور قابل تعریف ہے۔ (۷۰)

جرجی زیدان (۱۸۶۱-۱۹۱۴) ایک مصری عیسائی مصنف ہے ایک صاحب طرز ادیب، نامور صاحب قلم اور قابل ذکر محقق ہے عربی زبان کو سنوارنے اور اسے مالدار بنانے میں اس کی گراں قدر خدمات کو فراموش کرنا ممکن نہیں ،یہ کہنے میں تامل نہیں کہ تاریخ ادب عربی میں اس کی تصنیف انفرادیت کی حامل ہے ،اس نے بہت سے ان مسائل کو اٹھایا جن سے اور کتابیں خالی ہیں جرجی زیدان نے اپنی تمام تر عالمیت کے باوجود اسلام کی حقانیت کو داغدار کرنے کی پوری کوشش کی ہے جب کہ ایک محقق اور صاحب علم کا فریضہ ہے کہ سچائی کا علم بردار ہو لیکن بیشمار عیسائی مصنفین اور مستشرقین نے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت میں اسلام کو ہدف تنقید بنایا ،علامہ نے جرجی زیدان کی بعض علمی بددیانتیوں کے جوابات دیے (۷۱) جرجی زیدان نے اسلامی ثقافت و حضارت پر اعتراضات کیے تو مولانا نے ہندوستان سے اس کا عالمانہ جواب تحریر کیا ، (۷۲) یہ جواب مولانا نے عربی میں تحریر کیا تھا جو المنار میں شائع ہوا اور بعد میں اس کا ترجمہ ''الندوہ'' میں شائع ہوا جو علامہ کے مقالات میں شامل ہے۔ (۷۳) علامہ نے جرجی زیدان کی شناعت اور علمی منافقت کا انکشاف ان الفاظ میں کیا:

''تمدن اسلام کا ضرر بہت متعدی ہوا ،یہاں تک کہ ڈاکٹر ہارویز پروفیسر علی گڑھ نے اپنی تحریری رائے یونی ورسٹی میں بھیجی کہ امتحانات فاضل و عالم میں وہ داخل درس کی جائے ، مجھ پر اس کا سخت اثر ہوا اور میں نے سب کام چھوڑ کر اس کی دروغ بیانیوں پر ایک مضمون

لکھنا شروع کیا، اس وقت تک بیس صفحے ہو چکے ہیں، عربی میں لکھوں گا اور عربی اخبارات میں طبع کراؤں گا لیکن اس کا تیسرا حصہ نہیں ہے، آپ کے پاس ہو تو بھیج دیجئے۔'' (۷۴)

جرجی زیدان کے خیالات اس قدر شر انگیز اور حقائق کے برعکس تھے کہ مولانا اس کی تردید کے لیے اپنی تمام تر کاوشوں کے ساتھ اس میں منہمک ہو گئے، اس درجہ استغراق کی وجہ سے آپ کی ایک آنکھ متاثر ہو گئی، لکھتے ہیں کہ:

''تمدن کے رد میں ابتداء ایک ہفتہ میں اس قدر انہماک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اترتا محسوس ہوا اور اب اس سے حرف نظر نہیں آتے، ایک آنکھ جو صحیح ہے اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے، اب لکھنا پڑھنا بالکل کم ہو گیا ہے، اس لیے ساٹھ صفحے ہو کر رہ گئے اور اسی پر کتاب ختم کر دی۔'' (۷۵) اس کی اہمیت کی طرف یوں اشارہ کیا ''المنار میں یہ رسالہ بتدریج شائع ہوگا، خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کی آبرو مصر میں قائم رہی۔'' (۷۵)

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ مولانا نے یہ جواب عربی اور اردو، دونوں میں تحریر کیا تھا لیکن اصل تردید عربی میں ہے، یہ روح اردو میں نہ آسکی، لکھتے ہیں کہ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ طبیعت کا زور عربی میں مصروف تھا، کیوں کہ اصلی مخاطب عرب وشام تھا'' (۷۶/۱) مولانا اپنے عربی مضمون کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ ''سو صفحہ کی کتاب ہو گئی ہے اور لٹریچر بھی ایسا ہے کہ مصر والے بھی ہندوستان کو کچھ چیز سمجھیں گے۔ (۷۶/۲)

علامہ کے روم ومصر شام کے سفر کی وجہ سے بیشمار عرب اصحاب قلم، صحافی حضرات اور مدیران اخبارات سے آپ کے تعلقات استوار ہوئے، پہلی بار ہندوستان میں کثیر تعداد میں مجلّات واخبارات آنے لگے اور ان کے مضامین کے تراجم یہاں کے مجلّات واخبارات میں شائع ہونے لگے چنانچہ اپنے سفرنامہ میں بہت سے عرب مصنفین اور عربی اخبارات ومجلّات کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح جدید عربی زبان وادب کی تبدیلیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، (۷۷) اپنے مکاتیب میں بھی بعض مجلّات کا ذکر کیا ہے، رشید رضا کے مشہور مجلّہ ''المنار'' کا ذکر ان کلمات میں کیا:

''جرجی زیدان کا رد (پروف) بھیج دیا تھا، المنار نے بہت احسان مندی ظاہر کی کہ بڑا اہم کام انجام پایا جس کی یہاں کے لوگوں کی ہمت نہیں ہوتی تھی، گو میں نے انھیں

ابھارا بھی تھا۔'' (۷۸)

فرید وجدی (۷۹) (۱۹۵۴-۱۸۷۸) کے مشہور رسالہ ''الحیاۃ'' (۸۰) کے باب میں علامہ رقم طراز ہیں کہ مصر میں ایک پرچہ اسلام کے ثبوت اور فلسفہ حال کی تطبیق پر نکلا ہے اور ماہوار نکلتا ہے زور کا پرچہ ہے اور واقعی عمدہ ہے، ایڈیٹر فرنچ اور جرمن زبان کا ماہر ہے میں نے منگوایا ہے اور مسلسل آرہا ہے، ماہوار ہے لیکن صفحے کم ہوتے ہیں۔ (۸۱)

علامہ نے اپنے ایک خط میں متعدد مصری مجلات مثلاً ثمرات الفنون، (۸۲) اسلام، (۸۳) طرابلس، (۸۴) المنار، الہلال (۸۵) وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور مزید اپنے مکتوب الیہ سے مخاطب ہیں لیکن معلوم نہیں آپ کس مذاق کے طالب ہیں، اگر علمی مضامین چاہتے ہیں تو مصر کا ماہوار رسالہ المقتطف (۸۶) طلب فرمایئے اور اگر پالیٹکس وغیرہ مطلوب ہو تو قاہرہ کا اخبار ''المؤید'' (۸۷) میرے پاس جو اخبار آتے ہیں ان کو فرمایئے تو ملاحظہ کے لئے بھیج دوں۔ (۸۸)

اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ علامہ اپنے شاگرد اور ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی کے ساتھ مختلف قرآنی اور علمی مسائل و مباحث میں اشتراک کیا کرتے تھے اور انھیں اپنی برادری کا تاج تصور کرتے تھے، (۸۹) اپنے ایک مکتوب میں مولانا کے علمی تفوق کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''قرآن مجید کے شبہات کا جواب یورپ کے مقام میں تمام ہندوستان میں کوئی شخص مولوی حمید الدین پروفیسر میور کالج سے بہتر بلکہ برابر بھی نہیں کرسکتا وہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی اور علماء قدیم سے کتابیں ختم کر کے بی اے ہوئے اور ۸ برس سے قرآن مجید کی خدمت کررہے ہیں، قرآن مجید کے اشکالات پر ان کے چھ رسالے عربی زبان میں شائع ہو چکے ہیں، جن پر علماء مصر نے حیرت ظاہر کی۔ (۹۰)

علامہ نے مختلف حیثیتوں سے مختلف مقامات پر مولانا فراہی کی عبقریت اور آفاقیت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی نظیر ہندوستا کے علماء میں ملنی دشوار ہے، ایک دوسرے خط میں علامہ نے آپ کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک شکایت بھی کی، لکھتے ہیں: کہ انگریزی داں تھے، عربی داں تھے، لیکن ان سب کچھ ہونے کے ساتھ بھی کچھ نہیں، بہتیرا کہا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچہ بھی کھڑا کردو تو بہت بصیرت ہو، تم کو کس کی پرواہ ہے، حالاں کہ جو حصہ لکھ رہا ہوں اس میں

مدد دینا ایک مذہبی اور قومی کام ہے۔'' (۹۱)

علامہ نے مولانا فراہی کے متعدد تفسیری اور ادبی خدمات کا تعارف اور تبصرہ اپنی تحریروں اور الندوہ میں کرایا، (۹۲) سابقہ سطور میں آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا، آپ کی تفسیر نظام القرآن کو ایک منفرد تفسیر قرار دیا، اسی طرح مولانا فراہی کی مشہور کتاب ''جمہرۃ البلاغۃ'' کی (۹۳) اپنے مکاتیب میں دو جگہ مدح سرائی کی، ایک مکتوب میں مولانا سے مخاطب ہیں، ''بلاغت کے بعض اجزا معمولی اور سرسری ہیں ارسطو کا رد البتہ قابل قدر ہے میں الندوہ میں اس کا اقتباس (پشت پر (درج کروں گا'' (۹۴)

علامہ نے ایک مکتوب میں بلاغت اور اعتزال کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ''بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے، جاحظ، عبدالقادر جرجانی، سکاکی کا بنایا ہوا ہے، یہ سب معتزلی تھے کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں، تفسیر کشاف تمام محدثین تک پڑھتے تھے حالاں کہ اس میں اعتزال بھرا ہوا ہے۔ (۹۴)

علامہ نے ''بلاغۃ النساء'' کے عنوان سے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس میں مشہور خاتون عرب کے لکچرز جمع کیے گیے ہیں۔ (۹۴)

مولانا فراہی کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے علامہ نے ابن تیمیہ کو ایک جلیل القدر اور صحیح العقیدہ مصنف قرار دیا جب سید صاحب نے حیات مالک لکھنی شروع کی تو اس کے ردعمل میں علامہ نے مندرجہ ذیل تاثرات ظاہر کیے، تم نے شروع کر دیا تو خیر، ورنہ ابن تیمیہ کی لائف فرض اولین ہے، مجھے اس شخص کے سامنے رازی وغزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں، ان کی تصنیفات میں ہر روز نئی باتیں ملتی ہیں، بار بار دیکھنا شرط ہے، اس شخص کی رائے ہے کہ یہود و نصارا اگر اپنے مذہب پر قائم رہیں (تثلیث چھوڑ کر) اور اعمال حسنہ بجالائیں تو اسلام ان کو اجازت دیتا ہے، اس پر کافی بحث کی ہے گو اصل نتیجہ کو کسی قدر ماند کر دیا ہے، تمام قرآن مجید سے استدلال کیا ہے۔'' (۹۵).

علامہ نے اپنے مکاتیب میں عربی اشعار اور بعض شعراء کا بھی ذکر کیا ہے، اپنے ایک مکتوب میں جاہلی اشعار کے اندر کلام منحول کے وقوع پر اظہار خیال کیا اور طٰہٰ حسین نے بھی کلام منحول پر رائے زنی کی ہے، علامہ فرماتے ہیں: ''اشعار جاہلیت مدت ہوئی میری نظر میں ہیں لیکن میں نے ان پر چنداں توجہ نہیں کی، یہ اشعار ایسے ماخذوں سے جمع کیے گیے ہیں مثلاً اغانی وغیرہ جن

میں ضعاف اور موضوعات تک ہیں، البتہ ناقد خود صحیح اور موضوع کی تمیز کر سکتا ہے۔" (۹۸)

بیروت نے ایک قابل ذکر ادبی کام یہ کیا کہ "شعراء النصرانیہ" (۹۸) کے عنوان سے شائع کیا جس میں وہ شعراء بھی شامل کیے گیے جو بعد میں آغوش اسلام میں آگیے، علامہ رقم طراز ہیں "بیروت کے علماء نصارائے عرب خواہ جاہلیت کے ہوں خواہ اسلام کے ان سب کے اشعار کا ایک مجموعہ تیار کر کے چھاپنا شروع کیا ہے، ایک جلد چھپ چکی ہے، اس میں اخطل کا دیوان بھی ہے لیکن وہ مستقل تین جلدوں میں چھپ چکا ہے یہ آج تک کہیں نہیں مل سکا تھا یورپ میں بھی اس کی تلاش تھی۔" (۹۹)

عبید بن الابرص ایک جاہلی شاعر ہے، امراء القیس کے معاصرین میں اس کا شمار ہے اسے طویل عمر ملی (۱۰۰) اس کے دیوان کے باب میں مولانا فراہی کو مطلع فرما رہے ہیں کہ نہایت پر تکلف انداز میں لندن سے انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے، (۱۰۱) اسی طرح مزید ایک اور اہم شعری اطلاع اس انداز میں فراہم کرتے ہیں کہ جریر و فرزدق کے مناقضات مع شرح نہایت اہتمام سے لندن میں چھپی ہے۔" (۱۰۲)

علامہ نے "الانتقاد" میں ایک جگہ "حملت علی" استعمال کیا تو اس پر مولانا فراہی کو کلام ہوا، علامہ نے اپنی بات مدلل بنانے کے لیے، جاحظ کا ایک اقتباس نقل کیا کہ "احملنا جميع من يتكلف قرأة هذا الكتاب على مر الحق وصعوبة الجد وثقل المؤنة وحلية الوقار لم يصبر عليه مع طوله." (۱۰۳)

مستشرقین:

علامہ شبلی نعمانی گو کہ انگریزی سے واقف نہیں تھے لیکن بعض دوسرے مآخذ اور ذرائع سے انگریزی مصادر کی روح تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، اکثر مولانا فراہی سے اس مسئلہ میں دریافت کرتے مثلاً مارگولیتھ کی کتاب کی خامیوں پر کس قدر اچھی گرفت کی ہے، لکھتے ہیں "سیرت کے لیے ایشاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں، انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں ان سے کذب و افتراء کا عجیب منظر سامنے آجاتا ہے مارگولس پروفیسر آکسفورڈ سب سے بڑا عربی عالم ہے اس کی لائف آف محمد دیکھنے کے قابل ہے، لکھتا ہے کہ عبدالمطلب مطلب

کے غلام تھے اور کعبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف سو برس پہلے کی عمارت تھی ، (۱۰۵) وغیرہ وغیرہ کام ہورہا ہے ، سیرت کی مآخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں ابن ہشام ، ابن سعد ، طبری ، ان کے تمام رواۃ کا استقصاء کر کے ان کا اسماء الرجال تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں کہ روایتوں کے انتقاد میں آسانی ہو۔'' (۱۰۶)

علامہ نے ایک طرف جہاں مارگولیتھ پر تنقید کی وہیں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں زبردست علمی رہنمائی بھی کی اور کئی عربی سیرتی لٹریچر کا ذکر بھی کیا ، علامہ کو ان انگریزی کتابوں کی خصوصی تلاش ہوتی جو عربی یا اردو میں منتقل کی جاتیں علامہ کی تصانیف اور مکاتیب دونوں سے مترشح ہے کہ مآخذ ومراجع کی تلاش میں مستقل سرگرداں رہتے ، یہی علمی اضطراب واشتیاق انسان کو اہل علم بنادیتا ہے ، ایک دوسرے خط میں مارگیولیوس کے متعلق مزید اظہار خیال یوں کرتے ہیں کہ '' مارگیولیوس کا پایہ جرجی زیدان سے بہت بلند ہے ، وہ اس مکار کا خوشہ چیں نہیں ، اس کی وسعتِ نظر بے انتہا ہے ، اگرچہ اسی کے ساتھ سخت بددیانت اور غلط نتائج نکالنے والا ہے ، میں نے اس کی کتاب کا پورا ترجمہ کرالیا ہے ، میور کے مآخذ بالکل ضعیف وناقابل اعتماد ہیں ۔ (۱۰۸)

علامہ کے علمی استحضار کا یہ حال ہے کہ مارگیولیوس کی حقیقت بتانے کے ساتھ ساتھ جرجی زیدان اور میور کے حقائق کو منظر عام پر لانے کی کس قدر خوبصورت کوشش کی ہے ، یہ وہی میور ہیں جن کی علمی اور تحقیقی بددیانتیوں کو دیکھ کر سرسید کا دل کباب ہوگیا تھا اور اس کی کتاب Life of Mohammad کا نہایت مستند ومدلل جواب خطبات احمدیہ کے نام سے ترتیب دیا ، علامہ مستشرقین کی عبارتوں اور مکاریوں پر نگاہ رکھے رہتے ، مشہور مستشرق کارلائل کی کتاب The Hero As Prophet کے متعلق رقم طراز ہیں '' کارلائل کی کتاب کا ترجمہ ہوگیا ، اچھا ترجمہ کیا ہے میرے کام کی چیز ہے ۔'' (۱۱۰)

علامہ کو مولانا فراہی کی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کی مدد سے بہت سے انگریزی مصادر سے آگاہی ہوئی اور بہت سے تراجم بھی کراتے مثلاً ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں '' نولدیکی کا مضمون متعلق قرآن شریف آپ نے ناتمام چھوڑ دیا ، پورا کر کے بھیج دیجیے ، انگریزی کتابوں میں ایک کتاب قرآن مجید تاریخی ترتیب پر ہے اس کا یا اس کے اقتباسات کا ترجمہ ارسال فرمائیے ۔'' (۱۱۱)

ایک خط میں اسپنسر (۱۱۴) کی کتاب کے شائع ہونے کی خبر دی ہے اور ایک خط میں کئی مستشرقین کے ذکر کے ساتھ قدرے ان کا تعارف بھی پیش کیا مثلاً لکھتے ہیں کہ انگریزی ترجمہ کے لیے دو شخص مستقل ملازم تھے، ایک بی اے اور ایک انٹر گریجویٹ، مارگیولیوس کی لائف آف محمد کا پورا ترجمہ اور سر ولیم میور اور نولدیکی جرمنی کا آرٹیکل قرآن مجید مندرجہ انسائیکلوپیڈیا اور باسورتھ ایم اے اور میکڈانلڈ وغیرہ کے اقتباسات کا ترجمہ ہوا، نولدیکی جرمن کا بہت بڑا عربی داں عالم ہے اس کے آرٹکل کا پورا ترجمہ کیا گیا۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی (۱۱۵) عربی کا بہت بڑا ماہر تھا، اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری ۳ ضخیم جلدوں میں لکھی ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کا کوئی سامان نہیں۔

آپ پہلے یہ دریافت فرما کر لکھیں کہ وہاں اسلام اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح کے متعلق کیا کیا باتیں ہیں، جرمن و فرنچ کے ترجمہ کا کیا بندوبست ہوگا، فرنچ میں دوزی بڑا عربی داں گزرا ہے، اس نے عربی لغت پر جو اضافہ کیا ہے وہ عجیب وغریب چیز ہے اور میرے پاس ہے۔ (۱۱۶)

علامہ کے مذکورہ کلمات سے یہ مبرہن ہے کہ مختلف زمانوں کے مستشرقین کے علمی اور اسلامی خدمات، ان کے مبلغ علم، دسترس، تحقیقی نقائص سے کس قدر واقف تھے اور ان کی عربی زبان وادب سے متعلقہ کامیابیوں پر مولانا کی نظر تھی، وہ تراجم کے توسط سے ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کی ممکن کوشش کرتے۔

علامہ کے مختلف خطوط سے واضح ہے کہ عربی زبان وادب، قرآنیات، اسلامیات اور استشراق پر ناقابل تصور وسعت نظر کے حامل تھے آپ کے مقالات اور تصانیف سے یہ شہادت ملتی ہے کہ پورا عربی اور اسلامی ذخیرہ آپ کی نظر میں تھا لیکن آپ کی عربی دانی کا ایک بین ثبوت آپ کے عربی خطوط تھے جو بیشمار مصنفین ادباء شعراء اور محققین کو تحریر کیے گیے لیکن افسوس کہ اس کا حصول ممکن نہ تھا، اگر یہ خطوط مل جاتے تو ارباب علم کے سامنے بہت سے نوادرات منظر عام پر آتے اور عربی ادب نیز عرب ادباء کی بہت سی جہتوں کی دریافت ہوتی نیز عربی انشاء پردازی میں ایک اضافہ بھی، سید صاحب نے علامہ کے تین خطوط نقل کیے جن سے آپ کے عربی اسلوب نگارش

کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے یہاں ایک خط سرسید احمد خاں کے انتقال سے متعلق ہے نقل کیا جارہا ہے۔

نمی دانم حدیث نامہ چوں است ☆ ہمیں دانم کہ عنوانش بہ خون است

تزعزت ارکان الملة!

اعـنـى انتقل السيد أحمد خان بهادر الى جوار رحمة ربه وذلك يوما لأحد ۲۷ مارس وتفرق شملنا انى لااقدر على أن اشتغل بشيئى الا بعد برهة من الزمان" (۱۱۷)

عربی زبان وادب کے حوالے سے مکاتیب شبلی کی غیر معمولی اہمیت ہے بلکہ عربی مصادر ومراجع کی رو سے اسے دنیائے مکاتیب میں اولیت حاصل ہے، آج کے عہد جدید میں بھی عربی اسکالر اور محققین ومصنفین کے نزدیک ان خطوط کی بے پناہ افادیت ہے، ان میں نہ صرف عرب ادباء، ومحققین بلکہ عرب وعجم کے اہل قلم اور مستشرقین کا جائزہ ملتا ہے، نیز ان کی تصانیف کے محاسن ومعائب کا تذکرہ بھی، اسی طرح یہ خطوط قرآنیات کے بہت سے مباحث ومسائل کو سمیٹے ہوئے ہیں، نیز مولانا حمید الدین فراہی کو قرآنیات پر کس حد تک عبور تھا اس کی شہادت ملتی ہے، قرآنیات کے ماسوا مولانا فراہی کے بعض دیگر علمی گوشوں تک رہنمائی ہوتی ہے کہ انگریزی زبان اور بلاغت پر عبور حاصل تھا، قرآن کو ایک مدلل اور مستند صورت میں پیش کرنے کا سہرا مولانا کے سر جاتا ہے۔

ان مکاتیب کا جدید عربی زبان وادب کے تعارف وتبصرہ میں نمایاں رول ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب ہندوستانی مکاتیب فکر جدید عربی ادب کے شعراء اور اہل قلم سے یکسر نا آشنا تھے، رشید رضا، قاسم امین، فرید وجدی اور جرجی زیدان کی اصوات وافکار سے بے بہرہ تھے، علامہ نے لجنۃ الادب، سفر نامہ روم ومصر وشام، ندوۃ العلماء، اپنے تلامذہ اور اپنے مکاتیب کے توسط سے ہندوستان میں جدید عربی ادب کا رشتہ استوار کیا، علامہ کے سفر نامہ اور مکاتیب کے حوالے سے بیشمار مصری اخبارات ومجلات سے ہندوستانی شائقین علم باخبر ہوئے، جدید عربی زبان وادب کے تناظر میں علامہ نے فرمایا کہ اگر ہندوستانی علماء کرام نے خود کو جدید عربی ادب سے ہم آہنگ نہ کیا تو ہمارا رشتہ عربوں سے منقطع ہو جائے گا۔ (۱۱۸)

خدا کا شکر ہے کہ علامہ کی جدید عربی ادب کے تئیں یہ ریاضتیں ثمر بار ہوئیں آج ہندوستانی جامعات اور مدارس میں خصوصی توجہ دی جارہی ہے کیوں کہ عالمی معیشت سے اس کا گہرا رشتہ ہے، جدید عربی کی ترویج واشاعت میں علامہ کی مخلصانہ کاوشیں آج بھی یہ پیغام دے رہی ہیں کہ اگر جدید عربی زبان وادب سے رشتہ استوار نہ کیا گیا تو ہم عالمی معیشت اور علوم ومعارف کی ایک وسیع وعریض دنیا سے لاتعلق ہوجائیں گے۔

حواشی:

(۱) وضاحت کے لیے دیکھیے: عرب وہند کے تعلقات، مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء، (صفحات: ۱۰۴) نیز دیکھیے رجال السند والہند الی القرن السابع القاضی ابوالعالی اطہر المبارک پور، المطبعۃ الحجازیۃ، بومبائی، الہند، ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء، (صفحات: ۳۲۸)

(۲) وضاحت کے لیے دیکھیے: اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، مولانا حکیم سید عبدالحئی (ترجمہ: مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی) مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۷۰ء، (صفحات: ۴۶۸) نیز دیکھیے: المسلمون فی الہند، اجنتا آفسٹ اینڈ پیکجنگس لمیٹیڈ، دہلی (بدون التاریخ) (صفحات: ۱۱۵)

(۳) اساطین عربی زبان وادب، ابوسفیان اصلاحی، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی انڈیا، ۲۰۰۳ء، ص ۵۸-۲۱۔

(۴) سفرنامۂ روم ومصروشام، علامہ شبلی نعمانی مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء ص ۲۳۲، نیز دیکھیے، ایضاً ص ۲۰۴-۲۰۰

(۵) مکاتیب شبلی، ۳۱۲/۱

(۶) مکاتیب شبلی، ۱۲/۱

(۷) زیلعی کی کتاب کا عنوان: ''نصب الرایۃ لاحادیث الہدایۃ'' ہے اور یہ کتاب ''المجلس العلمی'' ڈابھیل سورت سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۸) ایضاً، ۴۸/۱

(۹) ایضاً، ۳/۱

(۱۰) ایضاً،۱/۱۱۴

(۱۱) ایضاً،۱/۱۱۷

(۱۲) ایضاً،۱/۱۱۸-۱۱۷

(۱۳) ایضاً،۱/۱۱۹

(۱۴) ایضاً،۱/۱۲۰، نیز دیکھیے: ایضاً،۱/۱۲۵

(۱۵) مکاتیب شبلی،۱/۱۲۰

(۱۶) ایضاً،۱/۱۲۴

(۱۷) وضاحت کے لیے دیکھیے: فرید وجدی اور ان کے افکار، ابوسفیان اصلاحی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹۴ء، ۱۵۳/۲ص ۱۲۵-۱۰۹، مارچ،۱۵۳/۳ ص ۱۸۹-۱۸۰

(۱۸) وضاحت کے لیے دیکھیے: مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) مطبع معارف اعظم گڑھ، طبع دوم، ۵/۹۱-۶۲

(۱۹) المرأۃ المسلمۃ کا تعارف، ڈاکٹر جاوید احمد خان نے اپنی غیر مطبوعہ تھیسس ''مساہمۃ محمد فرید وجدی فی الادب العربی الحدیث'' میں کیا ہے، اس کے علاوہ اس موضوع پر سطوت ریحانہ کی کتاب ''مصر میں آزادیٔ نسواں کی تحریک اور جدید عربی ادب پر اس کے اثرات'' لائق مطالعہ ہے۔

(۲۰) مولانا آزاد نے فرید وجدی کی کتاب کا نچوڑ ''عورتوں کی آزادی اور فرائض'' کے عنوان سے پیش کیا ہے جو ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲۱) مکاتیب شبلی،۱/۱۲۶

(۲۲) ''الخصائص'' دو جلدوں میں ہے، اسے محمد علی النجار نے ایڈٹ کیا ہے اور اس پر ستر صفحات کا مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں ابوالفتح عثمان بن جنی کے مقام و مرتبہ سے بحث کی گئی ہے، یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں دارالکتب المصریہ سے شائع ہوئی۔

(۲۳) مکاتیب شبلی،۱/۱۳۹

(۲۴) ''الیاذہ ہومیروس'' کا منظوم ترجمہ سلیمان البستانی (۱۸۵۶-۱۹۲۵ء) نے کیا ہے، اور اسے اپنے والد محترم خطار سلوم نادر البستانی کے نام انتساب کیا ہے، ابتداء میں ہومر کا ایک مستند سوانحی خاکہ ہے اس کے علاوہ سلیمان البستانی نے عبرۃ وذکریٰ، تاریخ العرب، الاختزال العربی وغیرہ ترتیب دیا ہے،

''دائرۃ المعارف'' کی ترتیب میں بھی آپ کی مدد شامل رہی ہے (الاعلام، ۳/۱۴۴)

(۲۵) مکاتیب شبلی، ۱/۱۷۹

(۲۶) یہ کتاب ۱۳۲۷ھ میں مطبع الشعب سے اور ۱۹۲۱ء میں مطبع الرحمانیہ سے شائع ہوئی، ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے (معجم المطبوعات، یوسف الیاس سرکیس، مطبعہ سرکیس، مصر، ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء، ص ۱۴۳۷)

(۲۷) ایضاً، ۱/۲۴۱

(۲۸) ایضاً، ۱/۲۴۱

(۲۹) ایضاً، ۱/۲۴۴، اس کتاب کے مصنف کا نام فواز ہے جو مصری ہیں لیکن ولادت شام میں ہوئی، ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا، آپ کی ایک کتاب کا عنوان ''الرسائل الزینبیۃ'' ہے جو مقالات پر مشتمل ہے (معجم المطبوعات، ۱/۹۸۹)

(۳۰) ''کتاب الانساب'' علامہ امتیاز علی عرشی کا ایک قابل قدر مقالہ ہے، دیکھیے: روئداد ادارہ معارف اسلامیہ (اجلاس دوم) منعقدہ لاہور، ۱۰، ۱۱، ۱۲/ اپریل ۱۹۳۶ء، مجلس عاملہ ادارہ معارف اسلامیہ، لاہور، ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء، ص ۱۸۴-۱۳۳

(۳۱) مکاتیب شبلی، ۱/۲۰۵

(۳۲) مکاتیب شبلی، (مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی) مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء، ۲/۱۵

(۳۳) یہ جیکسن کی کتاب ہے جو بیروت سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی، ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے (معجم المطبوعات، ص ۷۰۲)

(۳۴) مکاتیب شبلی، ۲/۲۰

(۳۵) ایضاً، ۲/۲۰

(۳۶) ایضاً، ۲/۷۵

(۳۷) ایضاً، ۲/۷۵

(۳۸) ایضاً، ۲/۸۴-۸۵

(۳۹) ابن ہشام کی حیات وخدمات کے لیے الروض الانف، وفیات الاعیان، البدایۃ والنہایۃ، انباہ الرواۃ، شرح السیرۃ وغیرہ دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۴۰) مکاتیب شبلی، ۲/ ۸۵

(۴۱) ایضاً، ۲/ ۹۷

(۴۲) ایضاً، ۲/ ۱۱۱

(۴۳) ایضاً، ۲/ ۱۱۱

(۴۴) ابن حجر عسقلانی کی یہ کتاب ۶ جلدوں پر مشتمل ہے جو داراحیاء التراث سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۴۵) مکاتیب شبلی، ۲/ ۱۴۴-۱۴۵

(۴۶) ایضاً، ۲/ ۱۴۵

(۴۷) ایضاً، ۱/ ۲۳۸

(۴۸) ایضاً، ۱/ ۲۵۱

(۴۹) ایضاً، ۲/ ۱۱-۱۲

(۵۰) جاحظ کی اس کتاب کے لیے دیکھیے: نظم قرآن: جاحظ کی ایک غیر معروف تصنیف کا تعارف، سکندر علی اصلاحی، جنوری-دسمبر ۱۹۹۴ء، ۹/ ۱-۲، ص: ۷-۵۵

(۵۱) مکاتیب شبلی، ۲/ ۱۲

(۵۲) ایضاً، ۲/ ۱۴

(۵۳) ایضاً، ۲/ ۱۵

(۵۴) ایضاً، ۲/ ۲۰

(۵۵) ایضاً، ۲/ ۳۷

(۵۶) ایضاً، ۲/ ۴۰

(۵۷) ایضاً، ۲/ ۴۰

(۵۸) ایضاً، ۲/ ۴۲، نیز دیکھیے: ایضاً، ۲/ ۵۰

(۵۹) ایضاً، ۲/ ۴۳

(۶۰) ایضاً، ۲/ ۴۵

(۶۱) ایضاً، ۲/ ۵۲

(۶۲) ایضاً، ۲/ ۵۸

(۶۳) ایضاً،۲/ ۸۷

(۶۴) ایضاً،۲/ ۴

(۶۵) وضاحت کے لیے دیکھیے: مصر میں مقالہ نگاری کا ارتقاء، ابوسفیان اصلاحی، اشاعت اول، ۱۹۹۸ء، لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ، ص ۱۰۵-۹۵

(۶۶) مکاتیب شبلی،۱/ ۱۹۸

(۶۷) ایضاً،۱/ ۱۹۹

(۶۸) ایضاً،۱/ ۲۲۸

(۶۹) ایضاً،۱/ ۲۳۴

(۷۰) قاسم امین کے سلسلے میں دیکھیے: قاسم امین، ماہر حسن فہمی، مطبعۃ الموسسۃ المصریۃ، مصر، القاہرۃ، (صفحات: ۲۳۷)

(۷۱) دیکھیے: الانتقاد علی کتاب التمدن الاسلامی، الشیخ الاستاذ شبلی النعمانی الہندی، مطبع آسی پریس، لکھنؤ ۱۹۱۲ء (صفحات: ۸۲)

(۷۲) دیکھیے: الندوہ، جلد ۸

(۷۳) مقالات شبلی، (مرتبہ سید سلیمان ندوی)

(۷۴) مکاتیب شبلی،۱/ ۲۸

(۷۵) ایضاً،۱/ ۲۸۲، ایضاً،۲/ ۱۸۹

(۷۶) ایضاً،۱/ ۱۹۴، ایضاً ص،۲/ ۲۲۷

(۷۷) سفرنامہ روم ومصروشام، مولانا شبلی نعمانی (باہتمام مسعود علی ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء، ص ۲۴۲-۲۴۳

(۷۸) مکاتیب شبلی،۱/ ۱۹۶

(۷۹) دیکھیے: الاعلام، خیرالدین الزرکلی، دارالعلم الملایین، الطبعۃ التاسعۃ، ۱۹۹۰ء، ۶/ ۳۲۹

(۸۰) سویت نے اس مجلّہ کو جاری کیا تھا۔

(۸۱) مکاتیب شبلی،۱/ ۱۴۱

(۸۲) عربی اخبارات ومجلات کے لیے دیکھیے: الصحافۃ العربیۃ نشأتہا وتطورہا، ادیب مروہ، طبع اول، مکتبۃ

الحیاۃ، بیروت ۱۹۱۶ء، ص ۴۳۶-۴۴۷

(۸۳) ایضاً۔ (۸۴) ایضاً۔ (۸۵) ایضاً

(۸۶) عربی صحافت کی ارتقاء کے لیے، دیکھیے: تاریخ الصحافۃ العربیۃ، محمد صالح، سمیع ابو مغلی، دار المکاتب العربی (بدون التاریخ)

(۸۷) ''المؤید'' کے ایڈیٹر شیخ علی یوسف اور شیخ علی ماضی تھے، اس کا اجراء ۱۸۸۹ء میں ہوا تھا۔

(۸۸) مکاتیب شبلی، ۲/ ۱۸۱

(۸۹) مکاتیب شبلی (باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی) طبع دوم، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء، ۲/ ۱۶

(۹۰) مکاتیب شبلی، ۱/ ۲۵۰-۲۵۱

(۹۱) ایضاً، ۲/ ۱۰-۱۱

(۹۲) وضاحت کے لیے دیکھیے: مقالات شبلی (مرتبہ: سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء طبع دوم، ص ۲۸-۱۳

(۹۳) جمہرۃ البلاغۃ پر دیکھیے: مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات ''جمہرۃ البلاغۃ'' کی روشنی میں، علامہ حمید الدین فراہی: حیات و افکار، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص ۵۴۶-۵۳۳

(۹۴) مکاتیب شبلی، ۲/ ۲۰، ۲/ ۹۴، ایضاً، ۱/ ۳۰۶، ۱۳/ ۹۴، ایضاً ۱/ ۲۴۱

(۹۵) ایضاً، ۲/ ۱۱۵-۱۱۶

(۹۶) وضاحت کے لیے دیکھیے: الادب الجاہلی، طٰہٰ حسین (مترجم: محمد رضا انصاری) طبع اول، ۱۹۴۶ء، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ص ۲۹۰-۱۸۸

(۹۷) مکاتیب شبلی، ۲/ ۱۱

(۹۸) شعراء النصرانیۃ، دو جلدوں میں ۱۸۹۰ء کے اندر ''مطبعۃ الأدباء المرسلین والیسوعیین'' (بیروت) سے شائع ہوئی۔

(۹۹) مکاتیب شبلی، ۱/ ۲

(۱۰۰) وضاحت کے لیے دیکھیے، الاعلام، الزرکلی، الطبعۃ التاسعۃ، نومبر ۱۹۹۰ء، بیروت، لبنان، ۴/ ۱۸۸

(۱۰۱) مکاتیب شبلی، ۲/ ۱۱۱

(۱۰۲) ایضاً،۲/۴۸

(۱۰۳) ایضاً،۲/۳۵

(۱۰۴) کتاب الحیوان،

(۱۰۵) اس سلسلے میں مارغلیوث کی کتاب:"Arabic Historian" میں بیشمار خامیاں موجود ہیں، یہ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے

(۱۰۶) مکاتیب شبلی،۱/۲۰۰-۲۰۱

(۱۰۷) میور کی کتاب "Life of Mohammad" کا جواب سر سید احمد خان نے "خطبات احمدیہ" کے عنوان سے دیا ہے، اس کی ترتیب کے لیے سرسید نے اپنی بیگم کے زیورات تک فروخت کردیے۔

(۱۰۸) مکاتیب شبلی،۱/۲۹۰

(۱۰۹) یہ کتاب ممبئی سے شائع ہوئی ہے، ۵۳۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ اس کی دوسری کتاب سیرت کے موضوع پر "محمد اینڈ محمڈنزم" ہے۔

(۱۱۰) مکاتیب شبلی،۱/۳۰۱

(۱۱۱) ایضاً،۲/۳۰۱

(۱۱۲) مستشرقین کے تعارف کے لیے دیکھیے: نجیب العقیقی کی مشہور کتاب "المستشرقون" جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے "اسلام اور مستشرقین" پر ہونے والے سیمنار میں پیش کردہ مقالات کو "اسلام اور مستشرقین" کے عنوان سے شائع کیا ہے، جسے صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے ترتیب دیا ہے۔

(۱۱۳) ایضاً (۱۱۴) ایضاً

(۱۱۵) ایضاً

(۱۱۶) مکاتیب شبلی،۱/۳۱۴

(۱۱۷) ایضاً،۲/۱۱۶

☆☆☆

عصرِ رواں میں شبلی کی معنویت

ڈاکٹر سید عبدالباری☆

علامہ شبلی نعمانی کو رخصت ہوئے قریب قریب ایک صدی کا عرصہ گزرنے کو آیا لیکن یہ عجیب شخصیت تھی جو اپنے حیات بخش افکار و خیالات کے ذریعہ نئی صدی میں بھی ایشیا میں امن واتحاد کے لیے کام کرنے والوں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے آرزومند افراد اور اداروں کے لیے سرچشمہ توانائی بنی ہوئی ہے، انھوں نے انیسویں صدی کے آخری عشروں میں جب کہ ہندوستان انگریزوں کا غلام ہو چکا تھا اور مغرب سے ذہنی وفکری مرعوبیت کی سیاہی ہر طرف پھیلتی جارہی تھی اپنی تحریروں سے پوری قوم کو جھنجھوڑ دیا اور ذہنی مرعوبیت کے دلدل سے نئی نسلوں کو نجات دلانے کی کوشش کی، یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ اس وقت جب کہ کارلائل، آرنلڈ، ہکسلے وغیرہ کے حوالوں کے بغیر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک کوئی بات معتبر نہ تھی، شبلی نے مسلمانوں کے اندر تاریخی شعور بیدار کیا، وہ تاریخی شعور جسے مغرب نے مسلسل ان کی تاریخ وتہذیب کو داغدار بنا کر ان کے اپنے ماضی پر اعتماد کو کھرچنے کی مسلسل کاوشیں کی تھیں، اس وقت سرسید اور ان کے رفقا چراغ علی، ذکاء اللہ وغیرہ مغرب پر مشرق کی برتری کی بات زبان پر لانا تو درکنار اس رخ پر سوچنا بھی لاحاصل تصور کرتے تھے، شبلی نے انگریزی علوم وفنون اور تہذیبی رنگ وروغن سے مرعوبیت کا بیت عنکبوت اپنے قلم کی جنبشوں سے پارہ پارہ کردیا، شبلی کے اندر غیر معمولی بے باکی وجرأت تھی، اہل یورپ نے مسلم سلاطین، علوم اسلامیہ اور پیغمبر اسلام واصحاب رسولؐ کے اندر عیوب نکال کر ان کی صورت مسخ کرنے کی بھرپور کوششیں کی تھیں، مسلمانوں کی اس وقت کی نسل خود اپنی

☆ ایڈیٹر ماہنامہ پیش رفت دہلی۔

تاریخ پر شرمانے لگی تھی اور خود اپنے اسلاف پر حقارت کی نگاہ ڈالنے لگی تھی، اس احساس کمتری کے جھاڑ جھنکاڑ کو علامہ نے صاف کردیا اور یورپ کی علمی بالادستی کے رعب داب کا پردہ چاک کردیا۔ مستشرقین کے حوالوں کی کمزوری اور غلطی کو چن چن کر تلاش کیا اور اُسے دنیا کے علم ودانش کے سامنے رکھ دیا، اسی روایت کو یعنی جدید تمدن کی مصنوعی چمک دمک سے نجات دلانے اور اپنی اقدار اور روایات پر اعتماد بحال کرانے کی کوشش شبلی کے بعد علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دارالمصنفین میں شبلی کے جانشیں علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہ نے جاری رکھی، اور صاف صاف یہ آواز بلند کی۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی ☆ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

شبلی کا یہی تیور آج بھی نئی صدی میں خود دار و ہوشمند اہل قلم کو توانائی عطا کر رہا ہے جو مغرب کے استعماری عزائم اور اس تہذیب کے فتنہ وفساد اور ذہنی آوارگی اور انسانیت عامہ کی توہین کی کاوشوں سے بیزار ہیں۔

شبلی ایک بیدار مغز اور باخبر انسان تھے وہ جس دور میں پیدا ہوئے تھے وہ ہندوستان بلکہ ایشیا کی غلامی کا عہد تھا، ترکی کی حکومت ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ رہی تھی، ہندوستان میں مغربی مستعمرین کا سیاسی تہذیبی شکنجہ لوگوں کو بے دست وپا بنائے ہوئے تھا، اس عہد میں خالص طبقہ علماء سے تعلق رکھنے والا یہ دلیر انسان اپنی قوم اور ملت کو سیاسی اعتبار سے بیدار ہونے اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا پیغام دے رہا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

> سیاست کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا تاہم وہ سیاست کے ہمیشہ دلدادہ رہے لیکن ان کی سیاسیات کا یہ رتبہ بھی حقیقت میں ان کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جز ہے یعنی اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم وفنون سے جو شیفتگی تھی اس کا فطری اقتضا یہ ہونا چاہیے کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ہو اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے تھے اس کو مجسم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ہو، یہی ان کی سیاست تھی۔" (شیخ عطاء اللہ مقالات یوم شبلی، شبلی ایک چین اسلامسٹ، اردو مرکز لاہور ۱۹۶۱)

ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لیے سراپا سپاس تھے دوسری طرف یورپ کی دست بُرد سے ہمہ تن فریاد۔ شبلی جہاں ملکی سطح پر ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے وہیں عالمی سطح پر ملت کی نشأۃ ثانیہ کے آرزو مند اور بین اسلام کے حامی، ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے بعد یورپ کے مظالم کو دیکھ کر وہ مغرب سے جو حسن ظن رکھتے تھے وہ بھی ختم ہوگیا، اسی زمانہ میں انھوں نے اپنی مشہور نظم ''شہر آشوب اسلام'' لکھی جس میں وہ فریاد کناں ہیں۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو ☆ یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی ☆ دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم ☆ مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک
زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے ☆ عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

آج تقریباً سو سال بعد بھی یہ اشعار ہمارے دل کی آواز ہیں کہ آج بھی ہم امریکہ کی، چیرہ دستیوں کے خوفناک مناظر مشرق وسطیٰ میں دیکھ رہے ہیں۔ وقار عظیم کے الفاظ میں ''یہ آواز ایک صاحب بصیرت مورخ کی بھی ہے ایک حق پسند سیاسی مبصر کی بھی اور ایک بے باک شاعر کی بھی جس نے تاریخ اور سیاست کے حقائق کو شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے اور شاعر کو مصلحت کی راہ چھوڑ کر حق گوئی کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔'' مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شبلی کے اس کارنامے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے:

> ''مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے حصہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے الہلال کی نظموں اور مسلم گزٹ کے مضامین کے ذریعہ برطانیہ کی وفاداری کی پالیسی اور مسلمانوں کی کمزور سیاست پر سخت تنقید کی اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن کو متاثر کیا (ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات لکھنؤ ۱۹۶۱ء ص ۱۷۳)

شبلی نے ۱۹۱۲ء میں نہایت بصیرت افروز طویل مضمون بعنوان ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' تحریر کیا جو قسط وار مسلم گزٹ لکھنؤ میں شائع ہوا اور جس کی پانچویں اور آخری قسط ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی، اس مضمون کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو سیاست میں شریک

ہونے کی تحریک دی اور سیاست میں عدم شرکت کی پالیسی پر تنقید کی، وہ سرسید کے سیاسی نظریہ کے خلاف تھے جو منفی انداز کا تھا اور جو برطانیہ کو خوش رکھنے پر مرکوز تھا۔

شبلی کو اس پر افسوس تھا کہ یہ الفاظ یعنی ابھی وقت نہیں آیا ہے ابھی ہم کو پولیٹکس کے قابل بننا ہے اس قدر دہرائے گئے تھے کہ قوم کی رگ و پے میں سرایت کر گئے، ہر مسلمان بچہ ان خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رکھتا ہے، شبلی کے نزدیک ''اس سیاسی رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام جماعت میں جب پالیٹکس کا نام آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نوجوان تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دہراتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدوجہد، سعی، کوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس کے لحاظ سے سناٹا چھا گیا۔'' (مسلمانوں کی سیاسی کروٹ، مقالات شبلی جلد ۸ قومی و اخباری مضامین کا مجموعہ معارف پریس ص ۱۵۸)

شبلی ایک مفکر و مجتہد تھے وہ پرانی لکیر پر پیٹنے کے قائل نہ تھے اور نئے حالات کے مطابق نئی اسٹریٹجی بنانا ضروری سمجھتے تھے چنانچہ سرسید سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ''کیا ہماری تمام عقل و سمجھ، دل و دماغ تجربہ و مشاہدہ، جذبات و احساسات سب اس لیے بیکار ہو جانا چاہیے کہ کسی ریفارمر نے کسی زمانہ میں ہمیں اس قسم کی تعلیم دی تھی۔''

علامہ شبلی نے ۱۹۰۹ء میں یہ ریفارم اسکیم سامنے آئی تو اس سے اختلاف ظاہر کیا، اس اسکیم کے تحت مردم شماری کی نسبت پر مسلمانوں کی تعداد کونسل میں کچھ زیادہ معین کرنے کی بات کہی گئی تھی، شبلی کے خیال میں اس ترمیم کے باوجود مسلمان مائنارٹی میں رہیں گے، شبلی کے خیال میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ملک کے مستقبل کی تعمیر میں ان کا قائدانہ کردار ہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے، اس طرح مسلمان مائنارٹی ہونے کے باوجود اپنی قدر و قیمت تسلیم کرا سکتے ہیں، انھیں علیگڑھ سے شکوہ تھا کہ اس نے جہاں مولانا محمد علی جوہر، سجاد حیدر یلدرم اور ظفر علی خاں جیسے صحافی، انشا پرداز اور دلیر افراد کو جنم دیا وہیں بدرالدین طیب جی و سید علی امام جیسے سیاستدانوں کو منظر عام پر نہ لا سکا، شبلی کے خیال میں جسم کے جس حصہ کو استعمال نہیں کیا جاتا وہ ناکارہ ہو جاتا ہے، انھوں نے سرسید کے اس خدشہ کو غلط ثابت کیا کہ اگر کوئی مسلمان کونسل میں کام کرنے کا اہل نکل بھی آئے تو اس

سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے کلکتہ اور شملہ میں قیام کر سکے گا، وہ لکھتے ہیں کہ کاش آج سرسید زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ ایک مسلمان نہیں کئی اور کئی سے بھی زیادہ کلکتہ اور شملہ کا سفر کرتے ہیں اور ہفتوں وہاں موجود رہتے ہیں اور ہر قسم کے مصارف برداشت کرتے ہیں۔" (مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ ص ۱۶۸)

شبلی انسانیت کی ادنیٰ واشراف میں تقسیم کے بھی مخالف تھے اور اسلام کے انسانی مساوات کے اصول پر ایمان رکھتے تھے، انھوں نے جاگیردارانہ طرز فکر کو اسلامی روایات کے خلاف قرار دیا اور نئے عہد میں اسے بدلنے پر زور دیا، انھوں نے سرسید کے اس خدشہ پر کہ اگر حکومت نے مقابلہ کا امتحان ہندوستان میں رائج کر دیا تو یہاں ادنیٰ درجے کے لوگ اشراف پر حکومت کریں گے طنز کیا کہ "اس وقت تمام چھوٹی ذاتوں کے لوگ اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے ہیں اور بڑے بڑے تیس مار خانوں اور نسل تیمور اور آل ہاشم نے ان کے آگے گردنیں جھکا دیں۔" (ص ۱۶۸)

جناب مظہر مہدی کے الفاظ میں شبلی نے سرسید کی سیاست کو بدلے ہوئے حالات میں فرسودہ قرار دیا اس لیے کہ جو شمع رات کے وقت جلائی جائے وہ دن میں رہنمائی نہیں کر سکتی اگرچہ وہ سرسید کی دلیری کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ شبلی مسلم لیگ کی سیاست کو بیکار چیز سمجھتے تھے اس لیے کہ ان کی نظریاتی بنیادیں شملہ ڈیپوٹیشن کی سیاسی فہم پر تھیں جس کا مقصد یہ تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے اپنی تیس سالہ سیاسی جدوجہد سے حاصل کیے ہیں اس میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے، شبلی نے اس کیفیت کو اپنی نظم کفران نعمت کے ان اشعار میں پیش کیا ہے۔ جس میں کانگریس کو شیر سے اور لیگ کو لومڑی سے تشبیہ دی ہے، شبلی نے لیگ کو متوجہ کیا کہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے جن پر ملک کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہے مثلاً کاشت کاروں اور غریب کسانوں کا مسئلہ۔ لیکن وہ بڑے تعلقہ داروں اور زمین داروں سے مربوط تھی اس لیے اس طرف توجہ نہ کی گئی۔ نوآبادیاتی نظام کی مضرتوں پر ان لوگوں کی نگاہ نہ تھی، دوسری طرف کاشت کاروں اور غریب کسانوں کے احوال پر شبلی کی گہری نگاہ تھی جو فاقہ کشی کے شکار تھے، انھوں نے مشورہ دیا کہ مشترک مسائل میں لیگ کو کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے، انھوں نے سیاسی بیداری کے لیے اردو زبان میں سیاست کی مشہور کتب کا ترجمہ کرنے کا مشورہ دیا، انھوں نے عوام سے ذاتی روابط قائم کرنے اور ایسے

کتابچے شائع کرنے کا بھی مشورہ دیا جو دلائل اور معلومات واعداد پر مبنی ہوں۔"

(مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ ص ۱۸۳)

شبلی کا خیال تھا کہ برطانوی سامراج کے اصل چہرے کو سامنے لانے کے لیے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے جس کی خاطر شبلی عوام کو نظری سیاست اور عملی سیاست دونوں سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔" (بحوالہ اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات ص ۱۷۰)

شبلی اپنے ان احساسات کو اپنی نظم "مسلم لیگ" میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت ☆ کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے
عدالتوں کی پریشانیاں بیان کیجیے ☆ فسانہ ستم وجور ناروا کہیے
دراز دستی پولس کا کیجیے اظہار ☆ مقدمات کے حالات فتنہ زا کہیے
گذر رہی یہ جو کچھ کہ کاشتکاروں پر ☆ یہ داستان المناک وغم فزا کہیے
کبھی تو ردوقدح کی بھی کیجیے جرأت ☆ جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہیے

شبلی سیاست کے بارے میں واضح نقطۂ نظر رکھتے تھے، ان کے خیال میں "پالیٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے، وہ مذہب کے برابر طاقت رکھتا ہے، وہ انسان کے تمام جذبات کو زندہ کرتا ہے، اس سے تمام قومیں مشتعل ہوتی ہیں، وہ انسان میں ہر قسم کا ایثار وخود فروشی پیدا کر دیتا ہے۔" (مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ ص ۱۷۹)

شاید ایک مظلوم ومحکوم ملک کے باشندوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے سیاست کی یہ مناسب تعریف تھی۔ شبلی کی تقریباً ساری نظمیں سیاسی رنگ وآہنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، یہ ان کی سیاسی بصیرت کی غماز ہیں، مسجد کانپور کے حادثہ پر ان کی نظم "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں" جنگ طرابلس وبلقان پر ترکوں سے خطاب، شہر آشوب اسلام، علمائے زندانی، خیر مقدم ڈاکٹر انصاری وغیرہ سب سامراج مخالف سیاسی شعور اور غیر معمولی ملی ووطنی جذبہ کے تحت وجود میں آئیں، شبلی کو افسوس تھا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان سیاسی طور پر غفلت کے شکار تھے، شبلی نے ان صحافیوں اور لیڈروں کی سخت مذمت کی جو ہندوؤں مسلمانوں میں تفریق ونفاق کا بیج بو رہے تھے۔

شبلی کو نئی دنیا میں اس لیے یاد رکھا جائے گا کہ وہ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب تھے۔

بقول خورشید الاسلام: ''حالی و شبلی دونوں اس لائق ہیں کہ ہم ان کے سامنے سر نیاز جھکائیں، انھوں نے نئی دنیا میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، انھوں نے نئی تعمیر میں حصہ لیا، انھوں نے مرثیے بھی لکھے اور روایات کے چہرے سے گرد و غبار بھی ہٹایا اور مسلمانوں میں وہ جذبہ پیدا کیا جس سے تقدیر بدل جاتی ہے۔'' (تنقیدیں، ص ۵۹)

یہ سچ ہے کہ ان کا مقصد مسلمانوں کو اخلاقی و روحانی اعتبار سے سرافراز کرنا تھا، وہ بیشک بہ ماضی کی روایتوں پر حال کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے نزدیک ماضی توہمات کا مجموعہ نہیں تھا، شبلی نے سرکار دو عالمؐ سے لے کر مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار کی یادگار شخصیتوں تک کے کارناموں کو قوم کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ بیسویں صدی میں ان کی ضرورت و اہمیت کو از سر نو محسوس کیا جانے لگا، خورشید الاسلام صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ وہ ماضی کو زندہ قوت مان کر حال پر فتح پانا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ بات غلط ہے کہ شبلی زمانے کا ساتھ دینا نہیں چاہتے تھے یا شبلی پرانی بنیادوں پر پرانے نقشوں کے مطابق تعمیر کرنا چاہتے تھے، شبلی، حالی سے کم حقیقت پسند نہ تھے، وہ مغربی تہذیب سے مرعوبیت ختم کرنے کے لیے اپنی ملت کے مذہبی جوش کو برانگیختہ کرنا چاہتے تھے اور اس پر انھیں فخر تھا، وہ انگریزی داں طبقہ کے بارے میں خوش گمان نہ تھے، اس لیے کہ اس کی بے حد مکروہ صورت انھوں نے دیکھی تھی، اپنے ایک خط میں مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں: ''معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی ترقی کا جوش برائے نام ہے''۔ اس کا ایک نمونہ پروفیسر خورشید الاسلام کے ان افسوسناک تاثرات میں نظر آتا ہے جو انھوں نے شبلی پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اہل مذہب کے بارے میں ظاہر کیے ہیں:

''علامہ شبلی کی برادری کے کسی رکن نے بھی تلاوت قرآن کی مدد سے آج تک کوئی نظریہ زمین آسمان کے بارے میں قائم نہیں کیا، اگر یہ سانحہ ہوا ہے تو ابھی تک صیغۂ راز میں ہے۔'' (تنقیدیں ص ۵۰)

بیچارے خورشید الاسلام اب دنیا میں نہیں رہے لیکن افسوس تلاوت قرآن نے صدیوں سے مسلسل انسان کے مقدرات کی تزئین اور تسخیر کائنات کے ولولہ سے انسانوں کو سرشار کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے اسے سمجھنے کی انھوں نے کوشش نہ کی، خدا ان کو معاف کرے کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ انشاء پردازی سے حیات و کائنات کی گرہ بھی کھل سکتی ہے۔

شبلی کی نئے عہد میں معنویت کو سمجھنے کے لیے ان کے علمی کارناموں کے ساتھ ان کے خطوط سے خاصی مدد ملتی ہے جن میں ان کی شخصیت بے نقاب ہوئی ہے اور ایک روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے ان کے عزائم اور ارادے واشگاف ہوتے ہیں، بیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں ملک کے مختلف حصوں میں آریہ سماج کے کارکن دور دراز کے علاقوں میں مسلمانوں کی کم علمی و جہالت کا فائدہ اٹھا کر انھیں راہ حق سے بھٹکانے کی کوششیں کر رہے تھے، شبلی اس فتنہ کے تدارک کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسلم عوام میں تعلیم عام کی جائے تا کہ وہ اپنے مذہب و عقیدہ سے صحیح طور پر روشناس ہو سکیں، شاید یہ بات ہر دور کے لیے درست ہے کہ جب جب لوگوں پر جہالت کے پردے پڑے ہیں حق کی روشنی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے، شبلی بے چین تھے کہ اسلام کے شاندار ماضی سے ہماری نئی نسلیں پوری طرح روشناس ہو سکیں، علیگڑھ سے اپنے زمانہ پروفیسری میں مولوی حکیم محمد عمر کو لکھتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم میں کس جوش خروش کے ساتھ نماز ادا کی جاتی ہے اور سرسید کی آمین بالجبر کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہیں۔ ''میں کبھی کبھی اسلام پر لیکچر دیتا ہوں۔ مجھ کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔'' پھر وہ اپنے وطن عزیز کے ان نوجوانوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں جو ترقی ولیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھتے ہیں، شبلی نے اس زمانہ میں اشاعت اسلام کے لیے اپنے احباب کو متوجہ کیا اور خود بھی کئی مقامات کے دورے کیے، حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام اپنے مکاتیب میں اس سلسلہ میں اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں ایک خط میں رقم طراز ہیں۔ ''بڑی مشکل ہے کہ دیہات میں جا کر تلقین اسلام کرنے والے واعظ نہیں ملتے، اس کا کیا علاج ہوگا، اشاعت اسلام کی کارروائی تمام تر اس پر موقوف ہے۔'' (ص ۱۹۶ انتخاب مکاتیب) ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''اشاعت اسلام کے لیے مجھ کو خود ایک بار دورہ کرنا ہے۔''

(ص ۱۹۵ انتخاب مکاتیب)

عماد الملک بلگرامی نے قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں شروع کیا تو شبلی نے ایک مکتوب میں اس پر خوشی ظاہر کی، ارتداد کو روکنے کے لیے شبلی کی فکرمندی منشی محمد امین زبیری کے نام ۱۷ اپریل ۱۹۱۲ء کے مکتوب سے ظاہر ہوتی ہے، زبیری صاحب بھوپال میں مہتمم دار الانشاء تھے۔

''میں آج کانپور روانہ ہوتا ہوں، نومسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے لیکن چونکہ گرمی سخت ہو رہی ہے اس لیے یہ دورہ مختصر ہوگا، اسی طرف سے بھوپال آؤں گا، سیرت نبوی کا کام باضابطہ بارش سے شروع ہوگا، یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی طرح ۲ برس میں انجام نہیں پاسکتا اس پر مستزاد یہ ہے کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے اس لیے جلدی کرنا ہے۔''

شبلی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک آنے والے بڑے طوفان کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور آرزومند تھے کہ انسان دوستی اور عدل و مساوات کے پاسبان مذہب اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے والوں کا تدارک مثبت اقدامات کے ذریعہ کیا جائے، حبیب الرحمن خاں شروانی کو ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں۔ ''ادھر اشاعت اسلام کی یہ حالت ہے کہ بیسیوں خطوط اور رپورٹیں آرہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں نومسلم ارتداد کے خطرہ میں ہیں، آریوں کی مقامی کمیٹیاں جابجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے، کہاں کہاں واعظ مقرر کیے جائیں کہاں کہاں مکتب قائم ہوں، یہ تو سلطنت کا کام ہے۔'' (ص ۱۹۷ انتخاب مکاتیب)

شبلی کی پوری زندگی سراپا حرکت و عمل تھی اور ان کا ہر ہر لمحہ علم و حکمت کا چراغ جلانے کے لیے وقف تھا، وہ مغرب کے علم و حکمت میں اسلام کی روح ڈالنا چاہتے تھے تاکہ وہ خالص مادّیت سے نکل کر اسلام کی روشنی سے منور ہوسکے، وہ اپنے عہد کے نامور اہل علم کی جو اسلامی بیداری کے لیے سرگرم عمل تھے مسلسل حوصلہ افزائی کررہے تھے، مولانا آزاد نے جب ''الہلال'' کا ایک مشن اور ایک تحریک کی شکل میں کلکتہ سے آغاز کیا تو شبلی بے حد خوش ہوئے، مولانا آزاد کو ۲۰ راگست ۱۹۱۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''آپ نے بہت اونچا نصب العین رکھا ہے ورنہ جی یہ چاہتا تھا کہ سب طرف سے صرف نظر کرکے وہیں آرہتا اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا، اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشان حال اور پریشان عمل ہو رہے ہیں، کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے ورنہ ہر طرف بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہوجائیں گے۔'' (ص ۲۰۱ انتخاب مکاتیب)

بلقان کی جنگ کے وقت شبلی ترکوں کی اعانت ہندوستانی مسلمانوں کے لیے فرض عین

سمجھتے تھے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب کہ ہندوستانی عوام میں ایشیا کے دوسرے حصوں میں مظلوم انسانوں کے لیے ہمدردی اور ایثار و قربانی کا جذبہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا، شبلی، ظفر علی خاں کو لکھتے ہیں:

''بھائی ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں۔ کیا ترکوں کی جان مینڈے سے کم ہے، یہاں جلسے میں میں نے چند شعر پڑھے تھے۔

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے ☆ کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
بکھرتا جاتا ہے شیرازۂ اوراق اسلامی ☆ چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا ☆ ہم اپنے خوں سے سینچیں گے تمہاری کھیتیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں ☆ کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

شبلی نے اس وقت جرائد اسلامیہ کے نام اپنے بیان میں ترکوں کی اعانت کو ایک فرض عین قرار دیا تھا۔ اس زمانہ میں ترکی کی حکومت مدینہ میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنا رہی تھی اور شبلی اس سلسلہ میں فکرمند تھے، اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں کیا ہے، پروفیسر عبدالباری کو ۱۰ر جون ۱۹۱۳ء کو رقم طراز ہیں: ''بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں تم اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں لیکن علمی مذاق پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہتا ہوں، سخت افسوس یہ ہے کہ ہر حیثیت سے زمانہ میں خر بازاری بڑھ گئی ہے، نیک و بد کی تمیز مطلق نہیں۔'' (انتخاب مکاتیب)

شبلی کی روشن خیالی اور فکر و عمل کی ندرت اور ولولہ انگیزی سے، بہت سے لوگ بیزار تھے، ان پر طرح طرح کے الزامات لگا رہے تھے حتیٰ کہ ان کی زندگی کے سب سے اہم کارنامے یعنی سیرت النبی پر بھی اعتراضات کیے جا رہے تھے، شبلی اس کا ذکر ایک خط میں کرتے ہیں:

''آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لیے بہت سے الفاظ تراشے ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے لیکن دیندار نہیں، لیکن انھیں دینداروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی، یقین فرمایئے زمانہ کی خربازاری دیکھ کر زندگی وبال معلوم ہوتی ہے، خواص تک عوام بن گئے ہیں، حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہے۔'' (شبلی ۲۹ر مئی ۱۹۱۳ء بنام ابوالکمال

سید عبدالحکیم دسنوی)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''قوم میں جب نیک وبد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود پر بھروسا ہوتا ہے کہ وہ حذ ما صفا کرے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد ورشک کے سوا اور کوئی جوہر موجود نہیں ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں۔'' (ص ۲۰۷)

شبلی کو قوم کی تعلیمی صورت حال کی جس قدر فکر تھی وہ اس عہد کے کم اہل علم و معماران قوم کو تھی مگر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی راہ کا اصل روڑہ ان کے نزدیک مسرفانہ طرز حیات تھا، مولوی مسعود علی کو اپنی وفات سے چند روز پیشتر لکھتے ہیں:

''میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصل ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے ہیں، ہندو اسی سے بازی لے گیے اور قیامت تک لے جائیں گے، میں اپنے مصارف برابر گھٹا رہا ہوں، سرمائی کچھ نہیں بنوائی، پرانی چھینٹ کی اچکن اس سال کو ختم کرلے جائے گی، بھائی ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کیا ہوتا ہے، جن لوگوں میں برسوں آدمی رہ چکا ہو اور رہے گا وہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ محض بیکار ہے۔'' (ص ۲۲۱، انتخاب مکاتیب مرتبہ شیخ عطاء اللہ لاہور ۱۹۵۸ء)

شبلی نے اپنے عہد شباب ہی میں اپنے خطہ پر تعلیمی اداروں کے قیام کی مہم شروع کی ۲۰ر جون ۱۸۸۳ء کو شبلی کی کوششوں سے اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول قایم کیا گیا، اسی زمانہ میں اپنے مجھلے بھائی محمد اسحاق کو لکھتے ہیں کہ تم کو ان پہلوؤں پر لحاظ رکھنا چاہیے: (۱) نیشنل اسکول کا قایم رکھنا کیوں ضروری ہے؟ (۲) کیا بلحاظ حالات موجودہ اور توقعات آئندہ وہ مستقل طور پر قایم رہ سکتا ہے، (۳) ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان جن میں تم بھی ایک بلند پایہ پر ہونے کا حق رکھتے ہو اسکول کے کچھ کام آسکیں گے۔'' شبلی بھائی کو یہ تلقین کرنے کے بعد کہ وہ قانون کی تیاری الہ آباد کے بجائے اعظم گڑھ آکر کریں لکھتے ہیں: ''اس بات پر خیال کرو کہ یہ اسکول ہم لوگوں کے خیالات اور حوصلوں کا ایک عمدہ نمونہ اور مشغلہ ہے، ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کی عملی ترقی کے ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جائیں گے، آخر وہ کیا چیز ہے جس کو مخصوص صورت میں ہم ایک قومی کام کہہ

سکتے ہیں، ہم میں سے جو لوگ قومی مذاق پیدا کرتے جائیں گے ان کے لیے اپنی قومی فیاضی کے صرف کرنے کا اس اسکول سے عمدہ تر کیا موقع ہوگا، سردست میرے نزدیک بھی وہ ایک حقیر صورت رکھتا ہے لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا تھا اور جو بعد کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار برس تک درفش کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکارا گیا۔ (ص ۱۷۷، انتخاب مکاتیب)

شبلی اور ان کے اہل خاندان اور احباب نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں اس اسکول کے قیام کے لیے جس فراخ دلی سے زمین مہیا کی اور عمارت تیار کی وہ پورے شمالی ہند میں ایک نمونہ بن گئی اور اسی زمانہ میں مختلف شہروں میں اسی انداز کے اسکول مسلمانوں نے قایم کیے، اس ایثار وقربانی میں اس قدر اخلاص تھا کہ یہ سرزمین محور علم وفن بن گئی اور شبلی کالج نے بیسویں صدی میں گھر گھر میں جدید علوم کا چراغ روشن کردیا اور اس تعلیم کی وجہ سے اس خطہ میں مسلمانوں میں بیداری، خود اعتمادی اور خوش حالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا لیکن اعلیٰ تعلیم کے ساتھ قوم کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اور جہالت کی تاریکی مٹانے کی مہم بھی شبلی نے جاری رکھی، انھوں نے گاؤں گاؤں پر واعظ ومدرس بھیجے، خدام الدین کے نام سے انھوں نے ایک تنظیم کی تشکیل کی جس کا مقصود دیہاتوں میں جا کر اسلام کی اشاعت وحمایت اور اس کے استحکام کے لیے کام کرنا تھا، علامہ شبلی نے ہر گاؤں میں نومسلموں کی مردم شماری تعلیم اور دیگر احوال کی تفصیلات جمع کرائیں۔ سید سلیمان ندوی کو اسی زمانہ میں لکھتے ہیں کہ مسلم گزٹ میں دس روپے ماہوار پر ایسے ابتدائی معلموں کے لیے اشتہار دے دو جو دیہات میں جا کر اردو کی ابتدائی کتاب اور قرآن مجید پڑھا سکیں، شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں: "یوں تو مولانا کی زندگی ہی حفاظت واشاعت اسلام کے جذبہ سے سرشار تھی اور وہ اس جماعت کے سرخیل تھے جس کا کام نیکی کی طرف دعوت دینا اور منکرات سے منع کرنا تھا لیکن جب مسلمانوں کو مرتد کرنے کا اہتمام کیا جانے لگا تو ان کوششوں نے شبلی مرحوم کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا، خواجہ کمال الدین نے جب انگلستان میں اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تو ان کی حوصلہ افزائی کی، مغرب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی پاکیزہ تصویر پیش کرنے کے لیے مولانا شبلی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف سیرۃ النبی کا انگریزی ترجمہ کرنے کے لیے اپنے شاگرد محمد علی جوہر سے وعدہ

لیا تھا، علامہ شیعہ سنی اتحاد کے زبردست حامی تھے، وہ اہل وطن سے اخوت ومحبت کے رشتے استوار کرنے پر زور دیتے تھے وہ ہندوستان کو دارالاسلام یا دارالحرب کے بجائے دارالامن قرار دیتے تھے اور یہاں کسی کا مال غصب کرنا ان کے نزدیک کسی طرح جائز نہ تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ کی سوانح حیات میں تفصیل سے ان گرانقدر خدمات کا جائزہ لیا ہے جو انھوں نے اسلام کی تاریخی وتمدنی عظمت اور علمی جلالت کو نمایاں کرنے کی خاطر انجام دیں تاکہ قوم کے افسردہ دلوں میں تازگی وتوانائی پیدا ہو، وہ رقم طراز ہیں: ''اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے اپنی زندگی کا یہ مقصد قرار دیا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علماء کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے، یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہیں، اس دوسری غرض کے لیے انھوں نے ایسے پرزور مضامین لکھے اور تقریریں کیں جن سے ہمارے علماء کو زمانہ کی نئی ضرورتوں کا احساس ہو۔'' مولانا سلیمان تفصیل سے اسلام کی تصویر بگاڑنے والے مغربی مستشرقین کے بالمقابل شبلی کے علمی کارناموں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بجا طور پر لکھتے ہیں۔ ''ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی تھے جنھوں نے ان ہی کے طریقہ سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض وبرکت کی فرح بخشی ہواؤں نے دنیا کے علم وتمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مروج علوم میں کیوں کر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈال دی۔''

(حیات شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۸۵ء ص ۲۵)

غرض شبلی قوم وملک کو بیدار کرنے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور مغرب کی مرعوبیت سے نجات حاصل کر کے خود اپنے علمی سرمایہ اور اپنے ذخیرۂ فکر ونظر کی بنیاد پر کھڑے ہونے اور ایک علمی، فکری اور تہذیبی وسیاسی نشاۃ ثانیہ کے لیے پیہم کوششیں کیں اور ہماری تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا، اس وقت جب کہ ہم اکیسویں صدی کے ربع اول میں ہیں تقریباً انھیں حالات سے دوچار ہیں جن کا سامنا شبلی کو کرنا پڑا تھا، شبلی نے پامردی کے ساتھ مغربی استعمار کے تار و پود بکھیرنے اور مغربی تمدن کی آندھی کا رخ موڑنے کی کوشش کی اور نفسیاتی و ذہنی طور پر اپنی قوم

کو سر بلند ہونا سکھایا، آج بھی مغربی تہذیبی سیاسی استعمار کی یلغار کی زد میں پورا ایشیا و افریقہ ہے، مغرب اس بات کی بھرپور کوشش کر رہا ہے کہ ثقافتی اعتبار سے مشرق کو مغلوب و خاک بسر کر دے، مشرق اور خاص طور پر اسلام پر طرح طرح کے جاہلانہ اعتراضات کیے جا رہے ہیں، نئی نسلوں کے ذہن و دماغ کو بدلنے اور اپنی جڑوں سے ان کو الگ کرنے اور اپنے سرمایہ اقدار سے نفرت کرنے کی طرف موڑا جا رہا ہے، آج ہمیں شبلی بے حد یاد آ رہے ہیں اور ان کے لفظ لفظ کو آنکھوں سے لگانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تا کہ پھر ہماری رگوں میں بجلی دوڑ جائے اور مغرب کی تاریکیوں سے نکل کر ہم اپنے لیے ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں منہمک ہو سکیں، آج شبلی و اقبال کی معنویت جس قدر ہم پر منکشف ہوتی جاتی ہے ہم ان کی عصر رواں کے لیے ضرورت و اہمیت کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور دل سے یہ صدا نکلتی ہے۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

☆☆☆

عہد حاضر میں علامہ شبلی کی
فارسی نگارشات کی معنویت

پروفیسر عبدالقادر جعفری☆

علامہ شبلی کی شاعری و نگارشات کو ان کے دور کی سیاست و تہذیب کے آئینے میں دیکھنا حقیقت سے قریب تر ہوگا، کیوں کہ ان کے ذہن کی تعمیر کو تشکیل کرنے والے عناصر کا سراغ وہیں سے ملتا ہے اور جب تک ان پہلوؤں کا علم نہ ہوگا ان کی تصانیف خصوصاً ان کی شاعری کو سمجھنا اور ان کے ادبی کارناموں کی قدر متعین کرنا اور قوم کے تہذیبی سرمایہ میں ان کی جگہ مقرر کرنا تقریباً ناممکن ہوگا۔

علامہ شبلی مختلف الابعاد شخصیت کے مالک اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے، ان کی شاعری اور تصانیف میں جدت، آزادی رائے اور فکری گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے، وہ مذہبی علوم کے عالم اور جدید علوم سے بھی واقف تھے، وہ محقق، ادیب، شاعر، انشا پرداز، خطیب، مورخ، مفکر، مصلح اور سیاست دان تھے، وہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو تاریخ کا ایک اساسی اصول تصور کرتے تھے مگر ارتقاء سے ان کی مراد یہ نہیں کہ تاریخ کا ہر قدم جو مستقبل کی طرف بڑھتا ہے لازمی طور پر صحیح ہو یا یہ کہ تہذیب جتنی آگے بڑھے گی صالح تر ہوگی، ان کا ارتقائی تصور صالح معاشرہ کے قدرتی قوانین پر مبنی ہے، اس پر جتنا عمل کیا جائے گا تہذیب اتنی ہی صالح اور مستحکم ہوگی، اس لیے صالحیت حال و مستقبل کی طرح ماضی میں بھی ممکن ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ انسانی خصوصاً تاریخ اسلامی پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے وہ صرف شاعر اور مورخ نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے بنیان گذار اور نقاد بھی تھے، مشرق و مغرب کے تاریخی سرمایہ پر ان کی تنقید اصول تاریخ کے لیے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور سیاسی کا حکم رکھتی ہے۔

☆ صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد (یوپی)

قومی یا ملی شعور فطری نہیں ہوتا بلکہ وہ کسبی اور اکتسابی ہوتا ہے شعور کے اسی تغیر پذیر عمل سے ہی کسی شاعر یا مصنف کے شعور کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تاہم ممکن ہے کہ اس بدلتے ہوئے شعور کا تاریخی اور مادی تجزیہ کیا جائے اور شاعر کے تصورات کے متضاد پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے، شبلی کے نزدیک تاریخ کی تدوین اجتماع انسانی کا بنیادی جذبہ ہے کیوں کہ سرمایہ تاریخی قوموں کی ترقی اور زندگی میں معاون ہوتا ہے تاریخ ہی قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے اور یہ نہیں تو قوم قوم نہیں۔ (المامون جلد اول ص ۴)

سرسید کا قول ہے کہ تاریخ میں صرف واقعات کا ہی ذکر نہ ہو بلکہ واقعات کے اسباب پر بھی بحث ہو اس میں سوشل اور کلچرل تفصیلات بھی ہوں اور سیاسی تاریخ کے ساتھ علمی اور ذہنی ترقیوں کا حال بھی درج ہو۔ (الفاروق جلد اول ص ۱۱) شبلی کی تاریخ نگاری کے بھی یہی اصول ہیں اگرچہ شبلی کا فلسفہ تاریخ سرسید کے مقابلہ میں زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ ہے ان کا عقیدہ ہے کہ تاریخ واقعات کے علاوہ انسانی تہذیب و تمدن کی سرگذشت بھی ہے، لہٰذا وہ قدیم تاریخ کو مذاق حال کے مطابق بنانے کے لیے تنقید اور اصول عقلی کے استعمال کو ضروری سمجھتے ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں تاریخی واقعات اور تمدنی جزئیات کا ایک سمندر موجزن ہے جو ان کے عمیق مطالعہ، ناقدانہ استقصاء، پر خلوص اور پر شوق محنت کا عکاس ہے، چونکہ انھیں اسلام کے روشن ماضی کی پر شوکت و پر عظمت داستان سے دلچسپی تھی لہٰذا ان کی نظر تاریخ کے نمایاں حصوں پر پڑتی ہے اور اپنی تصانیف کے ذریعہ انھیں حصوں کو ابھارنا ان کا نصب العین تھا، وہ اسلاف کے قصے، ان کی سپہ گری، ان کے اخلاق و عادات، ان کی شان و شوکت وغیرہ سے متاثر ہے اور یہی واقعات ان کی انفرادیت میں زور پیدا کرتے ہیں جو ان کے معاصرین کے یہاں مفقود ہے، وہ دور جدید کے ذہنی اور علمی مذاق و مقتضیات سے بھی آشنا تھے، بقول سید سلیمان ندوی مولانا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے وہ شروع میں فارسی شعر کہتے تھے مولانا نے شروع میں ہی جو نظمیں اور قصائد لکھے انھوں نے فارسی کے اہل ذوق میں آگ سی لگادی، ہندوستان میں فارسی شاعری میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی اور اس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے

آب حیات بن گئی۔ (حیات شبلی ص ۲۲۳) ۱۸۸۵ء میں سب سے پہلے ان کی مثنوی ''صبح امید'' شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کی داستان اور علی گڑھ تعلیمی تحریک کا خوش آیند نقشہ پیش کیا جس کی وجہ سے اسے صبح امید سے تعبیر کیا تعجب ہے کہ اس مثنوی کو مولانا نے اپنی کلیات سے خارج کر دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مثنوی قابل تعریف ہے، علامہ شبلی علی گڑھ میں ایسی آب وہوا میں تھے جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات اور قدیم وجدید کے نئے انقلابات گرد وپیش تھے، ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق وباطل کی آمیزش اس طرح تھی کہ انھیں جدا کرنے کے لیے غیر معمولی بصیرت درکار تھی جو مولانا میں موجود تھی، بقول سید سلیمان ندوی بہرحال علیگڑھ کے بعض مفید اثرات کو مولانا نے جلد قبول کیا ان میں سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے یہ احساس ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی وہ انھیں خون کے آنسو رلا گئی، کہتے ہیں:

حیف کیں شور وطرب یک دو نفس بیش نماند ☆ چہ کند عید بدردی کہ بود صبر گداز
جمع اسلام چو باشد ہدف تیربلا ☆ خود چو کج یافت بایشاں فلک عربدہ ساز
فرق نبود بحقیقت زمحرم تا عید ☆ آہ از فتنہ گری ھای سپہر کج باز

شبلی تا حدے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور انھوں نے اپنی شاعری اور تصانیف سے جدید تعلیم یافتہ گروہ کو بے حد متاثر کیا چنانچہ لکھتے ہین مجھ کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا کرنے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کو برانگیختہ کرنا میری قسمت میں تھا، (مکاتیب شبلی جلد اول ص ۵) شبلی کی سیاست پسندی کے واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ سیاسیات ان کے قلم کا موضوع نہ تھا تاہم وہ سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے کیوں کہ حقیقت میں تمدن اسلامی، تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے جو شغف تھا اس کا یہ فطری تقاضا تھا کیوں کہ جب شبلی نے دیکھا کہ:

چرخ کیں فتنہ گری ہای تو آغاز گرفت ☆ مگر ایں شیوہ از آں چشم خون ساز گرفت
بزم را دید کہ از نغمہ دوشینہ تہی است ☆ شبلی آن زمزمہ را باز ز آغاز گرفت

ان کا خیال تھا کہ قدیم محض قدیم ہونے کی وجہ سے بقاء کا مستحق نہیں قرار پاتا بلکہ تہذیبی اور تمدنی اور ملی تاریخ پر روشنی ڈالنے اور ہر دور میں انسان کی آزادی اور ترقی کی خواہش کو نمایاں کرنے

کی جدو جہد کا آئینہ ہونے کے سبب ہی سے شعر تہذیبی ارتقاء کا جزو بننے کا حق حاصل کرسکتا ہے جو شاعری اپنے دور کی مرکزی کشمکش کا عکس نہیں پیش کرتی وہ نہ تو تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور نہ ادبی۔ اسی کسوٹی پر پورا اترنے کے بعد وہ ماضی حال اور مستقبل کے لیے سبق آموز سرمایہ بن سکتی ہے۔

مندرجہ بالا نکات اور واقعات کی روشنی میں جب ہم شبلی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب اور نوا سنجیوں سے پرشور رکھا، سچ ہے:

سالہا گوش جہان زمزمہ زا خواہد بود

زیں نواہا کہ درایں گنبد گردوں زدہ است

شاعر کا ملی اور قومی رجحان اس کے فلسفہ حیات کی نشان دہی کرتا ہے، شبلی فارسی کے خوش فکر شاعر تھے انھوں نے تاریخی واقعات کو شاعرانہ انداز میں نظم کیا اور اپنے عصر کے مسائل پر شاعری بھی کی ہے ان کی قومی اور ملی نظمیں ان کے سیاسی شعور اور عصری آگہی کی ترجمان ہیں۔

علامہ کی شاعری درج ذیل خصوصیات و نکات کی حامل ہے:

(۱) شبلی زمانہ کے عام وخاص واقعات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں وہ ان واقعات سے حقائق ونتائج تاریخی کا استخراج کرتے ہیں اور واقعات کو عقائد کی روشنی مین دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں:

(۲) ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت قوت اور جوش بیان ہے جو ان کے احساس کمال اور احساس عظمت کی نمایاں پیداوار ہے جسے وہ کبھی خطیبانہ کبھی مدرسانہ کبھی واعظانہ اور فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں انھیں اپنے زمانہ کی جہالت اور بدمذاقی کا پورا یقین تھا جسے ہم ان کی خودنظری اور احساس کمال کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں اور غالباً اسی اعتماد کی بدولت ان کی شاعری میں تاثیر اور صمیمیت پائی جاتی ہے، داخلی معنویت کی طرح ظاہری منطقی نظم بھی موجود ہے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار چست ودرست اور فکری نظم وضبط کے لحاظ سے تعمیر کے عمدہ نمونے ہوتے ہیں، اسی علمی اور منطقی عنصر نے ان کی شاعری کو پررعب اور باوقار بنادیا ہے۔

(۳) شبلی کی دوسری خصوصیت ایجاز واختصار ہے ان کے اشعار میں جو لطف اور جوش ہے اس کا بڑا سبب یہی ایجاز و اختصار ہے اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے وہ کئی طریقے اختیار

کرتے ہیں جن میں سب سے اہم تلمیحات و استعارت ہیں اور خصوصاً ان تصاویر اور ان معانی کے دلدادہ ہیں جن میں مبالغہ اور زندگی کی شوخ شدید مفرط اور انتہائی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔

(۴) ان کے کلام میں کہیں کہیں انیسویں اور بیسویں صدی کے مخصوص علمی نظریات اور افکار کا خاص اثر نمایاں ہے اس کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کے بعض رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔

(۵) ان کے بیشتر اشعار عزت نفس، خودداری، آزادی اور حق گوئی کی نشان دہی کرتے ہیں اور یہی صفات اس دور کے لیے درکار تھیں ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری سے انقلاب، آزادی اور حریت کا پیغام دینا چاہتے تھے۔

(۶) شبلی فارسی کی رنگین تراکیب کو نہایت خوبصورت اور عمدہ انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے ان کے اشعار کی خوبصورتی اور دلآویزی دوچند ہو جاتی ہے، ان کے اشعار میں ایمائیت، ایجاز اور اجمال کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔

(۷) ان کے اشعار عام طور پر سادہ ہوتے ہیں لیکن سادگی کے باوجود ان میں حسن کاری پائی جاتی ہے جو صوتی اعتبار سے انھیں حسن اور لطف کا ایک نادر مجموعہ بنا دیتی ہے، ان کے اشعار میں بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے جو مدعا اور مضمون کے اقتضاء سے خود بخود ایک خاص قسم کا آہنگ اور صوتی فضا پیدا کر دیتی ہے۔

(۸) پر جوش خیالات کے اظہار سے ان کے اشعار میں ایک مخصوص موسیقی پیدا ہو جاتی ہے جو اشعار کے مدوجزر میں خوشگوار لے کو ابھارتی ہے، ان کے اشعار حسین سانچوں مین ڈھلے ہوئے ہیں ادائیگی ایسی ہوتی ہے کہ تکلف اور ابہام بالکل نہیں ہوتا ان کے اشعار میں بے جا اہتمام شاید تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گا، ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری اور آرٹ کو فطرت کا ترجمان ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک اعلیٰ شاعری اور آرٹ کا نصب العین وہ ہے جو فطرت کی تکمیل کرے اور حسن کے اعلیٰ مثالی اور معیاری پیکروں کی مصوری بھی کرے، ان کی منظر نگاری ان کی بیانیہ نگاری سے کہیں بہتر ہوتی ہے مناظر کی تصویر کشی کے وقت ان کا ذہن نسبتاً پرسکون نظر آتا ہے، ان کا خیال ہے کہ تاریخی نظریات میں طبعی اور جغرافیائی اثرات انسانی تاریخ کے

مدوجزر میں اہم رول ادا کرتے ہیں، اسی لیے ان کی شاعری میں ماحول کے اثرات کو واقعات واحوال کے لئے نہایت موثر مانا گیا ہے۔ ایک جگہ مسلمانوں کے انگریزی داں طبقہ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے صرف طرز معاشرت ہی انگریزوں سے نہیں لی بلکہ انگریزیت اس درجہ ان کے ذہن پر طاری ہو چکی ہے کہ اگر ان کے سامنے:

نکتہ شرع بہ افسانہ برابر بہ تہی ☆ یوروپ ار گپ زند آن نیز مسلم باشد

جس طرح ان کے یہاں پیغام کی اہمیت رہتی ہے اسی طرح وہ شاعری میں ایک خاص اخلاقی روح کے بھی متلاشی رہتے ہیں جو صرف اجتماع انسانی کی تعمیر وتکمیل ہی نہ ہو بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار وفضائل کی ابھارنے والی ہو، الغرض ان کا شعری ذوق ووجدان نہایت پختہ اور مکمل ہے ان کے اشعار ان کے سیاسی، اجتماعی، مذہبی، جمالیاتی اور رنگینی مزاج کے عکاس ہیں۔

جب ہم ان کے نثری افکار ونگارشات کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ''شعرالعجم'' ان کے مذاق سخن کی اصل جولانگاہ ہے جس میں انھوں نے فارسی شاعری کی محققانہ تاریخ اور فلسفہ شاعری کے دقیق رموز پر مفصل بحث کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شاعری کی ابتدا میں کیا حالت تھی بعد میں اس نے کیا صورت اختیار کی، کیا کیا تغیرات اور اضافے ہوئے اور اب کس لباس میں جلوہ گر ہے، ان کا کہنا ہے کہ شاعری صرف کلام موزوں نہیں نہ صرف تخیلات کے مقدمات موہومہ کی ترتیب ہے بلکہ جو چیز مدرکات انسانی میں ہمارے جذبات واحساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے اور ایک خاص طرح کی موزونیت کے ساتھ مصوری اور موسیقی کی جامع ہے اسی پر شاعری کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

علامہ شبلی نے مولانا روم کی مثنوی پر مفصل بحث کی ہے کہ مثنوی فارسی کی ان چار کتابوں میں ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی لیکن وہ صرف ایک تصوف کی کتاب سمجھی جاتی ہے جس کی نسبت عام خیال ہے کہ تمثیلی زبان میں اسرار نہاں بیان کیے گیے ہیں جو صوفیوں میں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں، شبلی نے بالکل ایک جدید انداز سے اس مثنوی پر نظر ڈالی ہے ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مثنوی تصوف یعنی فلسفہ باطنی کے سوا کلام وعقائد کی بہترین تصنیف ہے جو اسلامی ادب کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے، تقریظ میں اس قدر شواہد پیش کیے ہیں کہ دعویٰ آپ اپنی دلیل بن گیا ہے، عقائد

وکلام کے جس قدر اہم مسائل ہیں ایک ایک کر کے متفرق عنوانوں کے تحت بیان کیے گیے ہیں اوران پر حکیمانہ استدلال کے ساتھ علامہ نے دکھایا ہے کہ یہ تمام مسائل مثنوی سے ماخوذ ہیں ایک ایسی کتاب میں جو سیکڑوں برس پہلے لکھی گئی اس قسم کے نکات ومعارف کا موجود ہونا جن کا اکتشاف جدید سائنس صدیوں کے مسلسل مطالعہ فطرت اور ارتقائے عقلی کے بعد کر سکا کہاں تک اس کی معجز بیانی ثابت کرتا ہے، شبلی نے مثنوی کی خصوصیات کو تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالی ہے جس میں تحقیق کے ساتھ لائق ذکر مثنوی کا طرز استدلال اور طریقہ افہام ہے، یعنی مولانا نے فطرت کے سلسلے سے استدلال کیا ہے جو بالکل جدید سائنس کے مطابق ہے۔

ہر دور کی خصوصیات اور ان کے اسباب یعنی شاعری کے ارتقائی وتدریجی موشگافیوں کے نکتہ کو شبلی نے بہ طرز احسن پیش کیا ہے، وہ جو کچھ لکھتے ہیں آشنائے فن ہو کر لکھتے ہیں اس لیے ان کی تالیفات میں جہاں تک ادبی اور تنقیدی مذاق کا تعلق ہے ہمیشہ برتر وفائق نظر آتا ہے، شبلی باعتبار وسیع النظری اور مذاق تالیف یوروپ کے کسی ناقد ومورخ سے پیچھے نہیں ہیں، اور اگر انھیں ہندوستان میں مورخانہ عظمت کے لحاظ سے معلم اول سمجھا جائے تو غالباً کوئی مبالغہ نہ ہوگا، چونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے آشنائے فن ہو کر لکھا ہے، اس لیے ان کی تصانیف اور خصوصاً شعرالعجم مستند ہے بہر حال انھیں فارسی سے جو طبعی مناسبت تھی جس کی بنا پر وہ کھل کر لکھ سکے ہیں قابل ستائش واعتنا ہے۔

مختصراً شبلی جس طرح قدیم تاریخ وادب کے جامع ہیں، جدید فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ مذاق ان میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ ان کے پیش کردہ مسائل اس حد تک کامل ہیں کہ میرا خیال ہے آئندہ بھی غالباً ان پر کوئی معتد بہ اضافہ نہ ہو سکے گا، اسی طرح ان کے اجتہادات کا (جن کو تاریخی الہامات کہنا زیادہ موزوں ہوگا) کوئی حصہ صدیوں بعد بھی متروک نہ ہو سکے گا اس سے زیادہ شبلی کی تصانیف کا عصر حاضر میں معنویت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے، اس لیے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ:

روشنم شد زنوا سنجی شبلی کا مروز
پند را نیز تمی ہست وصفا ہائی ہست

☆☆☆

علامہ شبلی کی فارسی غزل

ڈاکٹر عمر کمال الدین☆

جمع در پیکر شبلی جہانی بودہ است
یوسفِ گم گشتۂ ما کاروانی بودہ است

(اقبال سہیل)

فارسی زبان کی ہندوستان میں آمد، نشو و نما اور ترویج و اشاعت کا باضابطہ سلسلہ سلطان محمود غزنوی (۴۲۱-۳۸۹ھ)/ ۱۰۳۰-۹۹۸ء) کے عہد حکومت کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے اُس کے بعد غوری، مملوک، خلجی، تغلق اور دیگر علاقائی سطح کے حکمرانوں کے اسے سرکاری زبان کا درجہ دینے نیز دانش ور طبقے کی اس سے دل چسپی نے اس شاندار روایت کو اور آگے بڑھایا یہاں تک کہ مغلیہ عہد کے آتے آتے محبت و مودّت کی نمائندہ یہ زبان ہندوستان کی دل نواز، روح افزا، ادب پرور، نغمہ آگیں، پُرکیف اور نکتہ سنج فضا سے ایسی ہم آہنگ ہوئی کہ انشاء پردازوں، شعراء، تذکرہ نگاروں، داستان نویسوں، مؤرخین، فرہنگ نویسوں نیز دیگر علوم و فنون سے شغف رکھنے والوں نے اس شیریں زبان کو اپنے افکار و خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنالیا، اور اس میں ایسی مہارت حاصل کی کہ ان کی گراں قدر علمی اور فکری کاوشوں کو ملاحظہ کر کے اہل ایران بھی انگشت بدنداں رہ گئے، تفصیل سے قطع نظر ان میں سے چند اہم ہندوستانی اور ہندوستان میں زمزمہ سنج ایرانی شعراء کے نام اس طرح لیے جاسکتے ہیں۔ نکتی لاہوری، ابوالفرج رونی، مسعود سعد سلمان، فضلی ملتانی، عبید سرہندی، عمید نسنامی، ملک تاج الدین ریزہ، شہاب الدین مہمرہ بدایونی، بدر چاچ، ضیاء الدین نخشبی، حسن سجزی، طوطی ہند امیر خسرو، ظہیر دہلوی، فیروز شاہ بہمنی، یوسف عادل شاہ، شیخ جمالی دہلوی،

☆ صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی (یوپی)

شہاب الدین حقیر، غیاث الدین خواند میر، بیرم خان، طاہر دکنی، عرفی شیرازی، غزالی مشہدی، قاسم کاہی، فیضی، ثنائی مشہدی، نظیری طالب آملی، کلیم کاشانی، غنی کشمیری، داراشکوہ قادری، ملاشاہ بدخشی، سرمد کاشانی، چندر بھان برہمن، صائب تبریزی، ناصر علی سرہندی، عاقل خاں رازی، اشرف مازندرانی، نعمت خان عالی، افضل سرخوش، عبدالقادر، عبدالجلیل واسطی بلگرامی، خانِ آرزو اکبرآبادی، شیخ علی حزیں، مرزا مظہر جان جاناں، واقف بٹالوی، میر درد دہلوی، آزاد بلگرامی، مصحفی امروہوی، مومن دہلوی، امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ، مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خان حسرتی، غلام امام شہید، علامہ شبلی نعمانی، خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی، غلام قادر بلگرامی، علامہ اقبال، سہیل اقبال اعظمی اور پروفیسر ولی الحق انصاری وغیرہ۔

اس حقیقت کا کوئی بھی منکر نہیں کہ فارسی شاعری ہماری ہزار سالہ ادبی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کی گراں بہا مشترکہ وراثت ہے، اس کی نسیم سحری نے گلشنِ ادب میں سیکڑوں برس تک جشن بہاراں برپا کر رکھا، اس ساقیِ دل نواز کی چشم مخمور نے نہ جانے کتنے تشنہ کاموں کو شربت وصال سے سیراب کیا، بادشاہوں کے دربار دُربار میں سکہ اس کا رواں ہوا، کاخ امراء میں نور و نکہت اسی شمع فروزاں کی مرہونِ منت رہی، صوفیاء کی خانقاہوں، عرفاء کے تکیوں اور مشائخ کے دائروں میں وجد و حال کی کیفیتیں اسی نے پیدا کیں، محنت کش اور فاقہ مست عوام میں زندہ دلی سے جینے کا حوصلا اسی نے بخشا اور حساس، غیور نیز خوددار طبائع کو عزت نفس، قناعت، خودگری اور خودشناسی کا درس اسی سے ملا۔

عرفی کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں:

بسکہ لبالب نماند عافیت از عشق تو ☆ قیمت آزادگان قدر شہیدان شکست

قدرے تفصیلی تمہید کے بعد اب روئے سخن اصل موضوع کی طرف آتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک عہد ساز شخصیت کے حامل تھے، اُن کے پیکر خاکی میں گونا گوں صفات اور مختلف النوع کمالات کی ایک بارونق دنیا آباد تھی، وہ بیک وقت ایک جید عالم، بالغ نظر مورخ، صاحب طرز ادیب، محتاط و منصف سیرت نگار، نکتہ شناس محقق، بے لاگ نقاد، سحر طراز خطیب، قابل رشک معلم، مُسکت متکلم اور قادرالکلام شاعر تھے، سیرت النبیؐ، الفاروق، الغزالی، المامون، شعرالعجم، الکلام، موازنہ انیس و دبیر وغیرہ جیسی شاہکار تصانیف اور کثیر تعداد میں

تحقیقی مقالے اس دعوی کے شاہد عدل ہیں، یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ علامہ مرحوم کے علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ کمالات کی بلندیوں کے سامنے ان کی شاعرانہ عظمت کماحقہٗ نمایاں نہ ہوسکی تاہم ان کی شاعری کے مطالعہ سے یہ راز منکشف ہوتا ہے اگر ان کی صلاحیتیں صرف شاعری پر ہی صرف ہوتیں تو کم از کم برصغیر میں وہ انیسویں اور بیسویں صدی کے سب سے اہم فارسی شاعر ہوتے۔

اگرچہ اس گفتگو کا اصل موضوع علامہ شبلی کی فارسی غزل گوئی ہے لیکن یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ انھوں نے فارسی شاعری کی مختلف اصناف مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، ترکیب بند اور مفاوضات پر مشق سخن کی ہے اُن کا فارسی کلام اولاً چھوٹے چھوٹے مجموعوں ''دستۂ گل''، ''بوئے گل''، ''برگ گل'' اور ''دیوان شبلی'' کی شکل میں شائع ہوا، بعد ازاں یہ ''کلیات شبلی'' کے قالب میں مولانا مسعود علی ندوی کے اہتمام سے مطبع معارف اعظم گڑھ میں حلیہ طبع سے پیراستہ ہوا، پاکستان میں ڈاکٹر محمد ریاض نے ''کلیات شبلی'' کو مختلف مجموعوں کی مدد سے مرتب کر کے ایک پُر مغز مقدمہ کے ساتھ مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان سے ۱۹۷۷ء میں شائع کرایا، ۲۴×۱۷ سینٹی میٹر قطع کے ۱۶۵ صفحات پر مشتمل اس کلیات میں اشعار کی تعداد تقریباً ۱۸۰۰ ہے جن میں غزل کے اشعار ۸۰۰ ہیں نادر الفاظ کے معانی اور بعض واقعات کی توضیح اس کلیات کی نمایاں خصوصیت ہے۔

غزل جیسا کہ آپ بھی حضرات بخوبی واقف ہیں فارسی شاعری کی مقبول ترین صنف اور جذبات عشق و محبت کے اظہار کا وسیلہ ہے، اس کا ہر شعر جداگانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے، پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں، آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں جس میں عام طور پر شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے۔

رودکی کو فارسی کا پہلا غزل گو شاعر مانا جاتا ہے، اس کے بعد دقیقی اہم غزل گو شاعر ہے۔ صوفی شعراء میں اوحدی، عطار، مولانا روم، اور عراقی نے اس کی ترقی میں نمایاں کردار عطا کیا، سعدی نے تصوف کی چاشنی، اچھوتے انداز بیان اور زندگی کے قیمتی تجربات کو غزل کے انداز سمو کر اس شرابؔ کو سہ آتشہ بنا دیا، ادھر ہندوستان میں خسرؔو اور حسن سجزی نے غزل کو چار چاند لگائے اب ''لسان الغیب'' خواجہ شیراز کا دور آیا تو بہ قول شبلی ''...... خواجہ حافظ نے اس دائرہ کو وسیع کر دیا، ہر قسم

کے رمزانہ، صوفیانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی خیالات غزل میں ادا کیے چوں کہ زبان پر بے انتہا قدرت تھی اس لئے کسی قسم کے خیال کے ادا کرنے میں لطافت اور رنگینی میں فرق نہ آیا یہ غزل گوئی کی معراج تھی جس کے بعد غزل کو یہ مرتبہ کبھی نہ حاصل ہوگا اور نہ ہو سکتا تھا۔(۱)

حافظ شیرازی کے بعد فغانی، عرفی، ظہوری، جلال اسیر، طالب آملی، کلیم ہمدانی، فیضی، نظیری، ولی دشت بیاضی، وحشی یزدی، عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب فارسی غزل کے اہم نام ہیں، اس کے بعد تو پھر زبان پر بے اختیار یہ شعر مچلتا ہے ؎

روشنم شد ز نوانجی شبلی امروز

ہند را نیز فتی ہست وصفا ہانی است

شبلی کی غزل گوئی پر گفتگو سے پہلے غزل کے بارے میں ان کا نظریہ جاننا ضروری ہے ان کے لفظوں میں ''غزل کا اصل سرمایہ خمیر عشق ومحبت کا اظہار ہے، محبت کا جذبہ جب دل میں آتا ہے تو بے اختیار زبان سے ادا ہوتا ہے، عاشق خود جانتا ہے کہ اظہار محبت نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ خلاف مصلحت ہے لیکن دل پر قابو نہیں ہوتا ؎

شوق نگذاشت کہ دستی نہم بردل خویش

ورنہ ایں سوز ہنوز از تونہاں می بایست

چونکہ محبت کے دعوی میں عاشق کو مزہ آتا ہے اس لیے طرح طرح سے ادا کرتا ہے کبھی معشوق کو مخاطب بناتا ہے اور مختلف پُر اثر طریقوں سے اُس کو اپنی شیفتگی، وفا شعاری، جاں نثاری اور جان بازی کا یقین دلاتا ہے، کبھی اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے، کبھی اس سے بھی غرض نہیں ہوتی کہ مخاطب کون ہے؟(۲)

شبلی کی غزلوں میں رندی وسرمستی بھی ہے اور ناامیدی وتلخ کامی بھی، احساس کی شدت، فکر کی جولانی، جذبات کی صداقت، طرز ادا کی جدت، ذوق کی بلندی اور سلاست وروانی ان کی غزل سے عبارت ہے۔ ظاہر داری وریاکاری سے وہ سخت متنفر ہیں، اہل ہنر کی ناقدری سے ان کی آنکھیں اشک بار نظر آتی ہیں، وہ تصوف کے اسرار ورموز سے پردہ نہیں اُٹھاتے اور نہ ہی فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں، اُن کی بمبئی والی غزلیں خاص طور سے مورد بحث اور معرض اختلاف رہیں،

کچھ لوگوں نے تو انہیں اسرار معرفت کا درجہ دیا اور کچھ کوتاہ نظر شبلی کی کردار کشی پر سوئے ظن سے آگے کچھ نہ دیکھ سکے، اس سلسلہ میں شبلی کا ظرف ملاحظہ ہو۔

حالیا شبلی شدم رند غزل خواں نیستم ☆ شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی

دوستاں تہمت ایں شیوہ بما نیز کنند ☆ شبلیا نابلد کوچۂ عشقیم ولی

وہ ستائش وصلہ سے بے پروا اور تعریض وتنقید سے بے نیاز ہو کر شاعری کو تنگنائے سحر وفسوں سے نکال کر درجۂ اعجاز پر فائز کرنا چاہتے ہیں۔

شبلیا سحر است ایں اعجاز می بایست کرد ☆ ما بدین قدر از تو راضی نیستم اندر سخن

اور ان کے مندرجہ ذیل اشعار صداقت پر مبنی نظر آتے ہیں:

کہ صائب در سواد اصفہان کرد ☆ ہماں کرد در سوادِ ہند شبلی

شبلی مگر ز مردم ہندوستان نبود ☆ در حیرتم کہ پاکی گفتار از کجاست

گر نظیری نبود شیخ حزیں می باید ☆ شبلیا کز و دادِ سخن می خواہی

حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے برصغیر میں فارسی غزل کو نہ صرف آبرومند اور باوقار بنایا بلکہ اسے ایرانی شاعری کی سرحدوں سے روشناس کرادیا۔

حسرت موہانی کے لفظوں میں.......... شبلی کے کلام میں ہندوستانیت کا مطلق اثر نہیں پایا جاتا۔"(۳)

شبلی کے ایک تعارف نگار کی رائے اس طرح ہے "شبلی کا کلام کاملاً نہیں تو بڑی حد تک شعرائے اہل زبان کے کلام سے لگا کھاتا ہے۔"(۴)

حالی کے تاثرات کچھ یوں ہیں: "میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم ونثر جو کچھ ہے اس کو چھپوا کر شائع کردوں مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔"(۵)

شبلی نے اپنی غزلوں میں ظہیر فاریابی، سعدی شیرازی، حافظ شیرازی اور نظیری نیشاپوری کی تقلید کی اور ان کی زمینوں میں داد سخن دی ہے۔

ظہیر کی ایک غزل کا مطلع ہے:

باد صبا روم امشب بہ گلستانی چند ☆ تا کشایم گرہ از سنبل و ریحانی چند

(دیوان ظہیر ص ۶۰)

اس زمین میں شبلی نے ''گلستانی چند'' کی ترکیب کو کس عمدگی سے نظم کیا ہے۔

بہ تماشا قدمی رنجہ بفرمای کہ من

دارم از داغ تو در سینہ گلستانی چند

(کلیات ص ۶۳)

سعدی کی زمین میں شبلی کی صرف ایک غزل ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

خوبرویانِ جفا پیشہ وفا نیز کنند ☆ بہ کسان درد فروشند ودوا نیز کنند

(کلیات سعدی ص ۲۰۰)

اس کے جواب میں شبلی کا مطلع ملاحظہ ہو۔

؟؟دلبران جور بور زند وجفا نیز کنند ☆ ویں جز افسانہ نباشد کہ وفا نیز کنند

(شبلی)

اسی غزل میں سعدی کا یہ شعر بھی ہے۔

گر برآید بہ زبان نام منت باکی نیست ☆ پادشاہان بہ غلط یاد گدا نیز کنند

اب شبلی کا شعر سنیے اور سر دھنیے:

گاہ گاہی بہ منِ خستۂ بے دل دارد ☆ التفاتی کہ بہ احوال گدا نیز کنند

ان نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے سعدی کی غزل کا اثر زیادہ قبول کیا ہے، الفاظ وتراکیب میں مماثلت ہی نہیں بلکہ ان کے مطالب میں مناسبت یا اس کے شواہد ہیں، سعدؔی کے بعد علامہ حافؔظ سے سب سے زیادہ متاثر ہیں اور اُن کے کلام میں سب سے زیادہ حافظ کی زمینوں میں غزلیں ملتی ہیں، وہ ملک سخنوری کی بادشاہی کے لیے حافظ کی بندگی لازم گردانتے ہیں۔

گر خداوندی ہوس داری در اقلیم سخن

بندگی حافظِ شیرازی می بایست کرد

اب بنا کسی تمہید کے بادۂ شیراز اور صہبائے ہند کی توبہ شکن ادائیں ملاحظہ ہوں۔

ساقی بیا کہ یار زُرخ از پردہ برگرفت ☆ کارِ چراغ خلوتیاں باز در گرفت
(دیوان حافظ ص ۳۶)

تیغش زحالِ خستہ دلان تا خبر گرفت ☆ بار سری کہ برتن مابود بر گرفت
(شبلی ص ۱۰۴)

خمی کہ ابروی شوخ تو درکمان انداخت ☆ بہ قصد جان من زار ناتوان افتاد
(حافظ ص ۳۲)

چنان نہ شہرت عشق تو برزبان انداخت ☆ کہ پردہ بررُخ این کارمیتوان انداخت
(شبلی ص ۸۴)

دلبر برفت ودل شدگان را خبر نہ کرد ☆ یادِ حریف شہر ورفیقِ سفر نہ کرد
(حافظ ص ۵۶)

ہر ذرہ ای زمشت غبارم ہمان بجاست ☆ گویانسیم دوست بہ خاکم گذرنہ کرد
(شبلی ص ۹۷)

زدل برآمدم دکار بر نمی آید ☆ زِ خود بدر شوم دیار در نمی آید
(حافظ ص ۳۳۶)

زجان گذشتم وبازم بہ بر نمی آید ☆ کہ نیست زورم وآن بت بہ زر نمی آید
(شبلی ص ۹۱)

سالہا پیروی مذہب رندان کردم ☆ تا بہ فتوائی خرد حرص بہ زندان کردم
(حافظ ص ۱۶۵)

من اگر پیروی مذہب مستان کردم ☆ کسب این فن ہمہ زان نرگس فتان کردم
شبلی ص ۹۲)

اب نظیری کی زمینوں میں شبلی کی غزلیں ملاحظہ ہو:

نظیری نے اپنی ایک غزل میں ''بازوی نا آزمودہ'' کی ترکیب نہایت چابکدستی سے استعمال کی ہے:

از کف نمی دہد دلِ آسان ربودہ را ☆ دیدیم زور بازوی ناآزمودہ را
(انتخاب نظیری ص ۶)

شبلی نے اس ترکیب کو اس طرح برتا ہے؛

در قتل عاشقان چہ قدر خیرہ گشتہ است ☆ تا آزمود بازوئ ناآزمودہ راو

اسی غزل میں نظیری کا یہ شعر بھی ہے؛

نتواں چشید قند مکرر وزاں لبان ☆ بتوان شنود حرف مکرر شنودہ را

شبلی یوں گویا ہیں:

از بسکہ خوش محاورہ افتاد چشم او ☆ کردیم فہم ازو سخن ناشنودہ را

از نصیحت بر فروزد روی تو ☆ وز شکر گردد ترش ابروی تو
(نظیری ص ۷۵)

اے گلِ باغ صباحت روی تو ☆ سُنبل تربیۂ گیسوی تو
(شبلی ص ۱۱۸)

شبلی کی غزلوں میں حسین قوس وقزح کے مختلف رنگ اس طرح ہیں:

دل را زغمزہ باز گرفتن طمع مدار • نتواں زدزد خواست متاعِ ربودہ را

در کودکی زچہرۂ من می شناختند • سوز عیاں نگشتہ وعشق نبودہ را

چوں آگہی کہ فرصت عہد شباب چیست • مے خورد گر سخن زعذاب وثواب چیست

امشب ایں غلغلہ در کوچہ وبازار افتاد • کہ فلاں مے زدوبی خود شد وسرشار افتاد

جدا زدوست شب ماہتاب راچہ کنم • کہ کارِ عارضِ او از قمر نمی آید

گرچہ از دل طمعم بود کہ شیدا نشود • لیک چوں شد نتواں گفت کہ رسوا نشود

دوش مستی خبر آورد کہ در عرصۂ حشر • گفتگو از خم ومینا وسبو خواہد بود

ساغری چند بہ یاد رخ رنگین خوردم • قدحی چند در آغوش گلستان زدہ ام

کس چہ داند کہ بہ خلوت گہ آں ماہ تمام • زدہ ام ساغر وبریاد حریفان زدہ ام

پی تواں برد کہ ایں زمزمہ ای چیزے نیست • شبلی ایں تازہ نوا ہانہ چوں مستان زدہ ام

شبلی بہ حال مردم دانا گریستم • عیبی بزرگ تر زہنر در زمانہ نیست
می دہد مئے بچہ ام باد فراوان چہ کنم • گرکم عقل نہ گیرم من حیران چہ کنم
در فراق دوست تنہا بودہ ام • ہیچ از صبر وسکون بامن نبود
گوئیا بادوست ہر جا بودہ ام • باخیالش بس کہ بودم ہم نشین
طراز مسند جمشید وفر تاج خسرو را • نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ ونورا
گذشتن از سرِرہ مشکل افتاداست رہرورا • بہ ہر سواز ہجوم دلبرانِ شوخ بی پروا
بہ ہم آمیختہ از زلف وعارض ظلمت وضورا • فغاں از گرمی ہنگامہ خوبان زردشتی
کنار آب چوپائی وگلگشت اپولو را • بدہ ساقی ے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
دگر رہ چارہ سازم ایں قبای زہد صد تو را • بیا شبلی بہ یاد پنجہ گیرائی مژگانش
دامن بمبئی از کف ندہم تاباشم • دامنِ عیش زدستم نزود تا شبلی
حالیا شبلی شدم رند غزلخواں نیستم • شاعری از من مجودور از سواد بمبئی

شبلی کی غزل گوئی کے سلسلے میں ڈاکٹر مہرالنساء کی رائے ملاحظہ ہو:

اشعار فارسی مولانا شبلی نشان دہندۂ ذوق وشوق اوست، مطالعۂ عمیق ودقیق فارسی گوئی شاہد وآئینہ دار کماں شعر اوست، در شعر فارسی او شیرینی زبان وحلاوت غزلہا با آب وتاب فراوان جلوہ گری می کند، ندرت درافکار وخیالات او، شوخی زبان، شیوی نفس، دل آویزی ودل ربائی در اشعار شبلی بہ اثبات رسیدہ است شبلی علاوہ بر غزل در زمنیہ ھا...... دیگر شعرائے فارسی ہم طبع آزمایی کردہ است ولی غزلہایی فارسی او از نظر بلاغت ولطافت بی نظیر است وبلاشبہہ درادب فارسی سرمایۂ گراں بہایی است۔(۶)

آخر میں ڈاکٹر رئیس نعمانی کے لفظوں میں یہ گفتگو ختم کی جاتی ہے:

”.......... اگر حافظؔ اور نظیری کی غزل کی بیشتر خصوصیات کو یکجا کیا جائے تو وہ مولانا شبلی نعمانی کی غزل ہوگی، شبلی کی زبان نہایت شگفتہ وشستہ اور ہندوستان کے فارسی دانوں سے زیادہ ایرانیوں کی زبان اوران کے محاورے سے مناسبت ومشابہت رکھتی ہے ان کے کلام میں وہ دو غلے اور جعلی دساتیری الفاظ بھی راہ نہیں پاسکے ہیں جن کو غالب نے فخریہ

استعمال کیا ہے اور ایرانی اُن کو ٹکسال باہر قرار دیتے ہیں اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ گذشتہ سو سال کے اندر ہندوستان میں کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گذرا، جس کے کلام میں شبلی کے معیار کا برجستہ، شگفتہ اور رچا ہوا تغزل پایا جاتا ہو وحشت کلکتوی نے سچ بھی تو کہا تھا:

از قند پارسی کہ زلبہاش می چکید
ایران بہ رشک بود ز ہندوستان ما(۷)

حواشی:

(۱) شعر العجم جلد ۵ ص ۷۹۔
(۲) ایضا جلد ۵ ص ۸۹۔
(۳) حیات شبلی ص ۸۳
(۴) دانش (شمارہ ۵۵-۵۴) ص ۲۶۸
(۵) حیات شبلی ص ۸۳
(۶) دانش (شمارہ ۸۵-۸۴) ص ۲۳۴
(۷) دانش (شمارہ ۵۵-۵۴) ص ۲۷۵ (بہ حوالہ حیات شبلی ص ۸۴۸)

مراجع:

(۱) حیات شبلی۔علامہ سید سلیمان ندوی۔دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء
(۲) رسالہ ''دانش'' اسلام آباد (پاکستان) شمارہ ۵۵-۵۴ (مقالہ رئیس نعمانی بہ عنوان ''شبلی کی فارسی کلیات پر ایک طائرانہ نظر'' از صفحہ ۲۶۱ تا صفحہ ۲۷۸ (۹۹-۱۹۹۸ء)
(۳) دانش شمارہ (۸۵-۸۴) مقالہ ڈاکٹر مہر النساء۔م خان مولانا شبلی و شعر فارسی (از صفحہ ۲۲۳ تا صفحہ ۲۳۴) ۲۰۰۶ء
(۴) شعر العجم۔علامہ شبلی نعمانی جلد ۵۔دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۷ء

....

جمالیاتی نقاد شبلی کا سماجی و تاریخی شعور

ڈاکٹر غضنفر علی غضنفر ☆

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کا نظریۂ شعر اپنے آخری تجزیے میں بنیادی طور پر جمالیاتی ہے، اس لئے کہ وہ شاعری کا اصل مقصد طبیعت کا انبساط سمجھتے ہیں اور اس انبساط کی تشکیل ان کے خیال میں جذبات کی برانگیختگی، شاعرانہ مصوری اور الفاظ کی مینا کاری سے ہوتی ہے، اس خیال کے ثبوت میں ان کے یہ بیانات پیش کیے جا سکتے ہیں:

''شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے۔''

''جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔''

''شاعری در حقیقت مصوری ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشاپردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے، شاعری کی بڑی شرط اسلوب بیان کی جدت اور دلآویزی ہے۔''

شبلی کے اس نظریہ شعر کا بنیادی سبب ان کی طبیعت کا میلان ہے، ان کے میلانِ طبع یا افتادِ طبیعت کا اندازہ خود ان کے اس قول:

''لوگ اکبری اور عالم گیری ہوتے ہیں میں جہاں گیری ہوں''

اور ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی کے اس بیان:

''شبلی نفاست پسندی کی بنا پر لکھنؤ کے تمدن کو دلی کے تمدن پر ترجیح دیتے تھے۔''

☆ پرنسپل، اردو ٹیچنگ ریسرچ سینٹر، ۱۰/اے، مدن موہن مالویہ مارگ، لکھنؤ۔

سے لگایا جاسکتا ہے، یہ حقیقت تقریباً ہر ذی علم شخص پر عیاں ہے کہ جہاں گیر، اکبر اور عالمگیر کے برعکس جمال پرست اور رنگین مزاج تھا، اور لکھنؤ کی تہذیب عبارت ہے نزاکت، نفاست، لطافت، شائستگی، نرم گفتاری، شگفتہ مزاجی، رنگین بیانی اور حسن پرستی سے۔ اپنے کو جہاں گیری کہنے اور لکھنوی تہذیب کو پسند کرنے کا مطلب یہی ہے کہ شبلی خود بھی رومانی آدمی تھے، رنگین مزاجی، جمال پرستی، اور نفاست پسندی ان کی شخصیت کی بنیادی خصوصیات تھیں۔ ان کی رنگین مزاجی اور جمال پرستی کا ثبوت ان کے خطوط، ان کی شاعری، ان کی نثر، ان کے اسلوب اور ان کی زندگی کے حالات و واقعات اور اطوار و عادات سے بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔ ان کا عطیہ فیضی کی طرف جھکاؤ، بمبئی کی جانب کھنچاؤ اور لکھنؤ سے لگاؤ نیز ان کا اس طرح کا اظہار:

''عین اس وقت چمن زار بمبئی کی گل گشت کے عالم طلسم میں پہنچا دیا تھا کہ بھاولپور کے عہدہ داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے وہ ندوہ کے معائنے کو آئے ہیں، اس وقت تمہارا رہنا ضروری ہے، اس خط پر بالکل اس حالت میں نکلا جس طرح مرحوم شداد نے بہشت کو چھوڑا تھا، بہر حال پھر اسی خرابے میں آگیا۔''(۱)

بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو ابتر کردیا ہے، ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، نہ وقت، نہ دماغ، حسرت کا اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔''(۲)

اور مہدی افادی اور مولانا حالی کے یہ بیانات:

''ایک رئیس نے جن کی بیوی نہایت حسین تھی، مولانا سے پوچھا، جنس لطیف میں کن کن اوصاف کی ضرورت ہے، مولانا نے کہا 'اسے صرف حسین ہونا چاہئے'، اس فقرے کا میاں بیوی پر جو اثر ہوا تھا آج تک سماں آنکھوں میں ہے۔''(۳)

''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرت النعمان،

---

(۱) مکاتیب جلد اول ص ۱۶۹ (۲) مکاتیب شبلی خط نمبر ۵۲، ۲۴ نومبر ۱۹۰۸ء (۳) افادات مہدی، مہدی افادی ص

الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دوآتشہ ہے جس کے نشے میں خمار چشم ساقی ملا ہوا ہے، غزلیات حافظ کا وہ حصہ جو رندی وبے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے اعتبار سے تو یہ غزلیں اس سے بھی زیادہ گرم ہیں۔''(۴)

شبلی کی رنگین مزاجی اور جمال پرستی کے بین ثبوت ہیں لیکن اپنے اس شدید جمالیاتی میلان طبع کے باوجود شبلی قومی ضرورت، ملکی صورت حال اور تقاضائے وقت سے کبھی غافل نہیں رہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قومی ضرورت ان پر دباؤ ڈالتی رہی، ملک کی صورت حال انھیں ایڑ لگاتی رہی اور وقت کا تقاضا ان کے دل ودماغ پر ضرب لگاتا رہا، شبلی اس ضرب سے چھٹ پٹاتے رہے، مضطرب ہوتے رہے اور ان کا اضطراب اپنا رنگ بھی دکھاتا رہا، سرسید احمد خاں کی ہمنوائی، ندوہ کے قیام اور کاموں میں انہماک، عہد ساز شخصیتوں کی سوانح عمریوں کا سلسلہ یہاں تک کہ شعرالعجم اور موازنہ انیس ودبیر کی تصنیف ان کی اسی اضطرابی رنگ کے مختلف روپ ہیں۔

شبلی کا یہ رنگ اور بھی پکا ہو جاتا ہے اُن کے ان جملوں سے جو ان کے رنگین خطوں میں موجود ہیں:

''اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں لیکن عالم لطف میں ندوہ کی ایک ضروری ضرورت سے یہاں آنا پڑا، لیکن اب تک آنکھوں میں وہ تماشا پھر رہا ہے، خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی قوم پر اور مذہب پر نثار کرتا ہوں۔''

''اس اثناء میں میں نے بہت چاہا کہ بمبئی آؤں لیکن ندوہ کی ضرورتیں ہلنے نہیں دیتیں۔''

یہ اسی اضطرب کا اثر ہے کہ شاعری کا مقصد لطف وانبساط سمجھنے والا ذہن یہ کہنے پر مجبور ہے:

''کلام کی خوبی صرف محاکات کا نام نہیں، کلام کی غرض وغایت صرف سامعین کو محظوظ کرنا نہیں بلکہ عدل کی سفارت اور پیغامبری ہے، کلام کی خوبی سچائی پر موقوف ہے۔''

---

(۴) مولانا حالی پانی پت ص......

شبلی یہ بات صرف کہتے ہی نہیں بلکہ اپنی عملی تنقید میں وہ اس کا ثبوت بھی دیتے ہیں، دراصل ملکی صورت حال اور قومی ضرورت نے شبلی کے سماجی اور تاریخی شعور کو اس حد تک اکسایا اور ایسا بالیدہ کیا کہ وہ بحرِ سخن کی گہرائیوں میں جا اترا۔ اور شعر و شاعری کی اہمیت، افادیت اور معنویت کے موتی کو نکال لایا۔

درج ذیل اقتباسات سے ان کے سماجی اور تاریخی شعور کی بالیدگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''ایران کی خاک فنونِ لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا، اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی اور کن اسباب سے شروع ہوئی، کس طرح عہد بعہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں؟ قومی اور ملکی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے، خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا، شعراء کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاضِ اشعار ہیں جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیتے ہیں، شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں، اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا۔''

شبلی اس کمی کو اس لئے محسوس کر رہے تھے کہ ان کو یہ احساس تھا کہ:

''شعر ایک قوت ہے، جس سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں۔''

اور

''شریفانہ اخلاق پیدا کرنے کا شاعری سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہوسکتا۔''

اور انھیں ان کے شعور نے یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اس طرح کی شاعری ان کے اپنے مشرقی شعری سرمائے میں بدرجۂ اتم موجود ہے، شبلی نے اس کمی کو پورا بھی کیا اور اس طرح پورا کیا

کہ وہ دنیا کے بڑے ناقدین فن کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ انھوں نے فارسی شاعری کا ایسا محاکمہ پیش کیا اور ایسا انداز نظر اپنایا کہ ان کا نظریہ تنقید مشہور فرانسیسی نقاد تین کے تاریخی نظریہ تنقید سے جاملا، جس طرح تین نے انگریزی ادب کی تاریخ میں اس بات پر خاص زور دیا کہ انگریزی ادب کا بیشتر سرمایہ انگریزی نسل، انگلستان کی آب وہوا اور وہاں کے خاص ماحول کا نتیجہ ہے بعینہ شبلی نے بھی شعرالعجم میں یہ نتیجہ نکالا کہ عشقیہ شاعری ایرانی نسل، ایران کی آب وہوا اور وہاں کے مخصوص ماحول کی دین ہے اور عربی شاعری کا ایک بڑا میدان مفاخرت یعنی جاں بازی، مخاطرۂ نفس، اندھا دھند دلیری کے خیالات عربی نسل، عرب کے جغرافیائی حالات اور وہاں کے خاص ماحول کے زیر اثر پیدا ہوا۔ شبلی کی نظر میں شیکسپیئر، ملٹن اور براؤننگ کی طرح خیام، حافظ، اوحدی، مولانا روم، عطار، سعدی اور خسرو بھی مخصوص صورتِ حال کی پیداوار ہیں، جس انداز سے تین نے ریسین (Recin) کے ڈراما اور شاعری کو فرانسیسی نسل، فرانسیسی آب وہوا اور اٹھارویں صدی کے تاریخی احوال کا عطیہ بتایا ہے، ٹھیک اسی انداز سے شبلی بھی فردوسی کے شاہ نامے کو ایرانی نسل، ایرانی آب وہوا اور ایران کے مخصوص تاریخی احوال کا عطیہ بتاتے ہیں، شبلی کا یہ تاریخی تجزیہ صرف عشقیہ شاعری، مفاخرت اور مذکورہ بالا شعرا اور فردوسی کے شاہنامہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس طرح کے بے شمار نتائج شعرالعجم اور ان کے مقالات میں موجود ہیں جو تین کے تاریخی نقطۂ نظر کے اثر کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں، یا اس کے مماثل نظر آتے ہیں۔

شبلی کے سماجی اور تاریخی شعور نے اس نکتے کو پالیا تھا کہ:

> ''ایک نکتہ سنج کا یہ فرض ہے کہ ہر دور کی تمام خصوصیتوں کا پتا لگائے، نہ صرف ان کا جو سطح پر نظر آتے ہیں بلکہ ان کا بھی جو تہہ میں ہیں اور جن پر عام نگاہیں نہیں پڑ سکتیں اس کے ساتھ ان خصوصیتوں کے وجوہ اور اسباب بتائے یعنی کیوں کر پیدا ہوئیں اور کس طرح ایک رنگ دوسرے رنگ سے بدلتا گیا۔''

اور انھوں نے ایک کامیاب نکتہ سنج ہونے کا ثبوت بھی دیا، یہاں صرف دو اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں جن سے شبلی کی نکتہ سنجی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا:

> ''شاعری اور انشا پردازی تمدن کے ساتھ چلتی ہے یعنی جس قسم کا تمدن ہوتا ہے اسی

قسم کی شاعری بھی ہوتی ہے، قوم کی ابتدائی ترقی کا جو زمانہ ہوتا ہے اس وقت شاعرانہ خیالات سادہ ہوتے ہیں، جب ترقی کرتی ہے اور تمام شریفانہ جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں تو گو شاعری میں جوش اور زور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اب بھی راستی اور سچائی کے مرکز سے نہیں ہٹتے کیوں کہ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب قوم ہمہ تن عمل ہوتی ہے، اس کے بعد جب عیش اور ناز و نعمت کی نوبت آتی ہے تو ہر بات میں تکلف، ساخت اور آورد پیدا ہو جاتی ہے، یہی زمانہ ہے جب شاعری میں مبالغہ شروع ہوتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ قدمائے اولین کے کلام میں بالکل مبالغہ نہیں جب کہ عباسیہ کا دور آیا اور عیش پرستی کی ہوا چلی تو مبالغے کا زور ہوا۔

''یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا سر سبزی اور شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعے سے انشا پردازی اور شاعری تک پہنچتا ہے، عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ جنگل، صحرا، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر بولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں لیکن یہی عرب بغداد میں پہنچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا، ایران ایک قدرتی چمن زار ہے بلکہ پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار، آبشاریں، بہار آئی اور تمام سرزمین، تختۂ زمرد بن گئی، باد سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزے کی مہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتا۔

اس حالت کا یہ اثر ہوا کہ ایران کی تمام انشا پردازی پر رنگینی چھا گئی، اس بنا پر رنگین بختی، رنگین نوائی، رنگین ادائی کے محاورات پیدا ہوئے، اس لفظ نے بہت سی اصطلاحیں پیدا کر دیں، جیسے رنگ بروئے کار، رنگ ریختن رنگ زدن، رنگ گرفتن، رنگ گزاشتن، رنگ ماندن۔ غرض جس مصدر کو چاہیں رنگ کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رنگینی کا خیال کس قدر چھایا ہوا ہے کہ جو بات زبان سے نکلتی ہے رنگین ہو کر نکلتی ہے، اسی طرح پھولوں کے افراط نے گل کے لفظ کو اس قدر عام کیا کہ کوئی چیز گل سے خالی نہیں، چراغ میں گل، آنکھ میں گل، شراب میں گل، پیکان میں گل، صبح کا گل،

چاند کا گل........"

ان اقتباسات اور شعرالعجم میں موجود ان جیسی بے شمار تحریروں سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شبلی کو شاعری اور سوسائٹی کے رشتے کا کتنا شدید احساس تھا، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شبلی حالی کے مقابلے میں سماجی شعور کم رکھتے تھے، شاید ان لوگوں نے شبلی کے ان نکتوں پر غور نہیں کیا جو فارسی شاعری کا محاکمہ کرتے وقت شبلی کے پیش نظر رہے ہیں، انصاف کی بات تو یہ ہے کہ عملی تنقید میں سماجی اور تاریخی شعور کی کارفرمائی مقدمہ شعر و شاعری سے کہیں زیادہ شعرالعجم میں ملتی ہے، شعرالعجم میں شبلی کا یہ شعور عروج پر نظر آتا ہے اور اپنے نتائج میں مشہور فرانسیسی نقاد تین کے تاریخی نظریہ تنقید سے حیرت انگیز حد تک مماثل نظر آتا ہے، ممکن ہے شعرالعجم کی تصنیف سے پہلے تین کی کتاب شبلی کی نظر سے گزری ہو اور شبلی نے تین کے نظریہ تنقید سے استفادہ کیا ہو، اس قیاس کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ شعرالعجم کی تصنیف سے پہلے شبلی فرنچ زبان سیکھ رہے تھے، مسٹر آرنلڈ سے ملنے پر انھیں اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ فرانسیسی زبان میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، شبلی نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ فرنچ کی کئی کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی ہیں، انھوں نے کچھ مصنفوں کے نام بھی گنوائے ہیں مگر ان میں تین کا ذکر نہیں ملتا، اگر تین کی کتاب شبلی کے پیش نظر رہی بھی ہو تب بھی یہ شبلی کا ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے تین کے فرانسیسی معیاروں پر پوری عجمی شاعری کا مدلل تنقیدی جائزہ پیش کیا اور اگر یہ معیار شبلی نے خود بنائے ہوں تو ان کا یہ کارنامہ اور بھی بڑا بن جاتا ہے۔

☆☆☆

شبلی کے نظریہ شعر کی معنویت

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ☆

تنقید کو نئی حیثیت سے روشناس کرانے میں حالی کے ساتھ شبلی نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے، بہ قول احسن فاروقی ''اردو تنقید کے موجدوں میں حالی کے بعد ان کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا، اور موازنہ انیس و دبیر کی اہمیت مقدمہ شعر و شاعری کے بعد ہمیشہ رہے گی (۱) کلیم الدین احمد بھی جو شبلی کو نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق تصور کرتے ہیں اور ان کے زاویہ نظر، ان کے اسلوب اور ان کی تنقید کے ساز و سامان میں پرانی تنقید کی جلوہ گری دیکھتے ہیں، اس حقیقت کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ شبلی نے جو سانچہ پیش کیا اسے آج بھی اردو نقاد استعمال کرتے ہیں (۲) اور یہ بڑی بات ہے جسے شبلی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بیشتر ناقدین بالعموم شبلی کی تنقید نگاری کے کلاسیکی، روایتی انداز اور مشرقی مزاج ہی کو اس کی اصل خصوصیت قرار دیتے ہیں، جس میں الفاظ اور اسلوب اظہار کی نفاست کو مضمون و مواد پر صریحاً فوقیت دی گئی ہے، شبلی اپنے اس انداز نقد کی بنا پر حالی سے مختلف نظر آتے ہیں جو ادب کے افادی پہلو کو اس کے جمالیاتی پہلو پر مقدم رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ حالی اور شبلی کے تنقیدی افکار میں کچھ مشترک پہلو بھی مل جاتے ہیں اور دونوں ادب کے سماجی اور اخلاقی پہلو پر خصوصیت کے ساتھ زور دیتے نظر آتے ہیں، تاہم یہ حقیقت ہے کہ بہ قول آل احمد سرور ادب کے جمالیاتی پہلو پر شبلی کی نظر زیادہ ہے، سرور صاحب کا واضح خیال ہے کہ شبلی فنونِ لطیفہ کی اہمیت سے زیادہ واقف ہیں، اسی لیے وہ اداسی کے مقابلے خوش نوائی اور سادگی کے مقابلے میں ادا پر زیادہ زور دیتے ہیں...... حالی ان تمام لوگوں کے رہنما ہیں جو شاعری کی سماجی بنیاد کو مانتے ہیں اور شبلی نے ان لوگوں کو تقویت پہنچائی جو بیسویں صدی میں تاثراتی

☆ شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس (یو۔ پی)

تنقید یا رومانی لہر کے مظہر کہے جا سکتے ہیں (۳) شبلی کی تنقید نگاری کا یہی وصف ہے جو ان کے یہاں بہترین اشعار کے انتخاب کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جس سے ان کے رچے ہوئے جمالیاتی شعور اور مزاج کی نمایندگی ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی نگارشات کی اہمیت آج بھی برقرار ہے، اور ان کی تنقید نگاری کی بعض خامیوں اور کمیوں کے باوجود خلیل الرحمٰن اعظمی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ شبلی نے ہماری کئی نسلوں کے ادبی مذاق کی تربیت کی ہے اور موجودہ دور میں بھی ہماری ادبی رہ نمائی کر سکتے ہیں (۴) شبلی کے تنقیدی نگارشات میں جہاں تک ادب وشاعری کے فنی پہلوؤں کی توضیح کا تعلق ہے بعض جہتوں سے حالی کے تنقیدی مباحث پر اضافہ قرار دی جا سکتی ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ حالی نے ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلو پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، گو اسے بالکل نظر انداز بھی نہیں کیا ہے، شبلی کے تنقیدی مباحث میں اس کے برخلاف ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلو پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، اور وہ شعراء کے کلام کی توضیح وتشریح کے ضمن میں اس پہلو کو بین طور پر اجاگر کرتے ہیں، وہ اپنے ادبی موقف کا اس جامع انداز میں اظہار کرتے ہیں:

> ''شاعری کے دو جزو ہیں مادہ وصورت یعنی کیا کہنا چاہیے اور کیوں کر کہنا چاہیے؟ انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش، مسرت، عشق ومحبت، درد ورنج، فخر وناز، حیرت واستعجاب، طیش وغضب وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں، ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصل ہے، اس کے سوا عالم قدرت کے مناظر مثلاً گرمی وسردی، صبح وشام، بہار وخزاں، باغ وبہار، دشت وصحرا، کوہ وبیاباں کی تصویر کھینچنا یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اسی میں داخل ہے لیکن یہ شرط ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے یہ شاعری کی جزو یعنی اس کی صورت ہے اور ان ہی دونوں جزوں کے مجموعے کا نام شاعری ہے۔'' (۵)

یہ امر قابل غور ہے کہ شبلی خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی، مبالغہ، صنائع وبدائع کو شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک یہ چیزیں کہیں کہیں نقش ونگار کا کام دیتی ہیں اور بس۔ (۶)

انھوں نے اسی بنیاد پر انیس کی شاعری کو جانچا ہے اور دبیر پر ان کی برتری واضح کی ہے، ساتھ ہی اپنے اس موقف کا بھی کھل کر اظہار کیا ہے کہ جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو اس کے سامنے میر انیس کی نسبت کمال شاعری کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ (۷) شبلی کا یہ خیال اگر صحیح ہے تو انھوں نے انیس و دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے اختلاف کی گنجائش نہیں رہ جاتی اور ان پر انیس کی بے جا طرف داری کا الزام عاید نہیں کیا جا سکتا۔

شبلی نے تنقید نقد کے باب میں جن بنیادی اصول اور نکات کی نشاندہی کی ہے جن پر وہ اپنی تصنیف شعر العجم میں شعرائے فارسی کے مطالعے میں کاربند نظر آئے ہیں اور موازنہ انیس و دبیر میں بھی انھوں نے انہی اصولوں اور نکات کی روشنی میں مطالعے کے نتائج کو معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کو اس مرحلے پر ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ احسن فاروقی نے موازنہ کے سلسلے میں یہ کہہ کر کہ دبیر مابعد الطبعیاتی اور انیس مصور شاعر تھے اور دونوں شاعروں کے مزاج اور انداز کے فرق اور تضاد کی بنا پر ایک کو دوسرے پر بہتر ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی، ایک مغالطہ انگیز رائے دی ہے جس سے تقابلی مطالعے کی صریحاً نفی ہوتی اور فن تنقید کی بنیاد پر ضرب پڑتی ہے، احسن فاروقی شاید یہ بھول گئے کہ کلیم الدین احمد نے انیس و دبیر کا موازنہ کیا ہے اور شبلی ہی کی طرح دبیر کو انیس سے کم درجے کا شاعر قرار دیا ہے، اور اس باب میں دونوں ناقدین کے نقطۂ نظر میں مماثلت صاف نمایاں ہے موازنے کے جواز میں خود شبلی کی یہ توضیح توجہ طلب ہے:

> ''اگرچہ دونوں صاحبوں کی انداز شاعری بالکل الگ الگ ہے تاہم واقعات ومضامین میں ہر جگہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ دونوں حریفوں کے اکثر مرثیے اور بند اور متفرق اشعار ایک دوسرے کے مقابلے میں لکھے گئے ہیں، یہاں تک بعض بعض بندوں میں مضمون ردیف اور قافیے تک مشترک ہیں، افسوس ہے کہ ان موقعوں پر یہ پتا نہ چل سکا کہ ابتدا کس نے کی اور جواب کس نے لکھا تاہم بعض قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا دبیر صاحب زیادہ تر مقابلے کا قصد کرتے تھے۔'' (۸)

موازنہ انیس و دبیر کی اساس شعری محاسن پر لکھی گئی ہے اور ان کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے اس ضمن میں فصاحت و بلاغت، تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع، جذبات انسانی، مناظر

قدرت، واقعہ نگاری اور رزمیہ جیسے عنوانات کے تحت کلام انیس کی خصوصیات اور فن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اسی کو انیس و دبیر کے موازنے کی بنیاد بنا کر اس کے باہم فرق و امتیاز کو نمایاں کیا گیا ہے۔ شبلی نے شعر کے ان تمام اجزا پر نہایت ہی تفصیل سے بحث کی ہے اور کلام انیس سے مثالیں دے کر انھیں خوب واضح کیا ہے۔ شبلی نے فصاحت کی تعریف اس طرح کی ہے ''لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس نہ ہوں، قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں (۹) وہ فصاحت کلام کے لیے صرف لفظ کا فصیح ہونا ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کا مفہوم اس طرح متعین کرتے ہیں۔ جب کسی مصرع یا شعر میں ایک خاص قسم کا تناسب، توازن اور توافق پایا جاتا ہے اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بھی بہ جائے خود فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرع یا شعر فصیح کہلاتا ہے، بلاغت کے باب میں فصاحت کو اس کا ایک جزو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو واقعہ کا بیان ساتھ میں اس طرح کیا جائے کہ اس کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائے، انھوں نے میر انیس کے کلام سے مثالیں دیکر اس کی جزئیات کو نمایاں کیا ہے۔ تشبیہات واستعارات، صنائع و بدائع، واقعہ نگاری اور رزمیہ وغیرہ ذیلی عنوانات کے تحت انھوں نے شعری اظہار کے جن پہلوؤں سے بحث کی ہے وہ حقیقتاً بلاغت ہی سے متعلق ہے جس کا مقصد شعری تجربات کی اصلیت اور صداقت کو اجاگر کرنا ہے، اگرچہ جذبات انسانی کو انھوں نے بلاغت سے الگ کر رکھا ہے، اور اس کے اظہار کو شاعری سے تعبیر کیا ہے مگر شعر العجم میں محاکات سے جس طرح بحث کی گئی ہے اور اسے شاعرانہ مصوری کے مفہوم میں لیا گیا ہے، جذبات انسانی کے اظہار کو اس سے بالکل الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، قابل غور بات یہ بھی ہے کہ تشبیہ واستعارے اور صنائع وبدائع کے استعمال میں بھی انھوں نے نیچرل حالت قائم رکھنے اور حقیقی حسن پیدا کرنے پر زور دیا ہے، گویا وہ لفظ و معنی کے ارتباط کو فراموش نہیں کرتے اور شعری زبان کا یک رخا پن تصور کرنے کے بہ جائے اس میں تجربے کی صداقت کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں، واقعہ نگاری میں بیان واقعی کے ساتھ ساتھ قدرتِ بیان اور فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

انیس و دبیر کا موازنہ بھی انھوں نے فنی نکات کی بنیاد پر کیا ہے، اور دونوں کے یہاں واقعات اور مضامین کے اعتبار سے کچھ دوسری جہتوں سے اشتراک و مماثلت کے بین پہلوؤں کو

سامنے رکھتے ہوئے اس کے انداز شاعری کا فرق مثالیں دے کر واضح کیا ہے۔ ان کی نظر میں مرزا دبیر کے یہاں وہ فصاحت وبلاغت نہیں جو میر انیس کا امتیاز ہے اور جو اصل شعری جوہر ہے، وہ میر انیس کو مرزا دبیر پر واضح فوقیت عطا کرتا ہے، وہ انیس و دبیر کے موازنے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جہاں تک بندش کی چستی، ترکیب کی دلآویزی، الفاظ کا تناسب اور برجستگی و سلاست کا تعلق ہے انیس، دبیر پر فائق ہیں البتہ خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی، تشبیہات و استعارات کی جدت وندرت مرزا دبیر کا طرۂ امتیاز ہے۔

شبلی نے شعر وشاعری کے جو اصول مقرر کیے ہیں، جن پر شعرالعجم جلد چہارم میں انھوں نے پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، ان کا موازنۂ انیس و دبیر میں کامیابی سے اطلاق کیا ہے، اس لحاظ سے وہ حالی سے یقیناً ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ حالؔی نے بھی یادگار غالب لکھی ہے جس میں غالب کے سوانح حیات کے ساتھ ان کی شاعری کی خصوصیات قلم بند کی گئی ہیں، مگر وہ غالب کے کلام کی تفہیم میں اپنے مقرر کردہ اصولوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں، یہ حالی اور شبلی کے درمیان ایک فرق ہے، حالی اور شبلی دونوں شاعری میں اصلیت اور واقعیت پر زور دیتے ہیں اور اسے مصوری سے مماثل قرار دیتے ہیں، شاعری کا اخلاقی پہلو بھی دونوں کے پیش نظر ہے، گو دونوں کے نقطۂ نظر میں اس لحاظ سے واضح فرق ہے، حالی شعر کے افادی پہلو کو اصل اہمیت دیتے ہیں جب کہ شبلی کے شعری نظریے کی اساس اس کا جمالیاتی پہلو ہے اور وہ شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز سمجھتے ہیں، حالی کی طرح شبلی بھی تخیل کو شعر کی ایک بنیادی شرط قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے مشاہدۂ کائنات کو ضروری سمجھتے ہیں، اگرچہ شبلی، حالی کی طرح شاعر کی قوت متخیلہ کو قوت ممیزہ کے تابع رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے خیال میں اس کی وجہ حالی اور شبلی کے تنقیدی مسلک کا فرق ہے جسے کلاسیکت اور رومانیت کے فرق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اعظمی صاحب کی یہ رائے بھی قابل غور ہے کہ تخیل کی تعریف اور اس کے دائرہ کار کی وضاحت میں شبلی کی نگاہ جن باریکیوں تک پہنچتی ہے وہاں تک حالی کا ذہن نہیں پہنچ سکا۔ (۱۰) واقعہ یہ ہے کہ شبلی نے تخیل کو قوت اختراع بتاتے ہوئے اس پر جس شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اس کا اعتراف ضروری ہے، بہ ظاہر حالی کی طرح شبلی کا بھی خیال ہے کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پہ ہے اسی قدر معنی پر نہیں اور اس بنا پر شبلی

کے تنقیدی موقف کے بارے میں یہ غلط تصور قائم کر لیا گیا کہ وہ لفظ و معنیٰ کے باہمی ربط سے واقف نہ تھے اور اس کی توجیہ یہ کی گئی کہ ان کے مذاق شعری کی تکمیل عربی و فارسی اصول نقد کے تحت ہوئی اور یہی سبب ہے کہ شبلی فصاحت و بلاغت کی بحث میں الجھ کر شعری تخلیق کے اندرونی مفہوم و معنیٰ تک نہیں پہنچ پائے اور ان کی تنقید شاعری کی بصیرت و آگہی کے شعور عطا کرنے کے بہ جائے ان کی ذاتی اور شخصی تاثرات کی روداد بن جاتی ہے، عبدالمغنی جنھوں نے کچھ عرصہ قبل اپنے ایک مضمون میں شبلی کی تنقید نگاری کا مفصل جائزہ لیا ہے، کلیم الدین احمد اور دوسرے ناقدین کے اس خیال کو درست نہیں سمجھتے کہ شبلی خیالات اور جذبات اور الفاظ کے ناگزیر تعلق سے بے خبر تھے، اس کے برخلاف ان کی تاویل یہ ہے کہ شبلی کے نزدیک بنیادی اہمیت معانی کی ہے اور الفاظ پر زور صرف ان کے ذریعہ اظہار ہونے کے سبب ہیں۔

شبلی نے جس طرح شعر العجم (جلد چہارم) میں شاعری کی حقیقت، شاعری کے عناصر اور اجزاء، وزن، الفاظ، بندش اور طرز ادا، محاکات، تخیل، شعر میں اصلیت اور شاعری کی عظمت پر روشنی ڈالی ہے، اس سے ان کا نظریہ تنقید واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے، فن شاعری کی بابت جن خیالات کا اظہار کیا ہے خصوصاً تخیل اور محاکات، الفاظ، تشبیہ اور استعارے کی جو بحث اٹھائی ہے وہ بے حد اہم ہے، یہ چند نکتے اس ذیل میں توجہ طلب ہیں:

> "شاعری ذوقی اور وجدانی چیز ہے...... منطقی پیرائے میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہے...... شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے، جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں، موسیقی، مصوری اور صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے...... شاعری اصل میں دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخیل...... محاکات کے معنیٰ کسی چیز یا حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس سے شئے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے...... تخیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے، محاکات اور تخیل دونوں شعر کے عناصر ہیں لیکن...... محاکات میں جو جان آتی ہے تخیل ہی سے آتی ہے ...... قوت محاکات کا کام یہ ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اس کو الفاظ کے ذریعہ سے بعینہٖ

ادا کر دے لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا تناسب اور توافق کو کام میں لانا، ان پر آب و رنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے.........

تشبیہ و استعارے سے کلام میں جو وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے وہ کسی اور طریقے سے نہیں پیدا ہو سکتا مثلاً اگر اسی مضمون کو کہ فلاں موقع پر نہایت کثرت سے آدمی تھے یوں ادا کیا جائے کہ وہاں آدمیوں کا جنگل تھا تو کلام کا زور بڑھ جائے گا، یہاں کلام کا اصل مقصد آدمیوں کی کثرت کا بیان کرانا ہے جنگل کی تشبیہ کی وجہ سے کثرت کا خیال متعدد وجہوں سے زیادہ ہو جاتا ہے۔......... (۱۲)

شعرالعجم کی پانچویں جلد جو دراصل حصہ چہارم کے شعری اقسام پر مفصل ریویو ہے، شبلی نے مثنوی، غزل اور قصیدہ کے علاوہ جن کی شناخت وزن، قافیہ اور ردیف کے لحاظ سے ہوتی ہے اس بنا پر ان کے خیال میں شعر کی یہ تقسیم علمی تقسیم قرار نہیں دی جا سکتی، شاعری کی حقیقت کے لحاظ سے اس کی باضابطہ معنوی اقسام مقرر کی گئی ہے، رزمیہ، عشقیہ، فخریہ، صوفیانہ، اخلاقی، فلسفیانہ وغیرہ جنھیں وہ شاعری کی علمی تقسیم کے زمرے میں رکھتے ہیں، شبلی کے نزدیک شعر کی اصل حقیقت مصوری یا تخیل ہے، مصوری میں خارجی مظاہرے کے ساتھ جذبات کی مصوری بھی شامل ہے، چنانچہ اس بنیاد پر غزل اور قصیدے کو جذباتی شاعری قرار دیتے ہیں اور مثنوی کو مظاہر قدرت کی مصوری سے عبارت بتاتے ہیں، تخیلی شاعری سے مراد شاعری کی وہ قسم ہے جس کو واقعیت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا اور اس میں موضوع اور اسلوب دونوں میں تخیلی پہلو غالب رہتا ہے۔

شبلی نے بہ ظاہر شعری اظہار کے صوری پہلو پر زیادہ توجہ دی ہے مگر اس کے معنوی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شعر کی معنویت کے اعتبار سے تقسیم کر کے فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری کا مفصل جائزہ لیا ہے اور ان کے موضوعات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ شبلی کے بارے میں ہمارے ناقدین متفق الرائے ہیں کہ وہ حالی کے افادی نقطۂ نظر پر ادب کے جمالیاتی پہلو کو مقدم رکھتے ہیں جس کی جڑیں اردو کی روایتی تنقید میں ملتی ہیں جسے شبلی نے ادبی مطالعے کی مضبوط اساس بنایا اور دیکھا جائے تو آج اردو تنقید پر اس لحاظ سے شبلی کا واضح اثر ہے جس میں ادب کو غیر ادبی معیاروں پر جانچنے پرکھنے کے بہ جائے اس کی ادبی وفنی

بنیادوں کو ترجیح دی جارہی ہے۔اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ شبلی کو اردو میں جدید ادبی تنقید کا بانی قرار دینا غلو نہ ہوگا۔

مصادر

(۱) اردو میں تنقید ص ۱۲۲

(۲) ملاحظہ ہو اردو تنقید پر ایک نظر ص ۱۱۹

(۳) ملاحظہ ہو سرور صاحب کا مقالہ ' اردو تنقید کے بنیادی افکار ' بشمولہ تنقید کے بنیادی مسائل مرتبہ آل احمد سرور ص ۲۰

(۴) ملاحظہ ہو مضامین نو ص ۵

(۵) موازنۂ انیس و دبیر ص ۱۲

(۶) تا (۱۰) ایضاً ص ۱۲، ص ۲۲، ص ۳۵

(۱۱) مضامین نو ص ۴

(۱۲) شعر العجم جلد چہارم ص ۱۸۴

☆☆☆

علامہ شبلی کی تعلیمی سرگرمیاں

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی ☆

علامہ شبلی کی شناخت عام طور سے ان کے علمی وادبی کارناموں اور سیرت وتاریخ سے متعلق ان کی شاہکار تخلیقات کے حوالہ سے کی جاتی ہے، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ کو ان تمام علوم وفنون میں ایک مجدد ومجتہد کی حیثیت حاصل ہے، تاریخ نگاری وسیرت نگاری میں قابل قدر پیش رفت ہونے کے باوجود عظمت کا تاج آج بھی مصنف سیرت النبی ہی کے سر ہے، نظری وعلمی تنقید کے جو نمونے شبلی نے پیش کئے ہیں ان میں بھی ابھی تک کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوسکا ہے، مشرق کی بازیافت کی جو گونج سنائی دیتی ہے اس کا سرچشمہ علامہ ہی کی ذات ہے، ان کے یہاں فرسودہ خیالات وافکار کی جگالی کے بجائے فکر وخیال کی تازگی اور اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے، آج بھی مستشرقین کی فکری یلغار کا جواب دینے کے لئے نگاہیں علامہ شبلی ہی کو تلاش کرتی ہیں۔

لیکن علامہ شبلی کی عظمت کا راز ان کی مذکورہ علمی وادبی فتوحات وکمالات تک ہی محدود رکھنا شبلی ہی کے ساتھ نہیں بلکہ پوری علمی دنیا کے ساتھ زیادتی ہوگی، علامہ شبلی کی شخصیت کے اور بھی روشن پہلو ہیں جو ان کی قد آور علمی وادبی شخصیت کے سامنے پس منظر میں چلے گئے ہیں، وقت کی اہم ضرورت اور شبلی شناسی کا تقاضا بھی ہے کہ علامہ کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تاکہ عہد حاضر میں علامہ شبلی کی معنویت کا جائزہ صحیح طور پر لیا جاسکے، علامہ شبلی کی تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ اسی تناظر میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی علامہ شبلی کی شخصیت کے روشن پہلو سامنے آسکیں۔

کسی دانشور یا عظیم شخصیت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاؤں ماضی کی گہرائیوں میں پیوست ہوں، اس کا سینہ اپنے عہد کی دھڑکنوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو اور اس کی نگاہیں مستقبل کی طرف ہوں، شبلی کی تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی

☆ صدر شعبۂ عربی، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

کے اندر یہ تینوں خوبیاں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں، جہاں تک ماضی سے جڑے ہوئے ہونے کا سوال ہے تو ان کے مزاج اور ذہنی ساخت کا اندازہ ان کے اس مشہور جملے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''پیچھے ہٹتے جاؤ، پیچھے ہٹتے جاؤ، یہاں تک کہ صحابہ کی صفوں میں شامل ہو جاؤ'' ظاہر ہے کہ اس نقطہ نظر کا حامل شخص اپنی شناخت کھونے اور اپنے ماضی کے ورثہ سے دست بردار ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، علامہ شبلی ماضی کے علمی ورثہ اور تعلیمی نظام کی اہمیت کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ اس کی حفاظت کو اپنی زندگی کا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔ قدیم تعلیم اور تعلیمی مراکز سے لگاؤ اور ان اداروں کی اصلاح و ترقی کے لئے علامہ شبلی کی کوششیں ہماری قومی تاریخ کا روشن ترین باب ہیں، لیکن علامہ شبلی حال و مستقبل کے تقاضوں سے غافل اور نا آشنا نہیں تھے، انھوں نے قدیم نصاب تعلیم میں اصلاح اور انگریزی و سنسکرت زبانوں کی نصاب تعلیم میں شمولیت کے سلسلے میں جو آواز اٹھائی وہ ان کے مستقبل پر نظر رکھنے والے مفکر اور زمانے کے ماہر نبض شناس ہونے کی دلیل ہے، اس سلسلے میں مقالات شبلی جلد سوم کے مطالعہ سے صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ شبلی کو تعلیم و تعلیمی سرگرمیوں سے کتنی گہری دلچسپی تھی، انھوں نے ہند و بیرون ہند کے قدیم تعلیمی نظام کا مکمل و مدلل جائزہ پیش کر کے ان میں اصلاح و اضافہ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ مقالات شبلی میں ملا نظام الدین علیہ الرحمہ بانی درس نظامیہ کی شخصیت اور اس کی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں ''ہمارے نزدیک ضروریات زمانہ کے لحاظ سے درس نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے۔'' (مقالات حصہ سوم ص ۱۰۱۔ مرتبہ مولانا سلیمان ندوی، معارف پریس ۱۹۵۵ء)

علامہ شبلی نے صرف تعلیمی خاکے ہی نہیں پیش کئے بلکہ ان کو عملی شکل بھی دینے کی کوشش کی، اس لحاظ سے وہ صرف نظریہ سازی ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنے اصول و نظریات کو برت کر دکھایا بھی، کاش علامہ شبلی کی کاوشیں ان نام نہاد دانشوروں کی آنکھیں کھول سکتیں جو اپنے AC ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر تعلیمی اصلاح کی لمبی چوڑی باتیں تو کرتے ہیں لیکن ان کے تعلیمی اداروں کی ویران کلاسز اور اجاڑ لائبریریاں ان کے تعلیمی نظریات اور بلند بانگ دعوؤں کی قلعی کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔

علامہ شبلی ایک عملی انسان تھے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیمی خدمات میں گزرا، ان کے

تدریسی سفر کی ابتدا علی گڑھ سے ہوئی، شبلی علی گڑھ ایک ناپختہ اور محدود ذہن لے کر گئے لیکن سرسید کی صحبت اور ان کے ذوق مطالعہ نے ان کے ذہن کو وسعت اور علمی مسائل کو وسیع پس منظر میں سوچنے اور پیش کرنے کی صلاحیت بخشی، علامہ شبلی کو خود اس بات کا اعتراف تھا کہ اگر انہیں سرسید کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو وہ ایک تنگ نظر مولوی یا مناظرہ باز ہی بن پاتے، شبلی کا یہ اعتراف ایک شریف انسان کا اظہار تشکر اور احسان شناسی کے جذبہ کا اظہار ہے لیکن یہ سوال بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے کہ سرسید کی صحبت سے فیض یاب ہونے والوں میں کوئی اور شبلی کیوں نہیں پیدا ہوا، پھر سرسید کی شبلی سازی اور علمی دنیا کے سامنے شبلی جیسے روشن دماغ اور انقلابی شخصیت کو لانا سرسید کا ایسا کارنامہ ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، سرسید کا یہ کارنامہ میرے نزدیک مسلم یونیورسٹی کے قیام اور ان کی دیگر علمی خدمات سے کسی طرح بھی کم نہیں، یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شبلی نے علی گڑھ سے جتنا حاصل کیا تھا اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ کو لوٹا دیا، علی گڑھ کے طلبہ میں علمی ذوق پیدا کرنے اور ان کے اندر تحریری و تقریری صلاحیت بیدار کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں، اس دور کے طالب علموں کے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی کوششوں کا یونیورسٹی کی علمی فضا پر کتنا گہرا اثر پڑا تھا بالخصوص مولانا کے درس قرآن نے طلبہ کے ذہنوں کو کافی متاثر کیا تھا، علامہ شبلی نصابی کتب کی تدریس ہی کو صرف اپنا تعلیمی منصب نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ کلاس روم سے باہر بھی اہم مسائل اور دور عہد حاضر کے تقاضوں سے متعلق اپنے طالب علموں کو آگاہ کیا کرتے تھے، مولانا محمد علی جوہر کی انقلابی شخصیت کی تعمیر میں علامہ شبلی ہی کا ہاتھ تھا، مولانا محمد علی جوہر کو خود اعتراف تھا کہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں علامہ شبلی کے درس قرآن کا ہاتھ تھا جو وہ علی گڑھ میں دیا کرتے تھے۔

علامہ شبلی ایک مشرقی ذہن لے کر علی گڑھ گئے تھے، لیکن یونیورسٹی کے ماحول سے مرعوب یا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے بجائے یونیورسٹی کی فضا کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی، طالب علموں کی مذہب بیزاری اور کم مائیگی پر انھیں برابر ٹوکتے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھانے کی کوشش کرتے کہ انگریزی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہئے لیکن مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب کے اثرات بد سے محفوظ رکھنا چاہئے، اپنی شناخت کھودینے اور اپنی جڑ سے کٹ جانے

والے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی کم مایہ، مفلس اور قلاش نہیں۔ علامہ شبلی کو خود اس بات کا احساس تھا کہ طلبہ کے ذہنوں پر ان کی تعلیمی کوششوں اور سرگرمیوں کے مثبت اثرات ظاہر ہوئے، چنانچہ اپنے دوست مولوی حکیم محمد عمر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔'' (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۷۴، طبع چہارم، مطبوعہ ۱۹۶۶ء)

ندوہ کو بھی ندوہ بنانے میں علامہ شبلی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، علامہ شبلی ندوہ پہنچے تو ندوہ کی حیثیت ایک مکتب سے کچھ ہی زیادہ رہی ہوگی، علامہ شبلی کی کوشش سے ندوہ نے اپنے زمانے کی ایک ممتاز درس گاہ کی شکل اختیار کی، علامہ شبلی نے طلبہ کو نصابی علوم کے ساتھ ساتھ عصری مسائل سے آگاہی حاصل کرنے اور موجودہ عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھالنے کا سلیقہ سکھایا، سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کے کارناموں کا جائزہ لیجیے خود اندازہ ہو جائے گا کہ علامہ شبلی کی کوششوں سے ندوہ نے علمی دنیا کو کیسی کیسی قدآور شخصیتیں دیں، افسوس کہ ندوہ والوں نے مولانا کی قدر نہیں کی اور مولانا کو ندوہ سے رشتہ توڑ لینے پر مجبور کیا، علامہ شبلی کو ذہنی صدمہ اس تکلیف دہ حادثہ سے یقیناً پہنچا ہوگا لیکن ندوہ کے ارباب حل وعقد کی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی پر بھی سوالیہ نشانات لگا دیئے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر جو آج بھی تاریکیوں میں علم وہدایت کی روشنی بکھیر رہا ہے وہ علامہ شبلی پھر مولانا فراہی کی کوششوں سے اس مقام بلند تک پہنچا، دارالمصنفین کا قیام علامہ کی زندگی میں عمل میں نہیں آسکا لیکن علامہ نے مکمل طور پر اس کا مکمل خاکہ پیش کر دیا تھا جسے ان کے شاگردوں نے عملی شکل دی، شبلی نیشنل کالج تو شبلی کے نام سے منسوب ہی ہے، جو پورے ملک بالخصوص یوپی کی تعلیمی ضروریات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پوری کر رہا ہے، اگر اس کالج کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا پاکٹ اڈیشن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

علامہ شبلی کی تعلیمی فیض بخشی کا سلسلہ ان مذکورہ تعلیمی اداروں ہی تک محدود نہیں، علامہ شبلی کی تحریریں آنے والی نسلوں کے ذہن وفکر کو صحیح سمت دیتے اور وہم وتشکیک کے اندھیروں میں رہنمائی کرنے میں چراغ راہ کا کام کر رہی ہیں، یہ علامہ شبلی اور ان کے تیار کردہ ذہنوں کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ صحت مند فکر کے سوتے خشک نہیں ہو پائے، مادی طوفانوں کے بڑھتے ہوئے دھاروں کا رخ

موڑنے فکری یلغار کو روکنے اور مغربی طلسم کو توڑنے کی کوششیں آج بھی جاری ہیں۔

علامہ شبلی کی تعلیمی سرگرمیوں کا اندازہ ان کے خطوط سے بھی اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے، یہ خطوط ان کے قلبی اضطراب کے آئینہ دار اور قومی وملی دردمندی کے مظہر ہیں، زیادہ تر خطوط میں تعلیمی مسائل، تعلیمی اداروں اور کتابوں کا تذکرہ ہے، نجی خطوط بھی خانگی اور ذاتی امور کے بجائے تعلیمی مسائل کے لئے وقف نظر آتے ہیں، ان خطوط میں ایک مفکر کی سنجیدگی، ایک مسیحا کی دردمندی اور کسی ایسے سپہ سالار کی جھلاہٹ کا انداز نظر آتا ہے، جسے اندازہ ہو گیا ہو کہ اس کے سپاہی اس کا ساتھ پوری طرح نہیں دے رہے ہیں، اسے اپنی ٹوٹی ہوئی تلوار سے خود ہی معرکہ سر کرنا ہے، ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے کالج کے قیام اور اس کو ترقی دینے کے لئے کتنی مشقت اور ذہنی اذیت برداشت کی، زمین دار ہونے کے باوجود روپیہ دو روپیہ کا چندہ وصول کرنے کے لئے متعلقین کی منت وسماجت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، عزیزوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے ہیں اور ان کی غیرت وہمت کو للکارنے اور انہیں ہدف ملامت بنانے سے نہیں ہچکچاتے، وہ ملک سے باہر بھی جاتے ہیں تو تعلیمی مسائل اور مدرسوں کا خیال ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے، وہ مصر اور ترکی کے مدرسوں اور کتب خانوں کو دیکھتے ہیں تو انھیں اپنے ملک کے مدرسوں اور کتب خانوں کی فکر ستانے لگتی ہے، وہاں کلاسز میں طالبات نظر آتی ہیں تو اپنے دیار میں تعلیم نسواں کا خیال دامن گیر ہو جاتا ہے۔

علامہ شبلی کی تعلیمی سرگرمیاں تعلیم سے جڑے ہوئے ہر شخص کے لئے مشعل راہ ہیں، علامہ جس ادارہ سے بھی وابستہ رہے وہاں پورے خلوص کے ساتھ طلبہ کی ذہنی تعمیر، کردار سازی اور ان کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی، اپنی ذاتی صلاحیت اور کوشش سے متعلقہ تعلیمی اداروں کی بے رنگ فضا کو علمی رنگ عطا کیا اور غیر صحت مند علمی ماحول کو صحت مند علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، اس طرح ان اداروں کو قوم وملک کی نگاہوں میں وزن، وقار اور اعتبار حاصل ہوا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم علامہ شبلی کے روشن کردہ فکر ونظر کے چراغوں کو روشن کریں، ان کے تعلیمی پیغام کو عام کریں اور ان کے دل میں قومی دردمندی کا جو آتش کدہ روشن تھا اس کی آگ سے ہر ایک دل کو پرسوز اور ہر نفس کو شعلہ نفس بنانے کی کوشش کریں۔

☆☆☆

موازنۂ انیس ودبیر کی اہمیت

ڈاکٹر شباب الدین☆

نومبر ۲۰۰۷ء میں علامہ شبلی کی وفات کو ترانوے سال پورے ہو چکے ہیں، اس عرصے میں علم وادب کی دنیا میں بڑے بڑے انقلاب اور نئی نئی تحریکیں اٹھیں، مگر علامہ کی تصانیف کی ندرت، معنویت اور اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے، ترانوے برسوں میں سیرت کے موضوع پر متعدد کتابیں معرضِ وجود میں آچکی ہیں اور بعض بعض کتابیں تو معاندانہ انداز میں بھی لکھی گئی ہیں، مگر شبلی کی سیرت النبیؐ سے اہل علم کا استفادہ آج بھی جاری ہے اور یہی عہد حاضر میں شبلی کی تحریروں کی معنویت کی ایک روشن اور واضح دلیل ہے، سیرت النبی کے علاوہ ان کی شعر العجم ہو یا سوانح مولانا روم، علم کلام ہو یا الکلام، سیرت النعمان ہو یا الفاروق۔ شبلی کی ہر کتاب آج نہ صرف پڑھی جاتی ہے بلکہ بطور حوالہ بھی استعمال کی جاتی ہے، ان ترانوے برسوں میں علم وادب کا کارواں جس سرعت کے ساتھ آگے بڑھا ہے اسی سرعت سے علامہ شبلی سے اختلاف کرنے کے نئے نئے گوشے بھی نکل آئے ہیں، یہ وہ گوشے ہیں جو علامہ شبلی کی حیات میں موجود مگر نہ معلوم تھے، ان کے معلوم ہو جانے کے باوجود علامہ شبلی کی تصانیف کی معنویت آج بھی برقرار ہے، اپنی بات کی وضاحت کے لئے ہم نے علامہ کی ''موازنۂ انیس ودبیر'' کا انتخاب کیا ہے، صرف اسی ایک کتاب کے مطالعے سے ہماری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

''موازنۂ انیس ودبیر'' اردو کی پہلی تنقیدی کتاب ہے جس سے ہمارے ادب میں عملی تنقید کی داغ بیل پڑی، موازنہ کی اہمیت صرف اسی میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اس لئے بھی

☆ صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔

ہے کہ اس کتاب میں پہلی بار صنف مرثیہ پر تاریخی وتنقیدی نظر ڈالتے ہوئے دو باکمال مرثیہ نگاروں کے کلام کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ ''موازنہ'' کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور شبلی کا شمار اردو کے صف اول کے ناقدین میں ہونے لگا۔ شبلی اردو شاعری کے بارے میں اپنے زمانے کے انگریزی خوانوں کے اس خیال کی تردید کرنا چاہتے تھے کہ ''اردو شاعری میں زلف وخال وخط، یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔(۱)'' اسی مقصد کے تحت یہ معرکہ آراء تصنیف عالم وجود میں آئی۔ شبلی کے الفاظ میں موازنہ انیس و دبیر لکھنے کا اصل مقصد یہ تھا:

''مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظاً وتنقیداً لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان، کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اوصاف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔''(۲)

موازنہ انیس و دبیر کا آغاز مرثیہ کی مختصر تاریخ سے ہوتا ہے، اس کے بعد شاعری کے مختلف محاسن کا جائزہ الگ الگ عنوانات کے تحت لیا گیا ہے، میر انیس کی شاعرانہ خصوصیات کی ضمن میں فصاحت و بلاغت کی تعریف، روزمرہ ومحاورہ، بحروں کا انتخاب، لفظوں کا برمحل استعمال، بندش کی چستی، تشبیہات واستعارات، انسانی جذبات واحساسات، منظر نگاری، واقعہ نگاری، کردار نگاری اور رزمیہ و بزمیہ شاعری پر مفصل بحث کی گئی ہے اور کثرت سے مثالیں پیش کی گئی ہیں، ''موازنہ'' کو مکمل تنقیدی کتاب بنانے کے لئے ایک باب میں میر انیس کے کلام پر اعتراضات بھی کئے گئے ہیں اور اخیر میں انیس و دبیر کے قریب المعنی اشعار کے فنی محاسن کا جائزہ لیتے ہوئے دونوں مرثیہ نگاروں کا موازنہ کیا گیا ہے، اس طرح علامہ شبلی نے صنف مرثیہ کی تاریخ اس کے دائرۂ اثر اور اس کی صناعی کے ساتھ ساتھ انیس و دبیر کے شاعرانہ کمالات سے بھی ادبی دنیا کو روشناس کرایا، موازنہ سے قبل ''آب حیات'' اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں بھی مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کا مختصر ذکر ملتا ہے لیکن یہ شبلی کے قلم کا اعجاز تھا کہ انھوں نے صنف مرثیہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے اس کو دیگر ادبی اصناف کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کر دیا اور دنیائے علم وادب کی توجہ کا مرکز بنا دیا، چنانچہ موازنہ کی

اشاعت کے بعد متعدد رسالے اور کتابیں اس کے جواب میں لکھی گئیں، جس میں ''ردالموازنہ''، ''تردید موازنہ'' اور ''المیزان'' کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان میں ''المیزان'' دوسری کتابوں کی بہ نسبت تفصیلی بھی ہے اور کچھ نہ کچھ علمی انداز کی حامل بھی، جہاں تک دوسری کتابوں کا تعلق ہے وہ تو کب کی دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکیں اور تاریخوں میں ان کے نام صرف اس لئے محفوظ ہیں کہ وہ موازنہ کے جواب میں لکھی گئی تھیں، مصنف المیزان نے ''موازنہ'' کے ہر عنوان پر نظر ڈالی ہے، اور ان کے نزدیک اس کتاب میں جو کمزوریاں اور خامیاں ہیں ان کی طرف واضح اشارے کئے ہیں، علاوہ برایں مرزا دبیر کے کلام سے وافر مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا دبیر، میر انیس سے کسی طرح کم درجہ کے شاعر نہیں ہیں، دبیر کے کلام میں بھی وہ تمام شعری محاسن ملتے ہیں جن کو شبلی نے انیس کا طرۂ امتیاز قرار دیا ہے، اس لئے صاحب المیزان کے خیال میں ان دونوں باکمالوں میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، مزید برآں شبلی نے دبیر پر انیس کو فوقیت دے کر نا انصافی کی ہے۔

چودھری نظیر حسین فوق صاحب المیزان نے شبلی پر جو ''فرد جرم'' عاید کی ہے وہ بڑی سنگین ہے، ان ہی ''جرائم'' کے پوست کندہ حالات واضح کرنے کے لئے انھوں نے چھ سو دس (۶۱۰) صفحات کی ضخیم کتاب تحریر فرمائی ہے، لیکن جب ہم ان کے فرمودات کا علامہ شبلی کی تحریروں سے باہمی مقابلہ و موازنہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ چودھری صاحب الفاظ کے طوطا مینا اڑا رہے ہیں، ان کو شبلی کے کسی نہ کسی لفظ پر گرفت کر کے ان سے بہر حال اختلاف کرنا ہے، مصنف کی یہ روش کتاب کے پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک قائم رہتی ہے، خود کو غیر جانب دار قرار دینے کے لئے یہ اعلان بھی فرماتے ہیں کہ وہ شبلی کے مقابلے میں انیس سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ (۳) لگے ہاتھوں وہ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ شبلی نے دبیر جیسے عابد، زاہد اور مداح اہل بیت کی شان میں گستاخی کی ہے۔ (۴) مگر یہ نہیں بتاتے کہ شبلی کے کن الفاظ سے گستاخی کا پہلو نکلتا ہے، فصاحت و بلاغت کا باب ہو یا واقعہ نگاری کا، بحروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا تشبیہات و استعارات کا، (۵) شبلی کے قائم کردہ ہر عنوان سے چودھری صاحب اختلاف کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، ان کو شبلی کی کوئی بات سیدھی نظر نہیں آتی شبلی نے اگر موازنہ لکھنے کے بجائے صرف انیس کے محاسن کلام سے بحث کی

ہوتی اوران کا موازنہ مرزا دبیر سے نہ کیا ہوتا تو ہماری رائے میں چودھری صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہوتا، خود چودھری صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ شبلی اگر صرف انیس کے کلام پر کتاب لکھتے تو انیسیے ہی نہیں دبیریے بھی خوش ہوتے۔(۶) ہمارے نزدیک شبلی نے موازنہ کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ اردو میں عملی تنقید کی بنیاد ڈالنے کے لئے لکھی تھی، چوں کہ یہ ایک نئی چیز تھی اس لئے اس کی مخالفت ہوئی اور خوب ہوئی، المیزان کا شہرہ بھی وقتی ثابت ہوا شبلی کی کتاب ''موازنہ انیس ودبیر'' آج بھی پڑھی جاتی ہے اور ہر جگہ اس کے لاتعداد نسخے مل جاتے ہیں، مگر ''المیزان'' کو لوگ بھول چکے ہیں اور اگر اس کا ذکر کبھی آتا ہے بھی ہے تو اس عنوان سے کہ یہ کتاب شبلی کی کتاب سے اختلاف کرتے ہوئے لکھی گئی تھی۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب ''ردالموازنہ'' ہے جو بہتر (۷۲) صفحات پر مشتمل بڑی تقطیع کی کتاب ہے، یہ کتاب لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی، کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے، جو چار منظوم تاریخیں آخر میں درج ہیں، ان میں تین سے ۱۳۲۶ھ برآمد ہوتا ہے اور ایک سے ۱۳۲۵ھ، اس لئے یہ کتاب ان دونوں سنین کے درمیان لکھی گئی ہوگی، اس کے مصنف افضل علی ضو ہیں، جو لکھنؤ کے محلہ کاظمین کے رہنے والے تھے، اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ چونکہ شبلی کا مولد نہ دہلی تھا نہ لکھنو، اس لئے صاحب ردالموازنہ کے نزدیک ان کی تحریر پایۂ اعتبار کو نہیں پہنچ سکی (۷) اس کتاب میں جس انداز نگارش کو تنقید کا نام دیا گیا ہے وہ تو اپنی موت آپ مرچکا ہے، البتہ اگر کبھی غیر سنجیدہ تنقیدی روش کی کوئی تاریخ مرتب کی جائے گی تو ''ردالموازنہ'' اس کے لئے بنیادی مواد کا کام دے گی۔

''تردید موازنہ'' تقریباً ساڑھے دس ہزار الفاظ (چالیس صفحات) پر مشتمل ہے، اس کا لب ولہجہ بھی جارحانہ اور غیر سنجیدہ ہے، سرورق کی ایک عبارت یہاں نقل کی جارہی ہے، صرف اسی ایک عبارت سے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کتاب کن کن لطائف وظرائف سے پر ہے۔

''جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا''

دشت وحشت میں چمن کا لطف مل سکتا نہیں
غنچہ وگل کی روش سے خار کھل سکتا نہیں

تردید موازنہ

جناب مولوی شبلی صاحب نعمانی نے ترکیب تحریر موازنہ سے جناب میر انیس صاحب ومرزا دبیر صاحب کے کمال سخن وری کو عوام الناس میں مٹا کے ترجیح کے مسند پر خود جلوہ فرمانا چاہا تھا، لیکن خدا کی بڑھائی ہوئی عزت وشہرت کو انسان کی کیا مجال ہے کہ گھٹا سکے۔ اس کو مصنف جناب شیخ حسن رضا صاحب سے شمس الشموس عروج سخنوری، قمر الاقمار بروج نکتہ پروری، معجز بیان، جناب شیخ محمد جان عروج کی ہوائے تقریر باتوقیر سے ان کے ایراد بے جا کو مثل گرد وغبار کے اڑادیا اور معترض کی ناواقفی ونافہمی اور زبان اردو سے بدمذاقی کا ثبوت دے کر صاحبان انصاف کے روبہ رو حق وباطل کو ظاہر کردیا:

خزاں چمن میں جو آئی تھی خاک اڑانے کو

برس کے ابر بہاری نے صاف دھو ڈالا

بہ اہتمام داروغہ سید محمد پروپرائٹر در مطبع تصویر عالم لکھنؤ مطبوع گردید، محمد علی پریس میں ساکن ڈالی گنج نے چھاپا، (شائقین کو یہ کتاب دفتر مطبع مشرق نور مظفر پور سے بہ قیمت مل سکتی ہے۔)''

سید افضل حسین ثابت کی ''حیات دبیر'' موازنہ انیس ودبیر کی رد میں تو نہیں لکھی گئی تاہم انھوں نے چند مقامات پر موازنہ کے بعض خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے شبلی پر جو ''فرد جرم'' عاید کی ہے وہ کچھ یوں ہے، انھوں نے شبلی کے افکار وخیالات کو ناواقفیت اور نافہمی سے داغدار بتایا ہے اور اپنی دانست میں اس کی بہت سی مثالیں دے کر شبلی کے ہر خیال کو غلط ٹھہرایا ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ شبلی کی ہر بات سو فیصد صحیح ہو، کیوں کہ شعر کی تشریح، توجیہ اور تعبیر میں اختلاف کی گنجائش رہتی ہے لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ شبلی نے کلام دبیر پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ سب کے سب یکسر غلط ہیں، اصل معاملہ یہ ہے کہ جس وقت موازنہ کی رد میں دوسری کتابیں لکھی گئی تھیں اس وقت کی لکھنؤ کی ادبی فضا دو واضح گروہوں میں تقسیم تھی، انیسیوں کو دبیریوں کی کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی اور دبیریوں کو انیسیوں کی۔ موازنہ میں چوں کہ شبلی نے دبیر کے مقابلہ میں انیس کی شاعری کو سراہا ہے اور دبیر کے

مقابلے میں انیس کو بڑا ہی نہیں، بہت بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ان کو انیسیہ سمجھا گیا، موازنہ کے جواب میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں وہ سب کی سب دبیریوں کی لکھی ہوئی ہیں، اس طرح کی جو کتابیں سامنے آئیں ان میں اور "حیات دبیر" میں ایک بات ضرور مشترک ہے کہ ہر کتاب کے مصنف کو یہ اعتراض ہے کہ لکھنؤ کے شعراء کی زبان پر کس طرح انگلی اٹھائی گئی۔ (۸) ان کو تو زعم یہ ہے کہ اہل لکھنؤ یا اہل دہلی ہی زبان کے لحاظ سے واقعتاً اور خالصتاً "عرب" ہیں، ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ان عربوں کے سامنے اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے جو زمانہ جاہلیت کے عجمی عربوں کے سامنے رکھتے تھے، موازنہ سے پہلے شبلی کے قلم سے جتنی بھی تحریریں نکلیں ان کو اہالیان ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی زبان دانی پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا گیا لیکن موازنہ کے شائع ہوتے ہی شبلی کا سارا علم و فضل، ادب و انشاء حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔

شبلی پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انھوں نے دبیر کے غلط سلط اشعار نقل کئے اور سنے سنائے اشعار بھی ان ہی کے نامۂ اعمال میں داخل کر کے ان پر اعتراضات کئے، ہم کو اس بات کو ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ شبلی نے سہواً دبیر کے غلط اشعار لکھے ہیں لیکن اس کی وجہ وہی ہے جو خود صاحب حیات دبیر نے لکھی ہے (۹) یعنی یہ کہ شبلی نے مطبع نول کشور کے مطبوعہ نسخہ کو اپنے پیش نظر رکھا اور اس سے اشعار نقل کئے، جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی، اس سلسلے میں ان کی مجبوری یہ تھی کہ ان کے پاس مراثی کے مخطوطے نہ تھے جن کے باہمی موازنہ و مقابلہ سے وہ درست متن متعین کرتے اور پھر اس کو اپنی کتاب میں درج کرتے، لطف کی بات یہ ہے کہ کسی سخن سنج نے مطبع نول کشور کے مطبوعہ مراثی دبیر پر نہ کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی اس بات کی کوشش کی کہ دبیر کے کلام کا متن درست ہو جائے، مگر جب شبلی نے مطبوعہ مجموعے سے اشعار نقل کئے تو ان پر الزام عاید کیا گیا کہ وہ دبیر کو متہم کرنے کی مہم چلائے ہوئے ہیں، شبلی کی موازنۂ انیس و دبیر صاحب حیات دبیر کی نگاہوں میں کیا وقعت رکھتی ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک اقتباس پڑھ لینا کافی ہوگا:

"یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی کتاب کا نام موازنۂ انیس و دبیر رکھا ہے اور دو سو پچاس صفحے کی وہ کتاب ہے، پندرہ سولہ صفحے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھنے

میں صرف فرمائے ہیں، باقی قریباً دو سو صفحے پر کلام میر انیس مرحوم مع تنقید و مدح درج ہے، مرزا مغفور کے کلام کے واسطے فقط پندرہ سولہ ورق صرف کئے ہیں، اور اکثر وہ کلام لکھا ہے جوان کے نزدیک قابل قدح ہے، کیوں انصاف پسند ناظرین! کیا موازنہ کی یہی شان ہے اور اس کتاب کو موازنہ کہہ سکتے ہیں، مرزا دبیر (جن کی مطبوعہ بیس جلدیں اور اسی قدر غیر مطبوعہ بتائی جاتی ہیں) کا کلام تو پندرہ سولہ ورق میں لکھا جائے اور میر انیس مرحوم کے واسطے دو سو صفحہ وقف کئے جائیں (جن کی تصنیف مطبوعہ پانچ چھ جلدوں سے زیادہ نہیں ہے) کیا یہی انصاف ہے، میں کہتا ہوں بفرض محال اگر کل کلام دبیر مندرجۂ موازنہ بھی پست ہو جب بھی تو کمالات دبیر میں فرق نہیں آسکتا، کیوں کہ وہ کلام تو کل کلام کا ۱۰ ا/ا حصہ بھی نہیں ہے، اگر کسی شاعر کے ننانوے (۹۹) شعر اچھے ہیں اور ایک سست ہے تو کیا وہ شاعر قابل قدح ہے؟ ہرگز نہیں، یہ مولوی صاحب کا انصاف قابل غور ہے۔ (۱۰)

یہاں بھی جذبہ وہی کارفرما ہے کہ اگر شبلی کو مرثیہ پر کچھ لکھنا ہی تھا تو وہ صرف انیس کے کلام پر کتاب لکھ دیتے، دبیر کو درمیان میں کیوں لائے؟ موازنہ انیس و دبیر اب سے سو برس پہلے لکھی گئی تھی، اس کتاب کو لکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ علم و ادب کی دنیا میں ایک ہلچل پیدا ہو، اسی لئے شبلی نے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک ایسا پتھر پھینکا کہ اس کی لہریں آج تک جوار بھاٹا بنی ہوئی ہیں۔

موازنہ کے روز تصنیف سے لے کر آج تک برابر اس کتاب پر کچھ نہ کچھ لکھا جا تا رہا ہے، جب بھی کوئی نقاد اردو تنقید کی تاریخ پر قلم اٹھاتا ہے، صنف مرثیہ کی تاریخ مرتب کرتا ہے یا کسی مرثیہ گو کے حیات و ادبی آثار کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتا ہے تو شبلی کا موازنہ ضرور زیر بحث آتا ہے، خواہ اس سے اتفاق کیا جائے خواہ اختلاف، خود ہمارے عہد میں موازنہ کی مخالفت یا موافقت میں اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو بلا مبالغہ جہازی سائز کی کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں گی، موازنہ کے شائع ہونے کے بعد جو ردعمل ظاہر ہوئے وہ دو طرح کے تھے، ایک انتہا پسندانہ اور دوسرے ہمدردانہ، انتہا پسندانہ ردعمل کے اظہار کے طور پر جو مقالے یا کتابیں لکھی گئیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ شبلی کو "سراپا جرم" بنا کر پیش کیا گیا، ان کی زبان، شخصیت، قومیت، نوامین سے ان

کا انہلاک غرض کہ ہر بات کا ناروا الفاظ میں چٹخارے لے لے کر ذکر کیا گیا، ہمدردانہ ردعمل میں جو خیالات منظر عام پر آئے ان میں شبلی کو خطا و نسیان سے پاک تو نہیں قرار دیا گیا، مگر یہ ضرور کہا گیا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں لکھا؟ اور جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں شبلی کے تنقیدی نظریات سے اختلاف بھی کیا گیا ہے، شبلی کی ذات اور شخصیت کا مذاق نہیں اڑایا گیا ہے، آج بھی یہ دونوں نقطۂ نظر باقی ہیں، ہمارے نزدیک میر عابد علی عابد انتہا پسندانہ اور سید احتشام حسین نے ہمدردانہ اور متوازن نقطۂ نظر سے موازنہ انیس و دبیر پر نظر ڈالتے ہوئے عہد حاضر میں اس کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۹۶۴ء میں سید عابد علی عابد نے موازنہ کا ایک انتقادی متن تیار کر کے اس پر ایک طویل مقدمہ لکھ کر مجلس ترقی ادب کلب لاہور سے شائع کیا، اس مقدمہ کی عبارت پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ''ردالموازنہ'' کے جذبات و احساسات کو آج کی مصطلحات الفاظ اور انداز بیان میں سپرد قلم کر دیا گیا ہے، سید عابد صاحب کو بھی موازنہ میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی اور نہ ہی وہ شبلی کی اس اولیت کے قائل نظر آتے ہیں کہ انھوں نے اردو میں عملی تنقید کی داغ بیل ڈالی، اور آج کی عملی تنقید شبلی ہی کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن ہے، سید عابد صاحب نے شبلی پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ ایک بات کو پکڑ لیتے ہیں اور اسی کو خواہی نہ خواہی پیچ کرتے ہیں۔ (۱۱) شبلی نے میر انیس کے کلام پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کو ''نام نہاد غیر جانب داری'' کا نام دے کر ایک طرح سے انھوں نے شبلی کا مضحکہ اڑایا ہے، دوسرے ناقدین نے تو شبلی کی باتوں سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کی کتاب کے بعض گوشوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، مگر سید عابد صاحب کو شبلی کی نہ صرف یہ تحریر بلکہ کسی تحریر میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی، ان کے تیر سے نہ تو الفاروق بچی اور نہ المامون، حد تو یہ ہے کہ وہ شعر العجم کو بھی نگاہ تخفیف سے دیکھتے ہیں، انھوں نے لگانے کو تو شبلی پر یہ الزام لگا دیا کہ وہ بات کو پکڑ لیتے ہیں اور اسی کو پیچ کرتے ہیں، یہ بات موازنہ پر تو بہت کم خود سید صاحب کی تحریر پر ضرور صادق آتی ہے، کیوں کہ ان کو موازنہ ہر خوبی اور حسن سے عاری نظر آتا ہے، ہمارے خیال میں عابد

صاحب کے خیالات ''المیزان''، ''تردید موازنہ'' اور ''ردالموازنہ'' کے خیالات کی توسیع وتشریح ہیں اور کچھ نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تمام باتیں ہمارے عہد کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

ہمارے نزدیک موازنہ انیس و دبیر پر سب سے ہمدردانہ اور متوازن محاکمہ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم نے کیا ہے، احتشام صاحب کا قیاس ہے اور غالباً صحیح قیاس ہے کہ شبلی کی نگاہیں اردو شاعری میں ''حماسہ'' کی قسم کی چیزوں کی تلاش میں تھیں، ان کو حماسہ کا سارنگ و آہنگ انیس کی مرثیہ نگاری میں نظر آیا، اس لئے انھوں نے انیس کے محاسن شعری کو اپنی دلکش اور پرجوش زبان میں اجاگر کرنے کے لئے موازنہ تصنیف کی۔ (۱۲) تمہید کے طور پر انھوں نے مرثیہ نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جو ان کی کتاب کا اصل موضوع نہیں، بلکہ مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے موازنہ کا یہ حصہ بہت سے لوگوں کو تشنہ نظر آتا ہے، یہ صحیح ہے کہ جو چیز تفصیل سے بیان کرنے کی تھی اس کو انھوں نے اجمال سے بیان کیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انیس کی شاعری پر کتاب لکھ رہے تھے مرثیہ گوئی کی تاریخ پر نہیں، احتشام صاحب کی یہ بات بھی دل کو لگتی ہے کہ شبلی جن شاعرانہ خصوصیات کو اہمیت دیتے تھے ان کے مناسب ترین نمونے ان کو انیس ہی کے کلام میں نظر آتے تھے، احتشام صاحب نے اپنی ساری بحث کا نچوڑ درج ذیل چند جملوں میں سپرد قلم کردیا ہے، جو یہ ہے:

> اگر یہ کتاب ذرا اور غور وفکر سے لکھی گئی ہوتی، ابواب کی ترتیب وتنظیم بہتر ہوتی، محض مثالوں کے سہارے خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کے بجائے تنقیدی تجزیہ سے بھی کام لیا گیا ہوتا، مرثیہ نگاری کا جائزہ بحیثیت فن کے لیا جاتا اور انیس و دبیر کے تقابلی مطالعہ کو ذرا اور بھرپور شکل میں پیش کیا گیا ہوتا، اصول شاعری کے متعلق جو مباحث چھیڑے گئے تھے ان پر ذرا منطقی اور استدلالی رنگ میں بحث کی گئی ہوتی تو موازنہ کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی لیکن اپنی موجودہ حالت میں بھی یہ تصنیف اردو تنقید کے ارتقاء میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ (۱۳)

یہاں پر ایک اور مقالے کا ذکر ناگزیر ہے جو ۱۹۹۶ء میں پروفیسر اسلوب احمد صاحب انصاری نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رسالے فکر ونظر کے شبلی نمبر کے لئے تحریر فرمایا تھا، اسلوب

صاحب کا شمار ہمارے بزرگ دیدہ ور ناقدوں میں ہوتا ہے، وہ نئے نئے نکات منکشف کرنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' کے مطالعے سے جو نتائج اخذ کئے ہیں درج ذیل سطور میں اس کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالی جارہی ہے۔

اسلوب صاحب نے اپنے مقالے کی ابتدا میں یہ یاد دلایا ہے کہ ''اردو کے منظرنامے میں ادبی معرکے اور چپقلش ایک لازمی جزو کی حیثیت سے شامل رہی ہیں'' (۱۴) اس سلسلے میں انھوں نے ''میر اور سودا، انشاء اور جرأت وغیرہ'' کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان کے ''حواریوں اور پیروؤں'' کا ذکر کیا ہے، جو فریق مخالف کو ''مات دینے اور مطعون و سرنگوں کرنے کا کام سرانجام دیتے ہیں''۔ اسی سلسلۂ سخن میں انھوں نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' کا ذکر کرتے ہوئے اس کو ''حتی الامکان عصبیت سے احتراز اور غیر جانبدارانہ طور سے انیس و دبیر کے ''شعری'' محاسن و مصائب'' کو سامنے رکھ کر دونوں کی ''ادبی انفرادیت کا تعین'' کرنے والی کتاب قرار دیا ہے اور علامہ شبلی کی اس کوشش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ان کی تحریر میں ''جذباتیت اور وابستہ مفادات'' کا عمل دخل نہ ہو۔

اسلوب صاحب نے اپنے اس مقالے میں ایک نکتہ یہ بھی اٹھایا ہے کہ ''موازنہ انیس و دبیر کی بنیاد سرتا سر انداز بیان کے کلاسیکی فارمولے پر رکھی گئی ہے۔'' (۱۵) اس اجمال کو انھوں نے خاص طور سے بڑی تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، جس کا یہاں اعادہ کرنا ممکن نہیں ہے، صرف اس بات کی طرف البتہ توجہ دلائی جاسکتی ہے کہ اسلوب صاحب کے نزدیک مرثیہ ''واقعات نگاری سے مختص ہے اور اس کی رسمیات مقرر اور منظم ہیں، یعنی اس کے موضوعات تاریخ / اساطیر کا ایک ناقابل تنسیخ جزو ہیں'' (۱۶) اس بات سے اسلوب صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''اس میں سارا زور زبان و بیان کی توضیح اور تنقید ہی پر صرف کیا جاتا ہے۔'' (۱۷)

اسلوب صاحب کی یہ بات بالکل درست ہے کہ موازنہ کا ''غالب حصہ میر انیس کے شعری کارنامے کی پرکھ کے لئے وقف کیا گیا ہے، مرزا دبیر اس محاکے کے دوران ذرا کم ہی نظر آتے ہیں۔'' (۱۸) مزید برآں اسلوب صاحب نے شبلی کے تنقیدی عمل کو ''مشرقی شعریات کے مسلمات سے ماخوذ'' قرار دیا ہے، ظاہر ہے شبلی کا تنقیدی عمل مغربی شعریات کے مسلمات کا حامل نہ ہوسکتا تھا نہ اس کو

ہونا چاہئے تھا، اس لئے اس کی تفصیلی بحث کے دوران اسلوب صاحب کا شبلی کے پیش کردہ نکات کو ''تنقیدی سادہ لوحی'' قرار دینا ناروا ہے، ہم یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کریں گے کہ اسلوب صاحب کو ''سادہ لوح'' کے معنی معلوم نہیں لیکن اس لفظ کے استعمال کو ان کے شایان شان بھی نہ کہیں گے۔

شبلی نے دبیر پر تنقید کرتے ہوئے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔'' اسلوب صاحب نے شبلی کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے اس کو بعید از انصاف قرار دیا ہے، اسلوب صاحب کو شکوہ ہے کہ ''مرزا دبیر کے یہاں جو نکتہ آفرینی اور معلوم اور مانوس سے ماورا ہو جانے کی جو صلاحیت ہے وہ بھی ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔'' (۱۹) علاوہ برایں ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ''موازنے میں کوئی ایسی بصیرت نہیں ملتی جیسی کہ حالی کے یہاں ''یادگار غالب'' میں ایک لمحۂ گریزاں کے لئے نظروں کو اسیر کر لیتی ہے'' (۲۰) کاش اسلوب صاحب نے لمحۂ گریزاں کی کچھ تو تفصیل لکھ دی ہوتی جس کی روشنی میں ہم بھی شبلی کی ''تنقیدی خامیوں'' کو سمجھ سکتے، ہم انتہائی احترام سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اسلوب صاحب کا یہ موازنہ مدح وقدح کا ایک ملغوبہ ہے، جو ان کے تنقیدی خیالات کی ژولیدگی کا غماز ہے۔

موازنۂ انیس ودبیر کے معترضوں اور نکتہ چینوں نے جن آراء کا درشت اور دائرۂ تہذیب سے خارج الفاظ میں اظہار کیا ہے، اگر بفرض محال ان سب کو لفظاً لفظاً درست تسلیم کر لیا جائے تب بھی موازنہ کی اہمیت اس وجہ سے برقرار رہے گی کہ اسی کتاب کی بدولت مرثیہ کی صنف کو شاعری کے دائرہ میں جگہ ملی، اس کتاب کے عالم وجود میں آنے سے پہلے اردو مراثی کا مطالعہ شعری نقطۂ نظر سے نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اس کو ماتم وبین کا ایک ذریعہ اور حصول نجات کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا تھا، موازنۂ انیس ودبیر سے قبل کسی نے بھی مرثیہ کی صنف کا اس لحاظ سے مطالعہ نہیں کیا تھا کہ اس میں کون کون سے شعری اجزاء پائے جاتے ہیں؟ کس طرح جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے؟ کردار کی زبان سے کس طرح مکالمے بلوائے جاتے ہیں؟ الفاظ کے انتخاب میں کن کن چیزوں اور کن کن تقاضوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے؟ اس صنف سخن کے ذریعے کس طرح غیر شعوری طور پر شاعر اپنے ماحول اور تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتا ہے؟ اس لحاظ سے موازنۂ انیس ودبیر اردو کی وہ پہلی کتاب

کہلانے کی مستحق ہے جس نے صنف مرثیہ کو اردو کی بیانیہ اور رزمیہ شاعری کی محفل میں جگہ دی اور اس کے محاسن اسی نقطۂ نظر سے اجاگر کیے۔

شبلی کے بعد اردو مرثیہ نگاری پر جو بھی کام ہوا ہے ان سب میں شبلی کے خیالات کی صدائے بازگشت ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ شبلی کے بعض خیالات اور توجیہات سے خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کیا جائے لیکن یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اردو مرثیہ نگاری پر کام کرنے کی راہ شبلی نے دکھائی اور انھیں کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر آج ہم اس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں، اس صنف سخن پر جتنا بھی کام ہوتا جائے گا، شبلی کی اہمیت اور معنویت کے نئے نئے گوشے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے جائیں گے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کسی قدیم ادب پارے کی معنویت پرکھنے کے لئے اس کسوٹی کا استعمال نہیں کرنا چاہئے کہ اس سے بہت سے لوگوں نے اختلاف کیا ہے، کسوٹی یہ ہونی چاہئے کہ عصر حاضر میں بھی اس کا حوالہ دیے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو، ارسطو کے کتنے خیالات آج غلط ثابت کیے جا چکے مگر اس کے باوجود ارسطو کی تحریروں اور خیالات سے صرف نظر آج بھی ممکن نہیں، اسی کسوٹی پر علامہ شبلی کی تحریروں کو پرکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی سو سوا سو سال پرانی تحریروں کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔

حواشی:

(۱) موازنۂ انیس و دبیر: مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۔

(۲) ایضاً، ص ۲۰-۱۹۔

(۳) المیزان، چودھری نظیر حسین فوق، ص ۲۔

(۴) ایضاً، ص ۳۔

(۵) ایضاً، ص ۱۵۱۔

(۶) ایضاً، ص ۱۴۔

(۷) ردالموازنہ، میر افضل حسین ثابت رضوی، ۱۹۱۳ء، ص ۵۳۷۔

(۸) حیات دبیر، سید افضل حسین ثابت رضوی ۱۹۱۳ء، ص ۵۳۷۔

(۹) ایضاً، ص ۶۲۴۔

(۱۰) ایضاً، ص ۶۲۳-۶۲۲۔

(۱۱) مقدمہ، موازنۂ انیس و دبیر: مرتبہ سید عابد علی عابد، ۱۹۶۴ء، ص ۶۰۔

(۱۲) عکس اور آئینے، سید احتشام حسین ۱۹۶۲ء، ص ۱۶۷۔

(۱۳) ایضاً، ص ۱۶۸۔

(۱۴) اسلوب احمد انصاری، سہ ماہی فکر و نظر شبلی نمبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جون ۱۹۹۶ء، ص ۱۹۔

(۱۵) ایضاً، ص ۲۰۔

(۱۶) ایضاً۔

(۱۷) ایضاً۔

(۱۸) ایضاً۔

(۱۹) ایضاً، ص ۲۷-۲۶۔

(۲۰) ایضاً، ص ۲۷۔

☆☆☆

علامہ شبلی کا سفرنامہ روم ومصروشام

ایک جائزہ

ڈاکٹر صاحب علی☆

علامہ شبلی اردو زبان وادب کے ایک بلند پایہ ادیب وانشاپرداز تھے، ان کے کارنامے متنوع اور گوناگوں ہیں، تاریخ وتنقید، سیرت وسوانح، علم کلام اور سفرنامہ لکھ کر شبلی نے اردو نثر کی علمی وادبی حیثیت کو بلند کیا، علاوہ ازیں شعروسخن کی عظمت کو بھی چار چاند لگایا، ان کی علمی وادبی تصانیف اور مقالات، اردو زبان وادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں، درحقیقت علامہ شبلی ایک غیر معمولی اسکالر تھے، ''ان کی شخصیت میں عظمت وکمال کی بہت سی ایسی صفات جمع تھیں جو الگ الگ بھی بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہیں۔'' ان کے کارنامے اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اردو زبان وادب ان کے احسانات اور ادبی وعلمی فتوحات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، شبلی نے آنے والی نسلوں کو علم وادب کی ایک ایسی وسیع اور دلکش شاہراہ دکھائی، جس پر چل کر وہ دنیائے ادب میں کامرانی وشادمانی کی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔

علامہ شبلی کا سفرنامہ ''روم ومصروشام'' اردو کے قدیم سفرناموں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی وجہ محض یہ نہیں ہے کہ علامہ شبلی کا سفرنامہ ہے بلکہ مقاصد سفر اور زبان وبیان کے اعتبار سے اس نے سفرنامے کی روایت کو آگے بڑھایا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی دوسری اہم تصانیف کی طرح سفرنامہ ''روم ومصروشام'' کو بھی کافی شہرت ومقبولیت حاصل ہے، یہ ایک علمی سفرنامہ ہے، اس میں اسلامی دنیا کے طور طریقے، بودوباش، طرز معاشرت اور تہذیب وتمدن سے کہیں زیادہ علمی دنیا نظر آتی ہے، اس سفرنامے نے اردو میں علمی سفرناموں کی جو روایت قائم کی اُس کے اثرات آج بھی

☆ صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف ممبئی، کالینا، سانتا کرز (ایسٹ) ممبئی، (مہاراشٹر)

دیکھے جاسکتے ہیں، یہاں سفر اور سفرناموں پر ایک ہلکی سی نظر ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ حرکت میں برکت ہے، یہ حرکت ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان دور دراز کا سفر طے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، وہ سفر میں بہت کچھ سیکھتا اور سکھاتا ہے، زندگی کے نشیب و فراز کا وسیع تجربہ حاصل کرتا ہے، ہماری زندگی کی تعمیر و ترقی کے لیے سفر ایک بہترین وسیلہ ہے، سفر کرنے والوں میں خود اعتمادی، اولوالعزمی اور وسیع النظری کے جوہر پیدا ہوتے ہیں، جب ایک سیاح یا مسافر دور دراز اجنبی علاقوں اور ملکوں میں جاتا ہے تو وہاں مختلف اقوام کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن، تعلیم و تربیت اور دیگر علوم و فنون کی تعمیر و ترقی کا انداز دیکھتا ہے، یا مختلف ملکوں کے سیاسی و معاشی، سماجی و تہذیبی، تعمیری و تاریخی، علمی و ادبی اور جغرافیائی امور وغیرہ سے واقفیت حاصل کرتا ہے، تجربات و مشاہدات کا یہ ذخیرہ اس کی معلومات میں زبردست اضافہ کرتا ہے اور اس کی شخصیت کو نکھارتا بھی ہے، درحقیقت سفر تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کا سرچشمہ ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے۔

سفر حضر کی ضد ہے اور عربی زبان کا لفظ ہے، سفر عربی زبان میں مسافت طے کرنے یا مسافت قطع کرنے کو کہا جاتا ہے، انسان جب نقلِ مکانی کرتا ہے تو اس عمل سے گزرتا ہے، اسی عمل کو سفر کہتے ہیں، مذہب اسلام نے سفر کو کامیابی کی کنجی قرار دیا ہے، قرآنِ مقدس میں سِیرُوا فِی الاَرْضِ کا حکم دے کر لوگوں کو سفر کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، سفر کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر وہ لوگ جو مالی حیثیت اور نئی دنیاؤں کو دیکھنے کا شوق و ذوق رکھتے ہیں، دور دراز علاقوں اور ملکوں کا سفر اختیار کرتے ہیں مگر جو لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتے، اُن کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ سفر کرنے والوں کے تجربات و مشاہدات سن کر اپنی آرزوؤں کو تسکین دیں، سفر سے متعلق تمام معلومات اس لیے بھی حاصل کی جاتی ہیں کہ علم میں اضافہ ہو، عوامی دل چسپی کے اسی پہلو اور انسانی فطرت کی خواہش نے سفر کرنے والوں کو سفرنامہ رقم کرنے پر آمادہ کیا، اس طرح دنیا کی تمام زبانوں میں سفرنامہ لکھنے کی شروعات ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی مقبولیت کے سبب ادبی حیثیت بھی حاصل کرلی، جو لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے آمادۂ سفر نہیں ہو پاتے اُن کی خواہش اور آرزو کو ڈاکٹر خالد محمود اس طرح بیان کرتے ہیں:

''معاشرے کی چہار دیواری میں محصور شخص سفر سے واپس آنے والے مسافر سے ایک ایک بات معلوم کرنے کا خواہش مند رہتا ہے، اُس کا جی چاہتا ہے کہ سفر کا ہر واقعہ جس سے سفر رسیدہ گزر کر آیا ہے اُسے بھی معلوم ہو جائے سفر کی ساری روداد، مثلاً سفر کیسے شروع ہوا، قیام کی منزلیں کون کون سی تھیں، کیا کیا دیکھا، کن کن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، پرائے دیس کے لوگ کیسے ہیں، کس طرح رہتے ہیں کیا کھاتے اور کیا پیتے ہیں، دوسروں کے تئیں اُن کا برتاؤ کیسا ہے، اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کے سیاسی، سماجی اور جغرافیائی حالات، معاشی اور معاشرتی نظام حیات، غرض انسانی دلچسپی کے دائرے میں آنے والی تمام باتیں کرید کرید کر وہ اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتا ہے، ایسے تمام انسانوں کے ذوق تسکین کے لیے سفر نامہ حصول معلومات کا بہترین ذریعہ ہے۔''

(اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۲)

سفر نامہ رقم کرنے کے لیے سفر سے گزرنا بنیادی شرط ہے، سفر نامہ نگار سفر میں جو کچھ مشاہدہ اور تجربہ کرتا ہے اُسے سفر نامے میں بے کم وکاست پیش کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں تمام معاشرتی اور دیگر علوم در آتے ہیں جو ہماری معلومات میں زبردست اضافہ کرتے ہیں، چودھری محمد اقبال نے صحیح لکھا ہے کہ:

''یہ واحد صنفِ ادب ہے جس کا تقریباً تمام اہم معاشرتی علوم سے گہرا تعلق ہے، مورخوں، سوانح نگاروں اور جغرافیہ دانوں نے اس صنف سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، اور اسی وجہ سے دنیا کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں کے ادبیات میں سفرناموں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔'' (سفر نامہ ابن بطوطہ ص ۱۳)

سفر نامہ ایک چشم دید بیانیہ ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے اسے دیکھا جائے، بیانیہ کو ہمہ جہت، بامعنی اور مدلل ہونا چاہیے تا کہ دلچسپی کا جادو برقرار رہے، سفر نامہ نگار کو لوگوں کے سامنے ان حقیقی ماحول ومنظر کو پیش کرنا چاہیے جن کو اُس نے اپنے دل ودماغ میں بسا لیا ہوتا کہ حالات وواقعات کے بیان میں اجنبیت نہ محسوس ہو، سفر نامے میں اگر یہ اصول پیدا ہو جائے تو پھر سفر نامہ محض واقعات ومناظر کا بیان نہیں رہتا بلکہ سفر نامہ نگار کی ذہنی اور روحانی واردات بن جاتا ہے، سفر نامہ نگار دوران سفر

یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات اور تاثرات واحساسات کو ترتیب دے کر جو روداد رقم کرتا ہے وہ سفرنامہ ہے، اس عمل میں پوری کامیابی اُس وقت ملتی ہے جب سفرنامہ نگار حقیقی تجربات ومشاہدات کو آسان اور پرلطف اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اردو میں سفرنامہ نگاری کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے نصف اول میں ہوا، تاریخی لحاظ سے سفرناموں میں یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ 'تاریخ یوسفی' معروف بہ 'عجائبات فرنگ' اردو کا پہلا سفرنامہ تسلیم کیا جاتا ہے، یوسف خاں کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا سفر کیا تھا، وہاں پر انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اُسے 'عجائبات فرنگ' کی شکل میں پیش کر دیا۔ 'عجائبات فرنگ' ۱۸۴۷ء میں مطبع العلوم دہلی کالج سے پہلی بار چھپا، دوسری بار نول کشور نے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا، جب کہ تحسین فراقی نے ۱۹۸۳ء میں ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ لاہور سے شائع کیا۔

اردو سفرنامے کی تاریخ میں ایک اہم سفرنامہ 'مسافران لندن' ہے جو سرسید احمد خاں کی یادگار ہے، سرسید احمد خاں علم وادب کے دلدادہ تھے اور جدید علوم وفنون کی نت نئی راہوں اور منزلوں کے متلاشی تھے، اس سلسلے میں انھوں نے ۱۸۶۹ء میں لندن کا سفر کیا اور سفرنامہ 'مسافرانِ لندن' قسط وار سائنٹفک سوسائٹی کے گزٹ میں شائع ہوتا رہا مگر کتابی شکل میں سرسید احمد خاں کی زندگی میں نہ چھپ سکا، تقریباً سو سال کے بعد محمد اسماعیل پانی پتی نے اسے ترتیب دیا اور ۱۹۶۱ء میں مجلسِ ترقی ادب لاہور سے شائع بھی کرایا۔

ابتدائی دور کے سفرناموں میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفرنامہ 'کالا پانی' (۱۸۶۹ء) بھی قابل ذکر ہے، اس کا دوسرا نام 'تواریخ عجیب' ہے، یہ سفرنامہ جزائر انڈمان کی تاریخی وسماجی زندگی کی ایک داستان ہے، ساتھ ہی انگریزوں کے مسلسل ظلم وستم کا ایک سیاہ باب بھی ہے، اصل میں مولوی محمد جعفر تھانیسری اپنے ہی ملک میں انگریزوں کا غلام بن کر نہیں رہنا چاہتے تھے، وہ انگریزوں کے خلاف خفیہ منصوبے بنایا کرتے تھے، اس لیے انھیں کالا پانی کی سزا ہوئی اور وہ اٹھارہ سال تک انڈمان میں قید وبند کی صعوبتیں اٹھانے پر مجبور ہوئے، انھیں واقعات کی یادگار سفرنامہ 'کالا پانی' ہے۔

ابتدائی دور کا اردو سفرنامہ اپنا ارتقائی سفر طے کر رہا تھا کہ اسی دور میں علامہ شبلی کا سفرنامہ روم ومصر وشام منصۂ شہود پر آیا، اصل میں ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ کے ہمراہ قسطنطنیہ کا

سفر کیا اور وہ چھ ماہ تک مصر، روم اور ترکی میں رہے ان ممالک سے اپنی کتاب الفاروق کے لیے مواد جمع کیا، سفر سے واپس آنے کے بعد احباب کے اصرار پر ایک سفرنامہ لکھا جسے سفرنامۂ روم ومصر وشام کا نام دیا، اس میں انھوں نے بلادِ اسلامیہ قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس اور قاہرہ وغیرہ کے متعلق تمام واقعات یعنی شہر کے اجمالی حالات وکوائف، قابل دید مقامات، مشہور عمارات، سررشتہ تعلیم، دارالعلوم اور مدارس، طلبہ کی تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتب خانے اور اخبارات ورسائل، مشہور پاشاؤں اور ارباب کمال کی ملاقاتیں، مردوں اور عورتوں کے اخلاق وآداب اور ان کی معاشرتی زندگی وغیرہ اچھے طریقے سے پیش کیا ہے، ترکوں کی اُن خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے جنھیں یورپ کے متعصب مورخین نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

علامہ شبلی نے ایسے وقت میں مصر، روم اور شام کا سفر اختیار کیا جب ہمارے ملک میں انگریزوں کا راج تھا، انگریز، مسلمانوں اور ممالک اسلامیہ کو بدنام کرنے کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھے، لہٰذا ایک طرف تو اسلامی ممالک کے تمام حالات وواقعات سے ہندوستانی مسلمان صحیح طور سے واقف نہیں ہو پاتے تھے اور دوسری طرف یورپ کے اسکالر مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھے، جس سے وہ اسلامی تاریخ اور سلاطین اسلام کو مسخ کر کے اس طور سے پیش کرتے تھے کہ دنیا کی نگاہیں عالم اسلام سے پھر جائیں اور اُن کے دلوں میں اُن کی عزت ومحبت باقی نہ رہے، اور اس لیے بھی کہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنی تاریخ پر فخر کرنے کے بجائے اس سے نفرت کرنے لگے، یورپ کے مصنفین کی حرکتوں پر علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''یورپ نے کسی زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لیے تھے، ایک مدت تک وہ علانیہ اس طریقے سے ظاہر کیے جاتے تھے کہ مذہبی تعصب کا رنگ غالب نظر آتا تھا اور اس وقت قبول عام کا یہی بڑا عمدہ ذریعہ تھا، لیکن جب یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہو گئے تو اس پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا، اب یہ طریقہ چنداں مفید نہیں سمجھا جاتا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھے جائیں بلکہ بجائے اس کے یہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قومی اور اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرائے میں ظاہر کیے جاتے ہیں اور عام تصنیفات،

قصوں، ناولوں، ضرب المثلوں کے ذریعے سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے۔'' (سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۲)

علامہ شبلی کا سفر مصر، روم اور شام بڑا کارآمد ثابت ہوا، انھیں ممالک اسلامیہ کی صحیح تصویر دیکھنے کو ملی اور اسلامی حکومتوں کے خلاف منفی پروپگنڈہ کرنے والے یورپین مصنفین کی تنگ نظری سے بھی خوب واقفیت ہوئی، ملتِ اسلامیہ کے خلاف منفی تشہیر کا زور ختم کرنے کی غرض سے علامہ شبلی نے اسلامی شخصیتوں کی سوانح لکھنے کا فیصلہ کیا، اس سلسلے میں انھیں جلد اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے کتب خانوں میں موجودہ مواد ناکافی ہیں، البتہ اس کام کی تکمیل کے لیے ممالک اسلامیہ کے کتب خانے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں، اسی مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے ۱۸۹۱ء میں رخت سفر باندھا تھا سفرنامے کے ابتدائی صفحات میں لکھتے ہیں:

''جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اُسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا، یہی خیال تھا کہ جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی، یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تعلیمات کا جو بقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک ایسا سلسلۂ تالیف ضرور تیار ہو سکتا ہے۔'' (سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۸)

اس عزم مصمم کے باوجود بھی شبلی رختِ سفر نہ باندھ سکے اور اُن کا عزم محض عزم ہی رہ گیا، البتہ تقریباً ایک سال کے بعد اُن کے سفر کی تکمیل کے اسباب پیدا ہوئے، اصل میں تبدیلی آب وہوا کے لیے شبلی کشمیر جانا چاہتے تھے اسی اثنا میں اُن کو خبر ہوئی کہ پروفیسر آرنلڈ ولایت جانے والے ہیں جو شبلی کے استاد بھی تھے اور دوست بھی، انھیں کے ساتھ شبلی مصر، روم اور شام کے لیے نکل پڑے اور ۲۶ر اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڑھ سے سفر پر روانہ ہوئے اور ۳۰ر اپریل کو بمبئی پہنچ گئے، دوسرے دن یعنی یکم مئی کو بمبئی سے پانی کے جہاز پر سوار ہو کر ۷ر مئی کو عدن پہنچے، جب کہ ۱۳ر مئی کو جہاز سوئز پہنچا جہاں خوانچہ اور پھیری والوں میں سے ایک نے شبلی سے اردو میں گفتگو شروع کی جو ہندوستانی نہیں بلکہ مقامی باشندہ تھا اور اس نے کبھی ہندوستان کی صورت تک نہیں دیکھی تھی، یہ جان کر شبلی کو اردو زبان کی عالم گیری پر تعجب ہوا، ۱۴ر مئی کو جہاز پورٹ سعید پہنچا تو یہاں سے پروفیسر آرنلڈ یورپ

کے لیے روانہ ہو گئے اور شبلی قسطنطنیہ کے جہاز پر سوار ہو کر ۲۳ رمئی کو قسطنطنیہ پہنچ گئے، قسطنطنیہ کو استنبول بھی کہتے ہیں، یہاں پر شبلی کا تین مہینہ تک قیام رہا، پھر یہاں سے بیروت گئے اور بیروت میں ایک ہفتے رہے، بیروت سے بیت المقدس چلے گئے یہاں کچھ دنوں تک قیام کرنے کے بعد اسکندریہ سے بذریعے ٹرین قاہرہ (مصر) گئے، قاہرہ میں شبلی ایک مہینے سے زیادہ مقیم رہے۔ یہیں پر اُن کا سفر اختتام کو پہنچا اور وہ ہندوستان واپس لوٹ آئے، علامہ شبلی کا جو سفر اپریل ۱۸۹۲ء میں شروع ہوا تھا اُسی سال نومبر میں ختم ہو گیا، ان چھ مہینوں میں عالم اسلام کی اہم شخصیتوں کی یادگاروں کو دیکھ کر شبلی کو جہاں ایک طرف مسرت ہوئی تو وہیں دوسری جانب مسلمانوں کی کچھ پست حالت کو دیکھ کر تکلیف بھی پہنچی، شبلی سفرنامے کے بنیادی اصولوں سے بخوبی واقف تھے لہٰذا تکلیف پہنچنے کے باوجود ترک قوم کی کمیوں اور کوتاہیوں پر برملا اظہار کرنے میں انھیں کوئی پس وپیش نہیں ہوا، انھوں نے تمام واقعات کو بلاکم وکاست پیش کر دیا اور ترکوں کی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی، حالاں کہ شبلی ترکوں سے بڑی محبت وعقیدت رکھتے تھے، وہ ترکی کے تمام حالات وواقعات سے معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے تاثرات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کیا جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں سے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کا کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا حصہ بہت کم ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی اور عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے، اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے، وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔ ہمت، غیرت، جوش، عزم اور استقلال کے بجائے کل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی چھائی ہوئی ہے، جو شخص جس حال میں ہے اس پر قانع ہے، موجودہ حالت تو یہ ہے کہ ولعل الله یحدث بعد ذلك امرا۔''
>
> (سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۷)

علامہ شبلی کو ترکی اور وہاں کی تمام چیزوں سے جذباتی دلچسپی تھی۔ ان کے خیال میں ترکی اسلامی شان وشوکت کی واحد یادگار سلطنت رہ گئی تھی جسے وہ خود اپنی چشم سے دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ جب وہ قسطنطنیہ پہنچے تو ترکوں کا شاندار ماضی ان کے سامنے آگیا، انھوں نے وہاں کی نامور شخصیتوں، کتب خانوں، مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں اور کالجوں وغیرہ کی سیر کی اور ان کا معائنہ ومشاہدہ بھی کیا، مگر اُن کی خوشی اُس وقت دوبالا ہو جاتی جب وہ مسلمانوں کو خوشحال اور علم وہنر میں ترقی یافتہ دیکھتے، قسطنطنیہ میں جب انھیں جہاز بنانے کا ایک بڑا کارخانہ دیکھنے کو ملا تو اُن کا دل باغ باغ ہو اٹھا، اس کارخانے کا ذکر شبلی سفرنامے میں بڑی شادمانی کے ساتھ کرتے ہیں:

''نہایت قابل تعریف بات یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان کارخانہ صرف ترک چلاتے ہیں تمام افسر اور کاریگر اور ملازم ترک ہیں صرف ایک یورپین معمولی درجے کا ملازم ہے اور وہ بھی قدامت کے لحاظ سے بحال رکھا گیا ہے، انجن بھی یہاں تیار ہوتے ہیں اور ترکوں کا بیان ہے کہ یورپ کے بنے ہوئے انجنوں سے کسی بات میں کم نہیں ہوتے، ایک افسر نے مجھ سے کہا کہ اس قسم کے تمام کاموں میں ہم کو یورپ کی احتیاج نہیں رہی۔''

(سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۹۰)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں علامہ شبلی تین مہینے تک ترکی میں مقیم رہے اور وہاں پر انھوں نے تمام احوال وکوائف کا جائزہ لیا جو کچھ دیکھ سکتے تھے اسے دیکھا، جن لوگوں سے مل سکتے تھے اُن سے ملے، جن چیزوں کا معائنہ ومشاہدہ کرنا چاہتے تھے اُن کا معائنہ ومشاہدہ بھی کیا، ترک قوم کے اندر انھوں نے جو کوتاہیاں اور خرابیاں دیکھیں، اُن کا اپنے سفرنامے میں برملا اظہار کیا، علاوہ ازیں اُن کے یہاں شبلی کو جو اچھائیاں اور خوبیاں نظر آئیں اُن کو بھی سفرنامے میں خوب خوب جگہ دی، ترکی میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم وتعلم کا اچھا انتظام تھا، ترکوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ دنیا میں اچھا معاشرہ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک سماج کا ہر فرد خواہ وہ مرد ہو یا عورت تعلیم یافتہ نہ ہو، چنانچہ شبلی نے ترکی میں لڑکیوں کے تعلیمی اداروں کو دیکھا، ان کے رہن سہن پر اُن کی نظر پڑی اور اُن کی وضع قطع اُن کے سامنے آئی تو وہ بہت خوش ہوئے، ترکی عورتوں کی تعلیم وتربیت اور طریقۂ معاشرت کو انھوں نے نہ صرف اپنے سفرنامے میں پیش کیا بلکہ قابل تقلید بھی بتایا۔

''ترکوں کی تہذیب وترقی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر اور قابل تقلید ہے وہ عورتوں کی تعلیم وتربیت اور طریقۂ معاشرت ہے، دنیا کی دو بڑی قومیں یعنی یورپین اور ایشیاٹک اس مسئلے میں افراط وتفریط کے انتہائی کناروں پر واقع ہیں، اور اس وجہ سے دونوں کی حالت قابل اعتراض ہے، ترکوں نے ایسا معتدل طریقہ اختیار کیا ہے جو دونوں کی خوبیوں کا جامع اور دونوں کے عیوب سے خالی ہے، ٹرکش عورتیں تعلیم یافتہ ہیں، لیکن بے شرمی، شوخی، بے جا آزادی، رقاصی کی (اور وہ بھی غیروں کے ساتھ) ان کو تعلیم نہیں ہوئی ہے۔ وہ پردے کی پابند ہیں لیکن جاہل، دنیا سے بے خبر مکان کے قفس میں بند، حیوان نما انسان نہیں ہیں، لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سرکاری اور خانگی مدرسے کثرت سے ہیں اور پردہ وحفاظت کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ شرفا کو اپنی لڑکیوں کے بھیجنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا۔'' (سفر نامۂ روم ومصر وشام ص ۱۱۱)

علامہ شبلی منارۂ علم وفضل تھے اور ان کے سفر کا مقصد ہیروز آف اسلام کے لیے مواد جمع کرنا تھا، وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے، انھیں عربی کے بہت سارے ایسے نادر ونایاب کتب رسائل اور مخطوطات دیکھنے کو ملے کہ اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، مواد جمع کرنے کے ساتھ ساتھ شبلی نے بلاد اسلامیہ کے ایسے معاشرتی اور نفسیاتی امور کا مشاہدہ بھی کیا جن پر قوموں کی ترقی وتنزلی کا انحصار ہے، قسطنطنیہ، بیروت اور قاہرہ کی قدیم تعلیمی درسگاہوں اور جدید کالجوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا، تعلیم وتربیت کے لیے شبلی کے نزدیک بورڈنگ سسٹم ایک اچھا طریقہ رہائش ہے، کیوں کہ یہاں پر طالب علموں کے اندر میل ملاپ اور بھائی چارہ کا جذبہ ابھرتا ہے، اور اعلیٰ درجے کی معاشرت میں خوش سلیقگی سے رہنے کی ڈسپلن پیدا ہوتی ہے، شبلی جب قسطنطنیہ کے اقامتی کالجوں کے بورڈنگ ہاؤس میں جاتے ہیں اور وہاں پر نظم وضبط کا اچھا ماحول دیکھتے ہیں وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور خوشی خوشی اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر بھی کرتے ہیں:

''تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں نہایت کثرت سے طلبہ رہتے ہیں لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس وضع، مکان، فرنیچر تمام چیزیں ایک سی ہیں اور طالب علموں کی حالتوں میں فرق مراتب کا کوئی شائبہ نہیں ہے، بورڈنگ کا کرایہ

اور خوراک کی جو فیس لی جاتی ہے اس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لیے جاتے ہیں اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے تیار ہوتے ہیں تمام لڑکے میز اور کرسیوں پر کھاتے ہیں اور ہر چیز میں تکلف، صفائی، خوش سلیقگی کا نہایت اہتمام کیا جاتا ہے۔" (سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۵۰)

در حقیقت علامہ شبلی اپنے سفرنامے میں ترکی کے اسکولوں، کالجوں اور بورڈنگ ہاؤسوں کے تعلق سے ہر ہر چیز کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں، مثلاً داخلے کے اصول وضوابط، طریقۂ تعلیم وتربیت، طریقۂ درس وتدریس، معیار تعلیم اور نصاب، فیس اور قیام وطعام کے طریقے، بورڈنگ کی زندگی اور اس کے نظم وضبط، کھیل کود اور کتب وغیرہ۔ شبلی کو ترکوں کی معاشرتی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا اچھا موقع ملا تھا، ترکی میں غریب امیر، نوکر مالک اور جاہل عالم غرضیکہ ہر طبقے کے لوگوں سے ان کا سابقہ پڑا، سب کو بلند اخلاق، کشادہ دل اور وسیع النظر پایا، شبلی کو ترکوں کے اخلاق وعادات کا جو تجربہ ہوا اُن میں سب سے گہرا اثر اُن کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا پڑا کہ وہاں کے لوگ خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں، راستہ چلتے وقت کسی سے راستہ دریافت کیا جائے تو وہ بڑی خوش اخلاقی سے راستہ بتاتا ہے، ہوٹل یا قہوہ خانے میں جب دوست واحباب ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں تو ایک شخص تمام لوگوں کا خرچہ برداشت کرتا ہے، گویا وہ میزبان ہے باقی سب مہمان۔ شبلی نے ترکوں کی فیاضی، خوش سلیقگی، سادہ دلی، خوش اخلاقی اور ان کی مہمان نوازی کی خوب خوب تعریف کی ہے۔ مہمان پرستی اور خوش اخلاقی کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"غازی عثمان پاشا جن کو پلونا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور درویش پاشا کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے، اس مرتبے کے لوگ ہیں جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف، میں دونوں سے ملا ہوں اور جس تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آئے اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہیں۔

ایک عام بات یہ ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے گو وہ کسی مرتبے کا آدمی ہو راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور تم کو راستہ بتائے گا، بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچدار گلیوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا، اور راستے کے بھول

جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقاً کوئی ترک آنکلا تو اُس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہولیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں پہنچا کر واپس آیا۔"

(سفر نامۂ روم ومصر وشام ص ۱۰۵-۱۰۶)

فلسطین کا ایک قدیم اور تاریخی شہر یافہ ہے، جو اپنی خوبصورت اور اچھی فضا کے لیے مشہور ہے، یہ اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے اسلامی ممالک کا اہم شہر ہے، یہاں کی فضا اتنی پُر بہار ہے کہ علامہ شبلی اسے یورپین آبادی کہتے ہیں اور اس شہر کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

"یافہ جن کو انگریزی میں جافا کہتے ہیں، نہایت قدیم شہر ہے، توریت میں اس کا ذکر ہے اور مورخ بلینی کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح سے پہلے موجود تھا، ۱۳ھ میں کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد تھا، اسلام کے قبضے میں آیا، چونکہ یہ شہر بیت المقدس کا اسٹیشن ہے یعنی یہیں سے بیت المقدس جاتے ہیں اس لیے ہر قوم اور ملک کے لوگوں کی کثرت سے آمد و رفت رہتی ہے، شہر کا وہ حصہ جن کو یورپین آبادی کہا جاسکتا ہے، خوبصورت اور پُر فضا ہے۔" (سفر نامۂ روم ومصر وشام ص ۱۴۴)

علامہ شبلی اپنے سفر نامے میں صرف بلادِ اسلامیہ کی معاشرتی زندگی، قابلِ دید مقامات وعمارات، قدیم وجدید تعلیمی اداروں اور کتب خانوں ہی کا ذکر نہیں کرتے بلکہ وہاں کی آب وہوا اور کھیتوں وغیرہ کا ذکر بھی دلفریب انداز میں کرتے ہیں، مثلاً قسطنطنیہ کے موسموں اور پھلوں وغیرہ کا ذکر اس طور سے کرتے ہیں کہ ان کے خوشگوار حالات وصفات اور ذائقوں سے ہم بخوبی واقف ہو جاتے ہیں، علامہ شبلی آب وہوا کے باب میں لکھتے ہیں:

"آب وہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے، جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے، گرمیوں کا موسم جس کا خود مجھ کو تجربہ ہوا، اس قدر خوش گوار ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا، تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے امرا شملہ و نینی تال کے بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے، پانی پہاڑ سے آتا ہے اور نہایت ہاضم اور خوش گوار ہے۔"

(سفر نامۂ روم ومصر وشام ص ۴۰)

علامہ شبلی نے اسکندریہ سے قاہرہ تک ٹرین کے ذریعہ سفر طے کیا، ریلوے لائن کے

کنارے جو سرسبز اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں نظر آئیں، اس سے لطف اندوز ہوئے اور سفر نامے میں ذکر بھی کیا:

> ''اس سفر میں جس قدر حصہ مصر کا میری نظر سے گزرا عجیب سرسبز وشاداب تھا، جہاں تک نگاہ جاتی ہے نہایت سرسبز کھیتیاں نظر آتی تھیں، اسکندریہ سے قاہرہ تک جس قسم کی عمدہ پیداوار نظر آئی میں نے ہندوستان میں پچاس ایکڑ زمین بھی ایسی نہیں دیکھی، ریل شام کے قریب قاہرہ پہنچی اور میں نے جامع ازہر کے قریب ایک لوکانده (ہوٹل) میں قیام کیا۔''
>
> (سفر نامۂ روم ومصر وشام ص ۱۵۴)

ہم جانتے ہیں کہ تعلیمی حلقوں میں قاہرہ کی پہچان جامع ازہر سے ہوتی ہے، شبلی قاہرہ پہنچے تو اُن کا قیام جامع ازہر کے پاس ایک ہوٹل میں تھا، جامع ازہر دنیا کی قدیم جامعات میں سے ایک ہے، اس میں سارے عالم کے مختلف علاقوں کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، چوں کہ علامہ کا قیام جامعہ کے قریب ہی تھا، لہٰذا انھیں جامع ازہر کو مختلف طور طریقوں اور زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کا اچھا موقع ملا، چنانچہ وہ یہاں کی تعلیم وتربیت، نظم وضبط اور طلبہ کے عادات واخلاق کا مشاہدہ کر کے سخت افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور رنجیدہ ہوتے ہیں، البتہ علامہ شبلی جب یہاں کے سب سے اہم کالج دارالعلوم جو قدیم وجدید علوم کا سنگم ہے، کو دیکھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں یہ کالج شبلی کے نظریۂ تعلیم کا عکاس معلوم ہوتا ہے، لہٰذا وہ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں:

> ''مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لیے کافی سمجھا وہ یہی کالج ہے، میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی مرتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک اُن میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو اُن کی ترقی نہیں کہی جاسکتی، بے شبہ مشرقی تعلیم کی موجودہ اسکیم ہے وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔'' (سفر نامۂ روم ومصر وشام ص ۱۶۰)

سفر نامہ ''روم و مصر و شام'' سے محض شبلی کے نظریہ تعلیم و تربیت ہی کی عکاسی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں ان کی شخصیت کے بہت سارے پہلو بھی جلوہ گر ہیں، اس سفر نامے کے تعلق سے شیخ اکرام یادگار شبلی میں لکھتے ہیں:

''یوں تو ان ممالک (مصر، روم اور شام) کے ذکر میں ویسے ہی ایک دلکشی ہے اور ان کی معاصرانہ درس گاہوں اور علمی اداروں کے متعلق جو تفاصیل یہاں جمع ہیں وہ شاید ہی کہیں اور دستیاب ہوں، لیکن شبلی کے سوانح نگار کے لیے اس تصنیف کی دل چسپی دوسری ہے، یہ سفر نامہ اُن کی آپ بیتی کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں فقط سفر کے مناظر اور قابل دید مقامات کی روداد نہیں بلکہ دیکھنے والے کا زاویۂ نگاہ اور انداز طبیعت بھی صاف نظر آتا ہے۔

سفر نامہ کے مطالعہ سے پہلا تاثر جو کتاب پڑھنے والے کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ مصنف کی قومی غیرت ہے، سفر میں ہر وقت اُسے یہی خیال رہتا ہے کہ مسلمانوں سے کیسا سلوک ہوتا ہے اور اُن کی حالت کیسی ہے۔'' (یادگار شبلی ص ۱۹۴)

یہ سفر نامہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے، انشا کے فن سے جو ادیب جتنا ہی واقف ہوتا ہے اُس کی نثر میں اتنی ہی لطافت اور جاذبیت ہوتی ہے، علامہ شبلی کے سفر نامے میں وہ بیانیہ ہے جو حالات و واقعات کے تمام پہلوؤں کو بتدریج قارئین کے سامنے ابھارتا ہے اور محفوظ کر کے معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا ہے، شبلی کی نثر کا عام انداز شگفتگی اور رعنائی ہے مگر سفر نامے کی نثر سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ زبان شستہ، بے ساختہ اور پر لطف ہے، شبلی تفصیل اور پھیلاؤ کی ہر صورت سے بچتے ہیں، جس سے ایجاز و اختصار سفر نامے کا خاصہ ہے، زبان و بیان کے اعتبار سے سفر نامے کی نثر میں قاری کو مسحور کر لینے کی بھر پور صلاحیت ہے جو کسی حد تک قاری کو اَن دیکھے عالموں کی سیر پر آمادہ کرتی ہے۔

علامہ شبلی اور اسلامی کتب خانے

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی ☆

مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''مولانا شبلی قدیم عہد کے ایسے سنگم تھے، جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے، وہ ہمارے قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے ...... محقق بھی تھے، مورخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، شاعر بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے اور نئے زمانہ کے تقاضے اور مطالبے کے مقابلے میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے۔''

علامہ شبلی نے وقت کے ساتھ زمانہ میں ہونے والی تبدیلیوں کے مثبت پہلوؤں پر غور وفکر کیا تھا، اور موصوف نے ان تبدیلیوں کی حمایت بھی کی تھی، اس لیے میرے فہم وادراک کی روشنی میں سید سلمان ندوی کی ''انقلابی'' سے مراد علامہ کی جدید طرز فکر ہے، چنانچہ جب علامہ شبلی سرکاری کتب خانہ موجودہ رامپور رضا لائبریری میں کتب کے مطالعہ کے لیے گئے تو موصوف کو سرکاری کتب خانہ کی کتب کی ترتیب میں خامیاں نظر آئیں، اس کتاب خانہ میں کتب کا اندراج موضوعات یا مضامین کے اعتبار سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ حروف تہجی کے اعتبار سے کتب مندرج تھیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تاریخ کی کتاب کسی شاعر کے دیوان کے پاس الماری میں لگی ملتی تھی، انھوں نے لائبریری کے Visit رجسٹر میں اپنی رائے میں لکھا تھا:

''میں نے کتب خانہ سرکاری کو جو درحقیقت ریاست کی علمی فیاضیوں کی ایک حیرت انگیز یادگار ہے، دو تین دن میں جس قدر تحقیقی کاوش کی نگاہ سے دیکھنا ممکن تھا دیکھا، ایک شخص خواہ اس کی نگاہ کتنی وسیع ہو کتب خانہ کے احاطہ میں جاکر جب ان عزیز الوجود بیش بہا کتابوں کو دیکھے گا جن کو جستجو اور قدر دانی ...... اور فیاضیوں سے دنیا کے مختلف حصوں سے

☆ لنگر خانہ، چوک محمد سعید خاں، رام پور (یوپی)

لاکر وہاں جمع کر دیا گیا، تو وہ دفعتاً حیرت زدہ ہو جائے گا لیکن اسی کے ساتھ جب وہ کتب خانہ کی بے ترتیبی اور فہرست کی ناموزونی پر نظر ڈالے گا تو سخت افسوس کرے گا، سب سے بڑی بے ترتیبی یہ ہے کہ کتابیں الماریوں میں حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ کتاب الخراج قاضی امام یوسف کی جو نہایت عالی رتبہ تصنیف ہے اسے کلیات رند کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے، کتب خانہ میں ہر موقع پر یہ ناموزونی موجود ہے اور نہایت بدنما معلوم ہوتی ہے، میں نے بڑے بڑے کتب خانے دیکھے ہیں مگر مجھ کو کسی کتب خانہ میں یہ ناموزوں ترتیب نہیں ملی سب سے مقدم یہ ہے کہ فن اور علم کے لحاظ سے فہرست مرتب کی جائے اور پھر اس میں حروف تہجی کا لحاظ رہے، مجموعوں میں نہایت بے ترتیبی ہے، ان کی جلدیں توڑ کر یا تو ایک فن کے لحاظ سے یا مصنف کے لحاظ سے رسالے ایک جگہ مجلد کیے جائیں۔'' (۱)

رپورٹ میں یکے بعد دیگرے انھوں نے کل تیرہ دفعات کے تحت کتابوں کی ترتیب اور فہرست سے متعلق تجاویز پیش کی ہیں چنانچہ ان تجاویز کے فوراً بعد نواب محمد مشتاق علی خاں، رام پور نے ایک دوسرا کیٹلاگ رجسٹر تیار کرنے کا حکم دیا۔

علامہ شبلی کے اس ریمارک کے بعد سرکاری کتب خانہ ریاست رام پور موجودہ رام پور رضا لائبریری کے کیٹلاگ کو بہ لحاظ فن بنایا گیا، علامہ کے رسائل شبلی میں کتب خانوں پر 'اسلامی کتب خانے' کے عنوان سے ایک طویل مضمون ملتا ہے، اس مضمون میں انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں جا بجا کتب خانے اور دارالعلم پائے جاتے تھے، علامہ شبلی نے اپنے اس تحقیقی مضمون میں مورخین اور جغرافیہ کے ماہرین سے یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ جب وہ

''کسی شہر کا حال لکھتے ہیں تو ہر قسم کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن کتب خانوں کا نام تک نہیں آتا۔'' (۲)

اس کمی کو دیکھتے ہوئے علامہ شبلی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ''اسلامی کتب خانے'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا، اس مضمون کے محرک کے سلسلے میں علامہ شبلی نے تحریر کیا ہے:

''............ یوروپ میں اورینٹل کانفرنس قائم ہے، اس کی کارروائیوں نے دل میں یک نئی تحریک پیدا کی، اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جس میں مسلمان

بھی داخل ہیں) ہر قسم کی علمی عملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے .... پچھلے سال جو اس کا اجلاس ہوا اس میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم و ادب، فلسفہ اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ تیار کیا جائے .... یوروپ میں اور بھی بہت سے لوگ اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں، مجھ کو یہ خیال ہوا، جو کام اور قومیں کر رہی ہیں وہ دراصل ہمارا کام ہے .... اور یہ بے غیرتی کی بات ہے کہ اپنے کاموں میں دوسروں کا احسان اٹھائیں، میں نے مختلف عنوانوں پر مضامین لکھے .... اس میں کتب خانہ اسکندریہ کی بحثیں ہیں۔'' (۳)

یورپین مصنفین مسلمانوں کی تاریخ، مذہب اور تمدن سے متعلق اکثر بے بنیاد باتیں لکھا کرتے تھے، چنانچہ حضرت فاروق کے زمانہ کے واقعات کے سلسلے میں لکھا گیا کہ جو کتب خانہ بطلیموسیوں کے زمانہ سے قائم تھا، مسلمانوں نے مصر اور اسکندریہ کی فتح کے بعد اس کتب خانہ کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہ مسلمانوں کے وحشی ہونے کی دلیل ہے۔

۱۸۹۲ء میں مولانا شبلی کا مضمون کتب خانہ اسکندریہ شائع ہوا اور اس مضمون میں مولانا نے محققانہ انداز میں دلائل سے یہ ثابت کیا کہ اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے برباد کیا اور بڑے بڑے پیشوان مذہب اس کی بربادی میں شریک تھے، مولانا شبلی نے یہ ثابت کیا ہے کہ جب مسلمانوں نے مصر اور اسکندریہ کو فتح کیا تو وہاں اس کتب خانہ کا نام و نشان تک نہ تھا، مولانا کا یہ مضمون اردو تحقیق میں ایک اضافہ ہے۔

مولانا شبلی ۲۶؍اپریل ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے ترکی کے لیے روانہ ہوئے، (۴) قسطنطنیہ پہنچے اور وہاں کے کتب خانہ سے استفادہ کیا، انھوں نے وہاں کے مدارس بھی دیکھے، وہاں بھی ہندوستان کی طرح قدیم اور جدید تعلیم کے درمیان حد فاصل تھی۔ (۵)

جب علامہ شبلی نے کتب خانوں پر لکھنا چاہا تو اس وقت تک مواد قابل ذکر نہیں تھا، اس لیے علامہ شبلی نے بنی امیہ کے زمانہ کی تاریخ کو تلاش کیا، عربوں میں لکھنے کا رواج نہیں تھا لیکن قصائد اور شجرہ زبانی یاد کرنے اور یاد رکھنے کا طریقہ تھا۔

''شبلی نے خود ایک سوال قائم کیا انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں کتابوں کو جمع

کرنے اور کتب خانہ کی صورت میں ترتیب دینے کا زمانہ اگرچہ دولتِ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے لیکن اس امر کی تحقیق کے لیے جو خزانہ دولت بنی امیہ کے زمانہ میں جمع ہوا، اس کا سرمایہ کہاں سے آیا ہوگا ہم کو اس سے پیشتر کے زمانہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔''(۲)

شبلی نے تین اشخاص کے نام لکھے ہیں: مرامر، عامر اور اسلم، جنھوں نے حروف کی شکلیں مقرر کی تھیں اور حروف ہجا اس ترتیب سے مرتب کیے جیسے سریانی زبان میں تھے، بشر بن تولید، ان کا ایک شاگرد جب مکہ معظمہ پہنچا تو ابوسفیان امیر معاویہ کے والد اور ابوقیس بن عبدمناف دو اشخاص اس کے شاگرد ہوئے، یہ لوگ اپنے کام سے طائف جایا کرتے تھے، طائف میں بھی تحریر کا رواج ہوا اور قبائل نے بھی تحریر کے فن کو سیکھنا شروع کیا۔

ظہور اسلام کے بعد قبیلہ قریش میں ہی سترہ حضرات صاحب قلم تھے، جن میں عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عثمان بن عفان، ابوعبیدہ بن الجراح کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، عورتوں مین بھی پڑھنے کا رواج تھا، حضرت حفصہ شفا بنت عبداللہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، مدینہ منورہ میں بھی اسلام سے پہلے یہود میں تحریر کا رواج تھا، علامہ شبلی کے اس مضمون سے یہ معلوم ہوا کہ قصائد کی حفاظت کا ذریعہ' نکل آیا سات مشہور قصیدے جو معلقات کے نام سے مشہور ہیں آب زر سے لکھے گیے اور کعبہ پر آویزاں کیے گیے، شبلی کے اس مضمون سے ان کے تحقیقی مزاج تلاش و جستجو اور ان کے وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

انھوں نے اس مضمون میں طب کی کتب کا ذکر کیا ہے جو سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئی تھیں، یہ پہلا اضافہ عربی زبان میں تھا، اس مترجم کا نام ابن آثال تھا، اس کے بعد عرب کا تحریری سرمایہ برابر بڑھتا گیا، رسول اللہ کی حیات میں جو تحریری سرمایہ وجود میں آیا وہ قرآن مجید کی متفرق سورتیں تھیں اس کے علاوہ رسول اللہ کے نامہائے مبارک اور صلح حدیبیہ کے معاہدے تھے۔

شبلی قرائن کی بنیاد پر فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کتاب خانہ کی بنیاد ڈالی وہ خالد بن یزید معاویہ تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ماسرجویہ کی کتاب سریانی زبان سے عربی زبان میں ترجمہ کی تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کو''خزینۃ الکتب'' (کتاب خانہ) میں پایا تھا، علامہ

شبلی کے مقالہ 'اسلامی کتب خانے' سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے سے پہلے شاہی کتب خانہ قائم ہو چکا تھا اور یہ کہ خاندان امیہ میں جس شخص نے قدیم تصنیفات کی جستجو اور تلاش کی وہ خالد بن یزید تھا۔

علامہ شبلی نے خلیفہ ہارون رشید کے بیت الحکمۃ کا ذکر کیا ہے، شبلی نے اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے دو حصے تھے، ایک حصہ کتب خانہ کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا غیر زبانوں کے ترجمہ کے لیے تھا، اس کتب خانہ میں عربی زبان کے علاوہ ہندی، فارسی، یونانی، قبطی، کالڑی زبانوں کی بے شمار کتابیں مہیا کی گئیں، یحییٰ بن خالد برمکی نے جو ہارون رشید کا وزیر اعظم تھا اور خلافت عباسیہ کا چشم و چراغ تھا، اس نے ہندوستان اپنے سفیر بھیجے اور ان کے ذریعہ بڑے بڑے پنڈتوں اور حکیموں کو دربار میں بلایا:

> ''یہی پنڈت تھے جن کی وجہ سے ہندوستان کا سرمایۂ علمی بغداد پہنچا اسلامی دنیا کا دوسرا حصہ عباسیوں کے زیر نگیں تھا، بخارا میں سامانی خاندان کی حکومت تھی، جرجان میں قابوس بن وشمگیر فرماں روا تھا شام کے اضلاع بنو حمدان کے ہاتھ میں تھے، مصر میں فاطمیین فرماں روا تھے، ان میں سے ہر ایک نے کتب خانہ قائم کیے تھے اور کتب جمع کی تھیں۔'' (۷)

بوعلی سینا کے حوالے سے بخارا کے بادشاہ نوح بن منصور کے کتب خانہ کا ذکر کیا گیا ہے، کتب خانہ ایک بہت بڑے مکان میں تھا، جس میں بہت سے کمرے تھے، صندوقوں میں کتابیں رکھی جاتی تھیں، ہر فن کے لیے جدا کمرہ تھا۔ صفحہ ۲۷۔

اس دور میں عوامی کتب خانہ بھی تھے، مدرسوں اور مساجد کے ساتھ کتب خانہ ہوتے تھے، علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

> ''چوتھی صدی کے آغاز تک کسی پبلک کتب خانہ کا پتہ نہیں ملتا سب سے پہلے سابور بن اردشیر ایک امیر تھا، جس نے ۳۸۲ھ میں بغداد میں ایک دارالعلم بنوایا اور بہت سی کتابیں عام لوگوں کے لیے مطالعہ کے لیے وقف کیں، اس کے بعد ۳۹۵ھ میں حاکم بامر اللہ نے جو فاطمی خاندان سے مصر کا فرماں روا ہوا، ایک عظیم الشان کتب خانہ تعمیر کیا، یہ کتب خانہ جس کو مورخین نے ہمیشہ دارالعلم کے نام سے یاد کیا ہے، بڑی شان و شوکت سے کھولا گیا اور بہت سے قراء، منجمین، اطباء، ادبا، رسم افتتاح میں حاضر ہوئے ..... کتابوں کے

مطالعہ اور نقل و کتابت کی عام اجازت تھی اور اس غرض سے کاغذ، دوات، قلم وغیرہ خود کتب خانہ کی طرف سے مہیا تھی۔" (۸)

علامہ شبلی نے کتب خانہ خدیویہ کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، کتب خانہ خدیویہ قسطنطنیہ میں ہے، یہ ۱۲۸۶ھ میں قائم ہوا، قاہرہ اور اسکندریہ میں چھوٹے چھوٹے کتب خانے تھے ان کی حفاظت کا انتظام ناکافی تھا، اس لیے ڈائرکٹر آف تعلیمات کی رپورٹ پر یہ کتب خانہ قایم کیا گیا، اور چھوٹے چھوٹے غیر محفوظ کتب خانوں کی کتب یہاں لاکر جمع کر دی گئیں، علما کو حکم دیا گیا کہ نادر و نایاب کتب کی نقلیں تلاش کرا کر منگائی جائیں، کتب جمع ہو جانے کے بعد ۱۳۰۰ھ میں اس کتب خانہ کی فہرست سازی کا کام شروع کیا گیا، اور ۱۳۰۹ھ تک اس کی فہرست مکمل ہوئی، صرف عربی کتابوں کی فہرست کی جلدیں آٹھ ہیں انگریزی، فرنچ اور ترکی کتب کی فہرستیں الگ ہیں۔

علامہ شبلی اس کتاب خانہ میں تشریف لے گیے، وہاں کی کتب کو دیکھا اور پڑھا، انھوں نے اپنے سفرنامہ میں ص ۷۸ پر اس کتب خانہ کی کتب کی ایک فہرست دی ہے اور اس کے بعد الگ الگ عنوانات قایم کر کے کتابوں کے نام دیے ہیں، عنوانات تفسیر، حدیث اور ادب قایم کیے ہیں، مصنفین اور کتب کے نام درج کیے ہیں، اس کے علاوہ مولانا ترکی کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں گیے ہیں اور وہاں کے مدارس کی لائبریریوں کا ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی کو کتب خانوں کے تذکرے کے حوالے سے جو چیز مابہ الامتیاز کرتی ہے وہ کتب خانوں کی کتب کی تفصیلات ہیں، سفرنامہ روم و مصر و شام کے صفحہ ۷۸ پر انھوں نے قسطنطنیہ کے کتب خانوں کی فہرست دی ہے، اور اس فہرست کے ساتھ ساتھ نسخوں کی صحت اور عمدگی کے عنوان سے نسخوں کے خط کے بارے میں بتایا ہے، تحریر کرتے ہیں:

> "سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کتابیں جو یہاں موجود ہیں، عموماً قدیم الخط صحیح اور اساتذۂ سابقہ کی صحیح کردہ ہیں، قدیم اور نایاب کتابیں جن کے دو ہی چار نسخے دنیا میں ہوں ان کا صحیح ہونا سب سے مقدم ہے، ورنہ ان پر اعتبار نہیں ہو سکتا مصر کے کتب خانہ میں بھی قدیم کتابیں کچھ کم نہیں، لیکن اکثر زمانہ حال کی لکھی ہوئی ہیں اور اس وجہ سے چنداں صحیح اور قابل استناد نہیں، قسطنطنیہ کی کتابوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کتابوں کے ایسے

عجیب وغریب نسخے کہاں سے بہم پہنچائے ہیں۔

اسرار البلاغت عبدالقاہر الجرجانی کی مجھ کو مدت سے تلاش تھی، ہندوستان میں صرف ایک نسخہ کا پتہ لگا لیکن وہ نہایت غلط اور ناقابل اعتبار تھا، قسطنطنیہ میں اس کے متعدد نسخ دیکھے اور نہایت صحیح اور قدیم الخط، اسی طرح کتاب البیان والتبیین للجاحظ، تذکرہ ابن حمدون، معجم الادباء یاقوت حموی، کتاب الاشراف للبلاذری تاریخ امام بخاری وغیرہ کے نسخے نہایت صحیح اور مستند موجود ہیں۔''(۹)

لائبریریوں پر آج بھی جو مضامین لکھے جاتے ہیں، وہ لائبریری کے نظام، اس کی مختصر تاریخ، یا اس میں کسی ایک یا دو نسخوں کا ذکر ہوتا ہے لیکن شبلی کے اس مضمون ''اسلامی کتب خانہ'' کی اہمیت یہ ہے کہ کتب خانوں کی تاریخ، اس سے متعلق وقف، ان کی اہم کتب، قلمی نسخوں کا ذکر، اور ان کے خط اور مصنف کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں، علامہ کے اس مضمون کی آج بھی اتنی ہی معنویت ہے جتنی اس وقت تھی جب یہ لکھا گیا تھا۔

ماخذ

(۱) ابوسعد اصلاحی، رام پور رضا لائبریری کے کیٹلاگ و کیٹلاگس سازی کا ایک جائزہ، رضا لائبریری جرنل ۱۲، ۱۳-۲۰۰۲ء، ص ۱۵۵۔

(۲) شبلی نعمانی، رسائل شبلی، سلسلۂ آصفیہ باہتمام میر اصغر علی، مطبع العلوم علی گڑھ، ص ۱۸۔

(۳) ایضاً، ص ۱۰۳۔

(۴) علامہ شبلی نے یہ سفر پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ کیا تھا، سفرنامۂ روم وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، جدید ایڈیشن ۱۹۹۹ء، ص ۹۔

(۵) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۵ء۔

(۶) شبلی نعمانی، رسائل شبلی، سلسلۂ آصفیہ باہتمام میر اصغر علی، مطبع العلوم علی گڑھ، ص ۱۹۔

(۷) ایضاً، ص ۲۲

(۸) سفرنامۂ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص ۷۶، ا۔

(۹) ایضاً، ص ۷۸۔

☆☆☆

علامہ شبلی بحیثیت مخطوطہ شناس اور منتظم کتب خانہ

ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی☆

علم کی ترویج واشاعت میں کتب خانوں کا جو رول رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، خاص طور پر مسلمان اس حقیقت سے واقف تھے کہ تہذیب وتمدن کے بقا، علوم وفنون کی ترقی اور تعلیم وتعلم کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے کتب خانوں کا وجود ناگزیر ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان جہاں بھی رہے انھوں نے کتب خانوں کو قائم کرنے میں گہری دل چسپی دکھائی، تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلم مفکروں نے کتب خانوں سے استفادہ کرکے علمی میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، علامہ شبلی اس راز سے واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ انھیں نادر ونایاب کتابوں سے عشق تھا، نادر ونایاب کتابوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے تھے، نایاب کتابوں کے شوق میں انھوں نے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور پھر المامون، الفاروق اور سیرۃ النبی جیسی معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کرکے علماء کی اول صف میں شامل ہوگئے، مولانا شبلی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک ادیب، شاعر، خطیب، تاریخ نگار، سیرت نگار، تنقید نگار، ماہر تعلیم، صحافی، متکلم ومحقق کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہیں، میں اس میں اضافہ کرتے ہوئے انہیں ایک ماہر مخطوطہ شناس اور منتظم کتب خانہ کی حیثیت سے متعارف کرانا چاہتا ہوں۔

لائبریری سائنس ایک فن ہے اور اگر اس فن کے نقطۂ نظر سے مولانا شبلی کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی کتب خانوں سے دل چسپی، نادر ونایاب کتابوں کا شوق کتب شناسی اور کتب خانوں کے سلسلے میں ان کی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا ایک ماہر

☆لائبریری اینڈ انفارمیشن آفیسر، رامپور رضا لائبریری، رامپور۔

مخطوطہ شناس اور بہترین منتظم کتب خانہ بھی تھے۔

حیات شبلی کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے واقف ہیں کہ علامہ شبلی کو کتابوں اور کتب خانوں سے فطری لگاؤ تھا، اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا سے پہلے ہمارے علما پر مدرسیت اتنی چھا گئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتابوں اور ان کے شروح وحواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا کسی اور علم سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا تھا، انھوں نے ہر علم وفن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے کونہ کونہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال، فلسفہ، منطق وکلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیے۔'' (۱)

ندوی صاحب کے بہ قول مولانا کو شروع ہی سے نایاب کتابوں کا شوق تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد جب وہ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۲ء تک اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں رہے اور مختلف نوعیت کے پیشے سے منسلک رہے تو اس دور میں بھی نایاب کتابوں کی جستجو میں لگے رہتے تھے، لکھتے ہیں کہ:

''اعظم گڑھ میں کتابوں کی ایک دوکان تھی، مولانا اکثر اس میں چلے جاتے اور شام تک علمی کتابیں پڑھا کرتے یا دواوین دیکھا کرتے۔'' (۲)

لیکن ان کے اندر تاریخی ذوق اس وقت پیدا ہوا جب ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ میں تقرر ہوا اور انھیں سرسید کے کتب خانے سے استفادہ کا موقع ملا۔

ندوی صاحب لکھتے ہیں:

''جب وہ علی گڑھ پہنچے اور سرسید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ، جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ، مصر وشام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ اسلام کا نیا دور شروع ہوا۔'' (۳)

سرسید کے کتب خانے کے بارے میں مولانا شبلی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ، جغرافیہ، عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں یورپ میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں۔'' (۴)

سرسید کے کتب خانے نے مولانا کے شوق کو اور بھڑکا دیا، اعظم گڑھ کے محدود ماحول سے نکل کر وہ علی گڑھ کی وسیع فضا میں تو پہنچ گئے لیکن نایاب کتابوں کا شوق اور علم کی تشنگی یہاں بھی کم نہیں ہوئی، ہندوستان کے کتب خانے ان کی پیاس بجھانے کے لیے جب ناکافی نظر آئے تو انھوں نے روم، مصر و شام کے کتب خانوں کا رُخ کیا، ۱۸۹۲ء میں مولانا نے ترکی، شام اور مصر کا سفر کیا اور قسطنطنیہ (استنبول) بیروت، بیت المقدس، قاہرہ وغیرہ کے علمی خزانے دیکھے اس سے استفادہ کیا، نایاب کتب کے اقتباسات لیے وہاں کے سیاسی، معاشی، علمی و تعلیمی ماحول کا جائزہ لیا، واپس آ کر یہ روداد سفر نامہ روم مصر و شام کے نام سے ۱۸۹۴ء میں شائع کیا، سفر کا مقصد جیسا کہ مولانا شبلی نے خود سفر نامہ میں لکھا ہے، وہاں کے کتب خانے کی نایاب کتابوں کو دیکھنا اور اس سے استفادہ کرنا تھا، لکھتے ہیں:

''جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہو سکتا، یہی خیال تھا جس نے اول اول سفر کی تحریک دل میں پیدا کی، کیوں کہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک ایسا سلسلہ تالیف ضرور تیار ہو سکتا ہے۔'' (۵)

قسطنطنیہ کے کتب خانوں کی تفصیل درج کرتے وقت اس مقصد کو اور بھی وضاحت سے بیان کیا، ''کتب خانے'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''ترتیب مضمون اور نسق کلام کی وجہ سے اس عنوان پر دیر میں پہنچا ورنہ ذاتی شوق اور غایت سفر کے لحاظ سے یہی مضمون تھا جس کو سب سے اول سب سے مفصل لکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کے علمی کارناموں میں جو چیز سب سے زیادہ قابل فخر ہے وہ یہی کتب

خانے ہیں، اسلامی دنیا میں جن حصوں میں آج تعلیم و تعلم کا چرچا ہے وہ ہندوستان، عرب، مصر، شام، بلاد مغرب، فارس اور ایران ہیں، ان میں سے اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو نہیں دیکھا وہ ایسے قوی وسائل سے معلوم کیے کہ دیکھنے کے برابر ہے، اس بنا پر کافی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمام اسلامی دنیا میں یہ عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔"(٦)

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے علامہ شبلی کو نایاب کتابوں کو دیکھنے اور پڑھنے کا بے انتہا شوق تھا، اسی شوق کی وجہ سے کتابوں کی ڈھیر میں ان کی نگاہ ہمیشہ نادر و نایاب مخطوطات پر ٹھہرتی تھی اور کتب خانوں کی تعریف کرتے وقت ان کا سب سے زیادہ زور نایاب کتابوں پر ہی ہوتا تھا مثلاً قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"کل کتب خانے جو اس شہر میں ہیں ان کی تعداد ۴۵ ہے۔ ان کتب خانوں کی کل کتابیں ۸۵ ہزار ہیں، اگرچہ یہ تعداد کچھ بڑی نہیں، ہمارے ہندوستان میں اس سے زیادہ کتابیں ہیں، لیکن قسطنطنیہ کو جو ترجیح ہے وہ کتابوں کی عمدگی اور کمیابی کی حیثیت ہے"۔(۷)

اسی طرح ان کتب خانوں کو قائم کرنے والے ترک امراء کی انھوں نے تعریف کی ہے، یہ تعریف بھی نایاب کتابوں کی وجہ سے کی ہے، لکھتے ہیں:

"ان کتب خانوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترکوں میں امراء کا گروہ (جو اور قوموں میں نسبتاً ایک جاہل گروہ ہوتا ہے) تعلیم یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ تھا، اکثر کتب خانوں میں وقف کرنے والوں کی ذاتی تصنیفات یا ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں جو ان کے مذاق اور وسعت نظر کی شاہد ہیں، اس کے علاوہ جس قسم کی عمدہ اور نایاب کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کی گئی ہیں خود ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جمع کرنے والے کا علمی مذاق معمولی نہ تھا۔"

انھوں نے مجموعی اعتبار سے قسطنطنیہ کے کتب خانوں کی خصوصیات کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے ان کی مخطوطہ شناسی کی صلاحیت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کتابیں جو یہاں موجود ہیں عموماً قدیم الخط صحیح

اور اساتذہ سابقہ کی صحیح کردہ ہے، قدیم اور نایاب کتابیں جن کے دو چار نسخے دنیا میں ہوں
ان کا صحیح ہونا سب سے مقدم ہے۔'' (۹)

سب سے اہم اور حیرت انگیز بات جو ان کتابوں کی خصوصیات کے ضمن میں لکھی ہے، وہ
یہ ہے، لکھتے ہیں:

''میرا خیال تھا کہ دولت عباسیہ کے عہد میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے
ہوئے تھے، دنیا سے ناپید ہو گئے لیکن یہاں آ کر اس خیال کی غلطی ثابت ہوئی، اگرچہ جس
کثرت سے ترجمے ہوئے تھے اس کے اعتبار سے تو موجود سرمایہ بھی نہ ہونے کے برابر
ہے، تاہم جس قدر موجود ہے، وہ بھی غنیمت ہے۔'' (۱)

مزید آگے لکھتے ہیں:

مشہور حکماء، اور ائمہ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں، کہیں نہیں مل
سکتیں، امام غزالی، بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف
ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہیں اکثر یہاں موجود ہیں۔'' (۱۱)

بیروت کے کتب خانہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''کالج کی لائبریری بہت بڑی نہیں ہے لیکن کتابیں نادر اور کمیاب جمع کی گئی ہیں،
جو کتابیں چھپی نہیں اور ان کے قدیم نسخے نہیں مل سکے، یورپ اور ایشیاء کے مشہور کتب
خانوں سے ان کی نقل اور استنساخ کا انتظام کیا ہے، ابن رشیق کی کتاب العمدۃ جو اپنے
باب میں بے مثل اور نادر کمیاب ہے، میں نے اسی کتب خانہ میں دیکھی۔'' (۱۲)

مصر کی خدیو لائبریری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''کتابیں جہاں رکھی ہیں وہ بالکل جداگانہ قطعہ ہے..... چاروں طرف دیوار سے ملی
ہوئی، آئینہ دار الماریاں ہیں، بیچ میں آئینہ دار میزیں ہیں جن کے اندر قلمی اور نایاب کتابیں
کھلی رکھی ہیں، ان میں ایک قرآن جو ہرن کے چمڑے پر لکھا ہوا ہے، اور جس کی نسبت کہا
جاتا ہے کہ امام جعفر صادق کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کے سوا قرآن مجید کے اور نادر نسخے
ہیں جو سلاطین مصر نے آٹھویں اور نویں صدی میں وقف کئے تھے۔'' (۱۳)

اسی کتب خانہ کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے:

''ترتیب خوش اسلوبی، زیب وزینت، حسن انتظام، خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے، اس وقت اس کتب خانہ میں ہر علم وفن کی چودہ ہزار سات سو پانچ عربی کتابیں موجود ہیں۔'' (۱۴)

مولانا نے اس کتب خانہ کو بڑی تفصیل سے دیکھا اور ہر علم وفن کے نادر مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی جس کی تفصیل سفرنامہ میں موجود ہے، اس فہرست کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں شامل تاریخ وادب کی اکثر کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا جہاں بھی گئے ان کی متلاشی نگاہیں ہمیشہ نادر ونایاب کتابوں کو ڈھونڈتی جن کتابوں پر انھوں نے انگلی رکھ دی ان کی اہمیت تسلیم کی گئی اور وہ مشہور ہوگئیں۔

لائبریری سائنس میں اس استعداد کو علم المخطوطات، مخطوطہ شناسی Manuscriptology کہتے ہیں، آج علم المخطوطات ایک فن ہے، یہ فن ہر ایک اسکالر کو نصیب نہیں ہوتا، ایک دو مخطوطہ پڑھ لینے یا ایڈٹ کردینے سے کوئی مخطوطہ شناس نہیں بن جاتا بلکہ سالہا سال کی محنت کے بعد یہ استعداد پیدا ہوتی ہے، اس فن میں مہارت کے لیے تمام اسلامی علوم وفنون کی واقفیت ضروری ہے، کثرت مطالعہ، مخطوطات کا شوق، بار بار مخطوطات دیکھنے ان کے بارے میں پڑھنے اور دنیا بھر کے مخطوطات کے کیٹلاگ کے مطالعہ کے بعد تب کہیں جا کر ایک اسکالر اس قابل بنتا ہے کہ اسے مخطوطہ شناس کہا جاسکے۔

لائبریری سائنس کے نقطۂ نظر سے مولانا کی زندگی کا مطالعہ کرنے پر اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ماہر مخطوطہ شناس کے ساتھ علم کتب خانہ کے اکسپرٹ اور منتظم کے طور پر بھی ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

اس سلسلے میں اس رپورٹ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو انھوں نے جنرل عظیم الدین خاں، مدار المہام ریاست رامپور کی درخواست پر ۱۸۸۸ء میں کتب خانہ رامپور کے سلسلے میں تیار کی تھی، اس رپورٹ میں انھوں نے الماریوں کی ترتیب، فہرست سازی کا طریقہ، نادر ونایاب کتابوں کا انتخاب اور ان کے تحفظ کے علاوہ دیگر ضروری مشورے اور تجاویز درج کی تھیں، کیٹلاگنگ، کلاسیفکیشن اور لائبریری ایڈمنسٹریشن پر مولانا کو کس قدر گہری واقفیت تھی اس رپورٹ سے بخوبی اندازہ لگایا

جاسکتا ہے، رپورٹ میں لکھتے ہیں:

""میں نے کتب خانہ سرکاری کو جو در حقیقت ریاست کی علمی فیاضیوں کی ایک حیرت انگیز یادگار ہے، دو تین دن میں جس قدر تحقیق وکاوش کی نگاہ سے دیکھنا ممکن تھا، دیکھا، ایک شخص گو اس کی نظر کتنی ہی وسیع ہو کتب خانہ کے احاطہ میں جا کر جب ان عزیز الوجود اور بیش بہا کتابوں کو دیکھے گا جن کو جستجو اور قدردانی اور فیاضیوں نے دنیا کے مختلف حصوں سے لاکر جمع کردیا ہے تو دفعتاً وہ حیرت زدہ ہو جائے گا لیکن اسی کے ساتھ جب وہ کتب خانہ کی بے ترتیبی اور فہرست کی ناموزونی پر نظر ڈالے گا تو سخت افسوس کرے گا۔" (۱۵)

اس تمہید کے بعد انھوں مختلف کمیوں اور خامیوں کا ذکر کر کے ایک سے تیرہ دفعات کے تحت اصلاح کی غرض سے مفید مشورہ دیا ہے۔

پہلی دفعہ کتابوں کی ترتیب سے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں:

""سب سے بڑی بے ترتیبی یہ ہے کہ کتابیں الماریوں میں حروف تہجی کی ترتیب سے رکھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب الخراج، قاضی امام یوسف کو جو نہایت عالی رتبہ تصنیف ہے، کلیات رند کے پہلو میں جگہ دی جاسکتی ہے، سب سے مقدم یہ ہے کہ فن اور علم کے لحاظ سے فہرست مرتب کی جائے اور پھر اس میں حروف تہجی کا لحاظ ہو۔" (۱۶)

مولانا کی اس تجویز پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے موضوع کے اعتبار سے کتابیں اور ان کی فہرست مرتب کرنے کا مشورہ دیا ہے، آج کی لائبریریوں میں یہی سسٹم رائج ہے، موضوع کے اعتبار سے کتابوں کی ترتیب کو سب سے بہتر اور سائنٹفک مانا گیا ہے اس فہرست کو ہم سبجکٹ کیٹلاگ کہتے ہیں۔

دوسری دفعہ فہرست سازی سے متعلق ہے لکھتے ہیں:

""فن کی ترتیب سے جو فہرست ہوگی اس کے ذریعہ سے کتابوں کا نکالنا مشکل ہوگا اس لیے حروف تہجی کے اعتبار سے بھی ایک فہرست موجود رہے۔" (۱۷)

اس تجویز میں موضوع کے اندر عنوان کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرنے کی بات کہی ہے، یہی طریقہ اس وقت رضا لائبریری میں رائج ہے۔

تیسری دفعہ کلاسیفکیشن سے متعلق ہے، لکھتے ہیں:

''ہر کتاب پر دو قسم کے نمبر قائم کیے جائیں، ایک باعتبار فن اور ایک باعتبار حروف تہجی کے، لیکن فن کا نمبر اول قرار دیا جائے، مثال یہ ہے:

کتاب الخراج نمبر فن ۳۰ نمبر حروف تہجی ۱۴۳'' (۱۸)

اس تجویز کو دیکھ کر مجھے کافی حیرت ہوئی کیوں کہ جس زمانہ کی رپورٹ ہے اس دور میں لائبریری سائنس کے اصول وضوابط بالکل ابتدائی مراحل میں تھے، موجودہ کلاسیفکیشن اسکیم جس میں Subject کو کوڈ سے ظاہر کیا جاتا ہے آج بھی مولوی سمجھنے سے قاصر ہے، جب تک کہ لائبریری سائنس کا کورس نہ کیے ہو، لیکن مولانا شبلی اس کلاسیفکیشن اسکیم سے پوری طرح واقف تھے، لائبریری سائنس کی اصطلاح میں اس طریقہ کو Notation کہتے ہیں۔

دفعہ چھ نادر و نایاب کتابوں کے انتخاب سے متعلق ہے، لکھتے ہیں:

''جو کتابیں محفوظ اور ریزرو قرار دی گئی ہیں ان میں صرف خوش خطی اور حیثیت ظاہری کا لحاظ کیا گیا ہے حالانکہ وہ کتابیں دراصل ریزرو قرار دی جاسکتی ہیں جو عمدگی اور وقعت مصنف اور کمیابی کے لحاظ سے قابل قدر ہوں، میں نے نہایت نادرالوجود کتابوں کو دیکھا ہے کہ وہ عام کتابوں کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں، ایسی تمام کتابیں چھانٹ کر الگ کی جائیں اور ان کے لیے ایک خاص الماری ہو۔'' (۱۹)

مولانا عرشی کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز سے قبل رضا لائبریری میں مخطوطات و مطبوعات ایک ساتھ رکھے تھے، اس تجویز کے بعد پہلے مخطوطات و مطبوعات کو الگ کیا گیا پھر اس کے بعد مخطوطات میں عام اور نادر مخطوطات کی تقسیم کی گئی۔

دفعہ ۱۴ میں فہرست سازی کے لیے سبجکٹ اکسپرٹ مقرر کرنے کی تجویز ہے، لکھتے ہیں:

اس قسم کی فہرست اور ترتیب کے لیے جو ضروری ہے......ضرور ہے کہ چند مدت کے لیے کوئی لائق اور مستعد عالم شخص مقرر کیا جائے اور موجود اسٹاف اس کی نگرانی میں کام کرے۔'' (۲۰)

مولانا نے رپورٹ میں جتنے مشورے دیے ہیں وہ موجودہ لائبریری سائنس کورس کا حصہ

ہیں، مولانا نہ تو کسی لائبریری کے لائبریرین تھے اور نہ ہی لائبریری سائنس کی تعلیم حاصل کی تھی اس کے باوجود انھوں نے اپنے علم اور تجربہ کی بنیاد پر جو تجاویز پیش کی ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔

کتابوں اور کتب خانوں سے بے پناہ دلچسپی کی وجہ سے مولانا کی بے انتہا خواہش تھی کہ مسلمان کتب خانوں میں موجود نایاب ذخیروں سے فائدہ اٹھائیں، وہ چاہتے تھے کہ مخطوطات کتب خانوں میں یوں ہی نہیں رہیں بلکہ انھیں شائع کر کے عام لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ لوگ اسلام کی عظمت سے واقف ہو سکیں، اپنی تحریروں کے ذریعہ بار بار اس جانب لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں، اس سلسلے میں وہ عیسائیوں کے کام کی تعریف بھی کرتے ہیں جن کی بدولت عربی، زبان وادب کی نہایت نادر ونایاب کتابیں شائع ہوئیں لیکن وہیں جب عیسائیوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر حملہ ہوتا ہے تو کتب خانہ اسکندریہ اور اسلامی کتب خانے لکھ کر معترضین کا منھ توڑ جواب بھی دیتے ہیں۔

بہر حال کتب خانوں کے حوالے سے ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علمی میدان میں دیگر حیثیتوں کے ساتھ وہ ایک ماہر مخطوطہ شناس اور لائبریری اکسپرٹ کے طور پر بھی امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔

☆☆☆

حوالے:

(۱) حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، صفحہ ۳۶۔

(۲) ایضاً صفحہ ۱۰۹

(۳) ایضاً صفحہ ۱۳۶

(۴) ایضاً صفحہ ۱۳۷

(۵) سفر نامہ روم ومصر وشام، شبلی نعمانی قومی پریس دہلی۔ ۱۹۰۲ء، صفحہ ۱۱

(۶) ایضاً صفحہ ۹۰

(۷) ایضاً صفحہ ۹۱

(۸) ایضاً صفحہ ۹۱

(۹) ایضاً صفحہ ۲۰۳

(۱۰) ایضاً صفحہ ۲۰۳

(۱۱) ایضاً صفحہ ۲۰۳

(۱۲) ایضاً صفحہ ۲۰۴

(۱۳) ایضاً صفحہ ۲۰۴

(۱۴) ایضاً صفحہ ۲۰۴

(۱۵) معارف جلد ۳۴، شمارہ ۴، جولائی تا دسمبر ۱۹۳۴ء صفحہ ۲۹۷ تا ۳۰۱

(۱۶) ایضاً

(۱۷) ایضاً

(۱۸) ایضاً

(۱۹) ایضاً

(۲۰) ایضاً

☆☆☆

عہد حاضر میں علامہ شبلی کی معنویت

(افکار و نظریات کے آئینے میں)

ڈاکٹر منظر حسین ☆

کسی نئے عہد میں ماضی کی کسی اہم شخصیت اور ان کے کارناموں کی معنویت کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی مجموعی فکر اور کارناموں میں پوشیدہ جذبے پر توجہ مرکوز کی جائے اور ساتھ ہی اس کا بھی تجزیہ کیا جائے کہ ایک خاص عہد میں قوم کی تعمیر و تشکیل میں ایک شخص نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، آج کا دور اُس شخص کے عہد سے کتنا مماثل و مشابہ ہے، مولانا شبلی کے افکار و خیالات اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کی معنویت بھی اسی نظریے سے تلاش کی جانی چاہیے۔ مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ہشت پہلو تھی، وہ ایک بلند پایہ ادیب، معتبر سوانح نگار، مستند مورخ و سیرت نگار، اُردو میں عملی اور تقابلی تنقید کے موجد، منفرد شاعر کے علاوہ ماہر تعلیم اور مصلح امت تھے۔

سرسید احمد خاں کے رفقاء میں شبلی کی شخصیت ہمیشہ آزاد اور خود مختار دکھائی دیتی ہے، سرسید کے مغربی افکار و نظریات کا اثر کم و بیش اُن کے تمام رفقاء پر پڑا، مولانا شبلی اُس سے مستثنیٰ ہیں، یہ صحیح ہے کہ علامہ کا ذہنی اُفق علی گڑھ آنے کے بعد وسیع ہوا، سرسید نے اُن کی فکری و ذہنی تربیت کی، ۱۸۸۳ء میں علامہ جب اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے علی گڑھ آئے تو اُن کی عمر ۲۶ سال تھی، سرسید نے اس نو وارد اور ہونہار نوجوان کی شفقت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اُن کی رہائش کا انتظام بھی اپنی کوٹھی کے احاطے میں کر دیا، اپنے نادر کتب خانے سے استفادے کی بھی اجازت دے دی، بہ قول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

☆ لکچرر، شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی (جھارکھنڈ)

''سرسید کے ہاں انھیں وہ سامان تحقیق میسر آیا جس نے اُن کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے۔'' (بحوالہ سرسید اور علی گڑھ تحریک، خلیق احمد نظامی صفحہ ۲۴۹)

خود مولانا شبلی نے بھی سرسید کی احسان مندی کا اعتراف کھلے دل سے اپنی زبان اور قلم سے کیا ہے، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سید صاحب نے اپنے کتب خانے کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کو حقیقت میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں، گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعے میں ہے۔''

(بحوالہ مکاتیب شبلی حصہ اول، مرتبہ: سید سلیمان ندوی صفحہ ۵۶-۵۷)

باوجود اس کے کہ علامہ شبلی کی نظر میں سرسید اعلیٰ صفات وکمالات کے مالک تھے، خوبیوں، نیکیوں، اچھائیوں کا سرچشمہ تھے اور چودہ سال سے زیادہ انھوں نے سرسید سے کسب فیض کیا، پھر بھی وہ سرسید کی راہ نہیں اپنا سکے اور سرسید کے مغربی تصورات اُنہیں اپنے رنگ میں رنگنے میں کامیاب نہ ہو سکے، شبلی کا ذوق تاریخ بڑی حد تک سرسید کے فیضان واثرات کا نتیجہ ہے لیکن اپنے اعتدال پسندانہ رویہ اور متوازن فکر ونظر کی بدولت اپنی ایک الگ راہ نکالنے میں کامیاب رہے۔ سرسید کی شخصیت اور ان کے تمام تر احسانات کے باوجود شبلی نے محض مقلد بن کر رہنا کبھی گوارا نہیں کیا، شبلی نعمانی کی تربیت مشرقی تہذیب اور مشرقی علوم کے زیر سایہ ہوئی تھی، وہ مذہبی جوش، قومی حمیت اور ملت کی خیر خواہی میں بھی سرسید سے کم نہ تھے اور ان کی بے خوفی اور بے باکی کے علاوہ اپنے آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے سرسید کی پالیسی کے برعکس انگیریزوں کے استبداد اور حاکمانہ جبر وظلم کے خلاف اپنی نظم ''شہر آشوب اسلام'' (ہنگامہ طرابلس وبلقان) کے توسط سے آواز بلند کی، انتشار اور ابتری کے اس پرآشوب دور میں بھی نہ تو وہ کبھی کسی سے ڈرے سہمے اور نہ ہی کسی سے مرعوب نظر آئے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سرسید کے افکار ونظریات جمال الدین افغانی سے میل نہیں

کھاتے، اُس کے باوجود بہ قول ڈاکٹر عزیز احمد:

''سید احمد خاں کے رفیقوں میں شبلی سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے شاگرد شیخ محمد عبدہ سے قاہرہ میں روابط پیدا کیے۔'' (بحوالہ ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت ص۱۲۲)

یہی نہیں شبلی نے سرسید کی اندھی اور کورانہ تقلید سے احتجاج کی حد تک انحراف کیا ہے اور یہ احتجاج سرسید کی جدیدیت اور جدید تعلیمی نظریات کے علاوہ اُن کے سیاسی مسلک کے سلسلے میں بھی تھا، ساتھ ہی مذہبی اور تعلیمی اُمور میں بھی، شبلی کا خیال تھا کہ سرسید کا جدید تعلیم کے متعلق نظریہ محض یک رخا ہے اور یورپ کی تقلید کا پرتو، ایسی تعلیم صرف نوکری دلا سکتی ہے، ذہن ودماغ کی آبیاری نہیں کر سکتی، کہتے ہیں:

''دنیا میں آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے، ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی، اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لیے زحمتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟'' (بحوالہ مقالات شبلی جلد ۸ صفحہ ۱۵۰)

شبلی سرسید کے سیاسی مسلک سے کبھی متفق نہ رہے، حد تو یہ ہے کہ الہلال میں سرسید کی سیاسی پالیسی کے خلاف ایک قطعہ بھی شائع کیا۔

کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات ☆ روشِ سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف ☆ اُن کی جو بات تھی آورد تھی، آمد تو نہ تھی

سیاسی اعتبار سے سرسید شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے جب کہ شبلی فطرتاً جمہوریت کے طرفدار تھے وہ دل سے کانگریس کے اُصولوں کے حامی رہے حالانکہ عملی سیاست میں انھوں نے کبھی دلچسپی نہیں لی لیکن ان کی سیاسی رائے میں آخر تک کوئی تبدیلی نہیں آئی، اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''رائے میں میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ سولہ برس رہا لیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔''

(حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ص ۲۹۷)

شبلی کے مذکورہ بالا افکار ونظریات کے تجزیے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے ہر مسئلے اور چیلنج کا سنجیدہ، علمی اور دانشورانہ حل تلاش کرتے ہیں، بہ قول شیخ محمد اکرم:

''شبلی ایک ذو جہت ہستی تھے، انھوں نے صرف قدیم کی پاسداری نہیں کی بلکہ وہ جدید کی مفید باتوں سے بھی مستفید ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

(بحوالہ یادگار شبلی: شیخ محمد اکرم ص ۱۲)

آج کا عہد تبدیلیوں کا عہد ہے Globlizaton کے اس دور میں ملک ومعاشرہ، سماج، افراد، ادب اور سیاست کے حالات اور تقاضے بدل رہے ہیں، ایسی صورت میں ہم شبلی کے افکار ونظریات سے Inspiration حاصل کرسکتے ہیں، شبلی بھی سرسید کی طرح نئے حالات اور نئی ضروریات سے متاثر تھے، اُن کا طرز فکر قدامت کا کبھی اسیر نہیں رہا، دینی تعلیم کی بابت بھی اُن کے تصورات رسمی نہیں تھے،، دینی تعلیم کے نصابات میں تبدیلی ہی ندوہ کے قیام کا مقصد تھا، وہ ایک خاص حد تک جدید تعلیم کی افادیت کے قائل تھے، اسی لیے انھوں نے ندوہ کی تعلیم میں انگریزی یا یورپ کی کسی زبان کی لازمی تعلیم، زمانہ موجودہ کے علوم وفنون کی تدریس اور موجودہ زمانے کی ضرورتوں اور خیالات سے واقفیت ضروری سمجھی، آج کے عہد میں بھی اُن کے افکار ونظریات کی معنویت مسلم ہے، وہ کبھی بھی مغرب زدگی سے ذہنی طور پر مرعوبیت کے شکار نہ ہوئے بہ قول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ:

''وہ (شبلی) یورپ کے علوم وفنون کے مداح اور خوشہ چیں تھے مگر اندھے مقلد نہ تھے۔''

شبلی آزادیٔ رائے کے قائل تھے، اگر اُن کے فکر ونظر کی آزادی کے تصور پر عمل کیا جائے تو ہماری زندگی کا کوئی بھی گوشہ تاریک نہیں رہ سکتا بلکہ ترقی کے نت نئے راستے ہموار ہوسکتے ہیں، اُن کے نزدیک نظم وضبط اور توازن فکر کی بڑی اہمیت ہے۔ اندھی اور کورانہ تقلید کو انھوں نے کبھی برداشت نہیں کیا، شبلی نے ان ہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ملت ومذہب، ادب واداروں کی خدمت کی جو آج بھی ہمارے لیے باعثِ ناز ہے اور اُس کی افادیت ومعنویت آج بھی مسلم ہے۔

☆☆☆

اسکات المعتدی علی انصات المقتدی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ☆

علامہ شبلی کے قلم سے جو پہلی تحریر نکلی وہ عربی زبان میں ''اسکات المعتدی علی انصات المقتدی'' ہے۔(۱) بڑی سائز کے ۲۴صفحات پر مشتمل یہ رسالہ محرم ۱۲۹۸ھ میں محمد عبدالرحمن بن الحاج محمد روشن خاں کے اہتمام میں مطبع نظامی کان پور میں طبع ہو کر شائع ہوا، اس کی طباعت کے اخراجات مصنف کے چچا شیخ مجیب اللہ نے ادا کیے۔(۲)

علامہ شبلی غالی حنفی تھے، اس رسالہ میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، خواہ نماز جہری ہو یا سری، دونوں حالتوں میں مقتدی کو خاموش رہنا ہے، اپنے موقف کی تائید میں علامہ شبلی نے قرآن مجید کی یہ آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا پیش کی ہے اور اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلوب قرآن کا سننا اور خاموش رہنا ہے، قرآن کا سننا تو جہری نمازوں ہی میں ممکن ہے، سری میں نہیں، اور خاموش رہنا دونوں میں ممکن ہے، نیز علامہ شبلی نے اپنے موقف کی تائید میں قدمائے حنفیہ کے تمام دلائل کا بھی احاطہ کیا ہے۔

قرأت فاتحہ خلف الامام کی اصل بحث سے پہلے علامہ شبلی نے سنت رسول کی اہمیت بیان کی ہے، پھر صحابۂ کرامؓ اور فقہائے عظام کی خدمات کا تفصیل سے ذکر بھی کیا ہے۔

اس رسالہ میں علامہ شبلی نے غیر مقلدین کے ساتھ معتدل رویہ رکھنے والے حنفی عالم مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلی پر متن میں قال بعض العلماء لکھ کر اور بین السطور میں ان کا نام لے کر

☆ نزد آواس وکاس کالونی، رحمت نگر، اعظم گڑھ۔

ان کے موقف کی تردید وتنقید کی ہے(۳) مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے موقف پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''ائمہ احناف کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا نہ پڑھنا متفق علیہ نہیں جیسا کہ سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض پڑھنے کے بھی قائل ہیں اور کم از کم یہ کہ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا نہ حرام ہے نہ مکروہ بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شافعیوں کی طرح اس کا پڑھنا ہر حال میں واجب نہیں سمجھتے، آخر میں مولانا عبدالحی صاحب نے اپنی تحقیق یہ ظاہر فرمائی تھی کہ جہری میں امام کے سکتات میں یعنی سورۂ فاتحہ پڑھنے میں جہاں جہاں امام چپ ہو اور سری میں عام طور سے مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے۔(۴)

مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے اپنے یہ خیالات ۱۲۹۴ھ میں اپنی کتاب امام الکلام فی مایتعلق بالقرأۃ خلف الامام میں پیش کئے تھے، علامہ شبلی نے اسی کا اسکات المعتدی میں تعاقب کیا ہے، اسی تعاقب کی وجہ سے اسکات المعتدی خاص طور سے موضوع بحث رہی، اس کے متعدد جوابات لکھے گئے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی تفصیل حیات شبلی میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ، جب مولانا عبدالحی صاحب اور ان کے شاگردوں تک پہنچا تو انھوں نے اس کے جوابات لکھے اور چھپوائے، ان میں سے پہلا جوابی رسالہ مولانا عبدالحی صاحب کے شاگرد مولانا نور محمد صاحب ملتانی نے لکھا اور رسالہ کا نام ''تذکرۃ المنتھی فی رد اسکات المعتدی'' ہے ان ہی کا دوسرا مختصر رسالہ ''الافادات فی رد الاسکات'' ہے اور تیسرا ''التنبیھات علی ھفوات الاسکات'' ہے، چوتھا رسالہ ''الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات'' حافظ ملا، شعیب حنفی کابلی باجوری کا ہے، یہ مجموعہ ۱۲۹۸ھ میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں چھپا، اس کے آخر میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے ایک شاگرد عزیز کی مدحیہ تاریخ ہے گو خود مولانا عبدالحی صاحب نے اس رسالہ کا براہ راست جواب نہیں دیا لیکن چند سال کے بعد انھوں نے اپنے رسالہ ''الکلام'' کو دوبارہ چھپوایا تو غیث الغمام کے نام سے اس پر ایک حاشیہ لکھا جس میں

مجملہ دوسری باتوں کے مولانا سے تعرض کئے بغیر ان کے اعتراضوں کے جوابات دیے ہیں۔"(۵)

علامہ شبلی ان رسائل کے جوابات لکھنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"انشاء اللہ در اندک زمانے از عہدہ ردتذکرہ بدرمی آیم امردمان گویند کہ ایماضات ودر رسالہ دیگر ہم از حافظ صاحب است تا حال بر علم واستعداد حافظ صاحب اعتمادے داشتم اکنوں آں ہم برخاست انشاء اللہ درقریب وقتے بہ غازی پوری رسم وردیں اغلاط وپا لغزہائے مصنف تذکرہ وایماضات ہمہ باز خواہم گفت۔"(۶)

اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے مولانا عبدالحیٔ صاحب سے ملاقات کی تو انھوں نے علمائے احناف کی خانہ جنگی پر افسوس کا اظہار کیا، چنانچہ اس اشارہ کو علامہ شبلی نے اپنے اوپر محمول کیا اور نادم ہوئے (۷) اور غالباً اسی بنا پر اس کی طرف پھر کبھی توجہ نہ دی، حتی کہ دور آخر میں اسے اپنی تصنیفات ہی سے خارج کر دیا۔

اسکات المعتدی سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کو عربی زبان وادب پر بڑا عبور حاصل تھا اور وہ بڑی انشاء پردازانہ زبان استعمال کرتے تھے، البتہ اس کی زبان مسجع اور انداز تحریر متکلمانہ، مناظرانہ اور کسی قدر واعظانہ ہے، اس کی ابتداء میں مصنف نے جو حمد وثنا کی ہے اس سے ان کے انداز نگارش اور عربی زبان پر ان کی دست رس کا اندازہ ہوتا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

"الحمدلله المفيض الوسمى المذلل الامى المسيل الاذى بسطوته وسلطانهٔ رافع العنان باسط الدجان ساق الظمان فى هو اجر الطلب ومعمعانه والصلوٰة فعلى رسوله الهادى صاحب اللهى والايادى احسن من خضب تيامور الاعادى ومهج المعادى شفار القراضب وسنان الهوارى وافضل من امتطأ سنام اليعامل واقتعد غوارب الخوارى وعلى آله واصحابه ولاة الدول كملة الملل هداة السبل ماانهمر السوارى وانسكب الفوادى على بقاع العمران وعراص البوادى۔"

مولانا سید سلیمان ندوی نے اسکات المعتدی کے حوالہ سے علامہ شبلی کی دو خصوصیتوں کا ذکر کیا ہے، ایک منطقیانہ ترتیب اور حسن استدلال کی، دوسرے اس کی ادبیت اور انشا پردازانہ زبان کی، وہ لکھتے ہیں:

''اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جوان (مولانا شبلی) کے فضل و کمال کا طرۂ امتیاز تھیں، موجود ہیں، ایک منطقیانہ ترتیب وحسن استدلال اور دوسری عربی انشاء پردازی، اسی لئے جن لوگوں نے اس کے جواب لکھے، انھوں نے بھی اپنے جوابی رسالوں میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا۔ (۸)

اسکات المعتدی کے مطالعہ سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ابتدائی دور میں عربی زبان میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے، اس رسالہ میں انھوں نے جابجا اشعار نقل کئے ہیں، اس میں خود ان کی صراحت کے مطابق تین اشعار ان کے ہیں۔ جو یہ ہیں:

وهل ذاك الا موعظات ورحمة   ونوری هدی للعالمين مسائله
وقد جاء يهدی للتی هی اقوم   ويغنيك عماكنت دهراً تداوله
لعمرك طل منه يشفی غليهم   فكيف اذا ماجاد للناس وابله

یہ رسالہ اب تقریباً نایاب ہے، باوجود تلاش بسیار کے مطبوعہ نسخہ راقم کی نظر سے اب تک نہیں گذرا، البتہ مطبوعہ نسخہ کی ایک نقل کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے جو ۱۹۴۰ء میں اصل سے نقل کی گئی ہے، اس کے کاتب حافظ سید واجد حسین رام پوری ہیں، آخر میں مشہور محقق امتیاز علی عرشی مرحوم کا ۱۹؍نومبر ۱۹۴۰ء کا یہ نوٹ بھی ہے کہ ''میں نے اور مولوی عبداللہ صاحب نے اس کا اصل سے مقابلہ کرلیا ہے۔'' (۹)

علامہ شبلی کے اس ابتدائی رسالہ نے بڑی شہرت اور مقبولیت پائی اور ملک کی سرحدوں سے نکل کر دوسرے ممالک تک جا پہنچا، اہل علم اور علماء کی نظر میں قابل وقعت ٹھہرا، ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم ومصر وشام کا جو سفر کیا تھا، اس میں بعض علماء نے اس رسالہ کے مصنف کی حیثیت سے ان کی بڑی قدر ومنزلت کی، اس کی تفصیل خود علامہ شبلی کے قلم سے ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں، شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے،

میں بھی اس وقت موجود تھا اور اتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا، انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ اہا، یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا شکر الله مساعیه شیخ ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے، مجھ کو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہ قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کسمپرسی میں اتنا ذریعہ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔ (۱۰)

مقتدی خاں شروانی کا خیال ہے کہ اسکات المعتدی کی وجہ سے علامہ شبلی کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس (ابتدائی) زمانہ کے ایک رسالہ نے جو عربی زبان میں اسکات المعتدی کے نام سے تھا عربی بولنے والے ممالک میں اتنی شہرت حاصل کی تھی کہ جو سالہا سال بعد مولانا نے روم و مصر و شام کا سفر کیا تو وہاں ان کی شہرت اسکات المعتدی کی راہ سے بہت پہلے سے پہنچی ہوئی تھی، وہاں ان کی عزت اہل دنیا میں علی گڑھ اور اہل علم میں اسکات المعتدی کے ذریعہ ہوئی۔ (۱۱)

بہر حال علامہ شبلی کی یہ پہلی تحریر اہل علم اور ارباب دانش کی نظر میں قابل قدر ٹھہری اور ہندوستان سے دمشق تک اس کی پذیرائی ہوئی، ان کی اس یادگار کی حفاظت ضروری ہے۔

حواشی:

(۱) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۲۳۵۔

(۲) ایضاً، ج ۲، ص ۲۵۵۔

(۳) ملاحظہ ہو ''اسکات المعتدی علی انصات المقتدی''

(۴) حیات شبلی، ص ۱۰۵۔

(۵) ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

(۶) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۲۳۸۔

(۷) حیات شبلی، ص ۱۰۷۔

(۸) ایضاً۔

(۹) مخطوطہ اسکات المعتدی علی انصات المقتدی ص ۲۴، کتب خانہ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

(۱۰) سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۳۰، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ایڈیشن ۱۹۹۹ء

(۱۱) محمد مقتدی خاں شروانی، البصیر شبلی نمبر، ص ۱۵۱، اسلامیہ کالج چنیوٹ

☆☆☆

شبلی کی تاریخی بصیرت

اورنگ زیب عالمگیر کے حوالے سے

ڈاکٹر علاء الدین خاں☆

مہدی افادی نے شبلی کو ''تاریخ کا معلم اول'' کہا ہے، بلاشبہ مورخانہ شعور وبصیرت کے لحاظ سے شبلی اپنے زمانے کے اکیلے مورخ ہیں جو فن تاریخ کے بارے میں ٹھوس نظریات رکھتے ہیں، وہ اپنی مشہور کتاب الفاروق کے دیباچے میں باکمال مسلم مورخوں جیسے ابن قتیبہ، واقدی، البلاذری، طبری اور مسعودی کی تعریف تو ضرور کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کی ذہنی تنزلی کا رونا بھی روتے ہیں جو پانچویں صدی کی ابتداء میں ان کے بعد آتے ہیں، وہ ابن خلدون (1322-1406) کے علاوہ سب پر کڑی تنقید کرتے ہیں، شبلی کے مطابق ابن خلدون ہی وہ شخص تھا جس نے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔

علامہ شبلی کے نزدیک تاریخ اصولاً ایک نقلی علم ہے، اس لیے فن تاریخ میں واقعات کی روایت کے لیے مستقل سلسلۂ اسناد کی ضرورت ہے اور اسی خصوصیات کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے فن تاریخ کو یورپ کے فن تاریخ پر ترجیح دیتے ہیں، شبلی تاریخ کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کیے ہیں اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعے کا نام تاریخ ہے۔''(۱)

علامہ شبلی نے تاریخ کے لئے دو تین باتیں لازمی قرار دی ہیں:

☆ شعبۂ تاریخ، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ۔

۱۔ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلم بند کیے جائیں، یعنی تمدن معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔

۲۔ تمام واقعات میں سبب مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

اسی طرح علامہ شبلی نے قدیم تاریخوں کے نقص اور ان کے اسباب بھی بیان کیے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ قدیم تاریخوں میں مذکورہ دونوں باتیں مفقود رہی ہیں۔ رعایا کے اخلاق وعادات اور تمدن ومعاشرت کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں آتا، فرمانروائے وقت کے حالات ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، یہ نقص اسلامی تاریخوں تک محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہ انداز تھا اور ایسا ہونا مقتضاء اسباب تھا، ایشیاء میں ہمیشہ شخصی سلطنتوں کا رواج رہا اور فرمانروائے وقت کی عظمت واقتدار کے آگے تمام چیزیں ہیچ ہوتی تھیں، اسی کا لازمی اثر تھا کہ تاریخ کے صفحات میں شاہی عظمت وجلال کے سوا اور کسی چیز کا ذکر نہ آئے اور چونکہ اس زمانے میں قانون اور قاعدہ بادشاہ کی زبان تھی، اس لیے سلطنت کے اصول اور آئین کا بیان کرنا بھی گویا بے سود تھا۔ (۳)

علامہ شبلی مورخ کا اصلی فرض بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مورخ کو چاہیے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ (۴) مورخ کو اجتہاد اور قیاس سے چارہ نہیں، لیکن اس کا لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس اور اجتہاد کو واقعہ میں اس قدر مخلوط نہ کردے کہ کوئی شخص دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کرسکے۔ (۵)

شبلی کے نزدیک واقعات کی صحت کے لیے صرف راویوں کا ثقہ ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ چند عقلی اصولوں کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً

۱۔ واقعہ مذکورہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں۔

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق۔

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش کی راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے، اس میں اس کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے۔

۵- راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے، وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

۶- اس بات کا اندازہ کہ زمانہ کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں۔(۶)

علامہ شبلی نے واقعات کی درستی کو جانچنے کے دو طریقے بتائے ہیں، روایت اور درایت۔ درایت سے ان کی مراد مختصراً یہ ہے کہ عقل سلیم کی روشنی میں واقعات کو جانچا اور ماخذوں کو پرکھا جائے، وہ اس بات کے حق میں بھی تھے کہ اصول اسباب وعلل کی روشنی میں واقعات کی ترجمانی کرتے وقت قیاس اور اجتہاد سے کام لینا چاہئے اور اسی باعث انھیں یورپی مورخین میں عیب نظر آتے ہیں، زبان اور محاوروں کے بارے میں بھی ان کا یہ خیال ہے کہ زیادہ سادہ ہونی چاہئے، یہی وہ اصول ہیں جو شبلی کے مطابق تاریخ لکھتے وقت پیش نظر رہنا چاہئے لیکن خود ان اصولوں پر پورے نہیں اترے۔

شبلی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، ان کا اصل میدان تصنیف وتالیف تھا، انھوں نے مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے، تاریخ، سوانح، فلسفہ، علم کلام، ادب، سیاست وسیرت بھی کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا، ان کے تصنیفی کارنامے بڑے وقیع اور متنوع ہیں، گو علامہ شبلی جامع کمالات شخص تھے، شبلی اصلاً مورخ اسلام تھے، جس عہد میں علامہ شبلی لکھ رہے ہیں اس میں اردو زبان تاریخی سرمایہ سے بالکل خالی تھی، مغل خاندان سے متعلق چند کتابیں ضرور لکھی گئی تھیں لیکن اور خاندان بالکل گمنامی کی حالت میں تھے، شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فن تاریخ وتذکرہ کی طرف توجہ کی اور اسے معراج کمال تک پہنچایا۔

شبلی نے تاریخ نویسی میں اسلامی تاریخ کو بہت اہمیت دی اور شاہی خاندانوں کا انتخاب کیا مگر اس میں بھی صرف برگزیدہ اصحاب کا، چنانچہ المامون کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "اسلام میں آج تک خلافت وسلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے ان میں سے صرف دو نامور انتخاب کر لیے جائیں جو اپنے طبقے میں عظمت وحکومت کے اعتبار سے اپنا ہمسر نہ رکھتے ہوں۔"(۷)

علامہ شبلی نے علمی سلسلے کی طرف توجہ کی اور فقہ کا انتخاب کیا اور سیرۃ النعمان لکھی، سیرۃ النعمان کے دیباچے میں لکھا ہے:

''چند روز کے لیے خاندانی حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلے کی طرف توجہ کرنی پڑی، فقہ، حدیث ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی اور مختلف خاندان سامنے تھے، بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی اور امام ابوحنیفہ کو جو فقہ کے بانی ہیں اس کا ہیرو قرار دیا۔'' (۸)

الفاروق اور اس کے بعد جن لوگوں کے حالات لکھے ہیں سب کے سب علمی سلسلے سے متعلق ہیں، شبلی نے جو بھی سوانح اور تاریخ کی کتابیں لکھیں وہ مکمل اور عمدہ ہیں، شبلی سے پہلے تاریخ کی کتابیں تحقیق سے بالکل عاری اور فن کے لحاظ سے بالکل ناقص تھیں، شبلی نے اس میں لطافت اور دلچسپی پیدا کی۔

شبلی دنیائے اسلام کو اپنا وطن اور اس کی تاریخ کو اپنی قومی تاریخ سمجھتے تھے، المامون کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ حکومت کے کارنامے بڑی آب وتاب سے دکھائے گئے، لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے۔'' (۹)

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان سے باہر اسلام اور اس کے کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا، ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ان کے چند مضامین مثلاً گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی، زیب النساء، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر اور مشہور رسالہ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر۔ یہی وہ سرمایہ ہے جو انھوں نے ہندوستان سے متعلق لکھا اور میرے مقالے کا موضوع بھی یہی مشہور رسالہ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ہے۔

اورنگ زیب (۱۷۰۷ء–۱۶۵۸ء) مغل حکمرانوں میں سب سے زیادہ غلط اور گمراہ کن افواہوں کا شکار رہا، اس پر مذہب پرست اور کٹر مسلمان ہونے کے الزامات لگائے گئے ہیں، مزید کہا گیا کہ اس نے ہندوؤں کے علوم وفنون کو منتشر کیا، ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا، ان کے میلوں

اور تہواروں پر پابندی عائد کردی، انھیں ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی، ان کو حکومت کی ملازمتوں سے محروم کردیا، شیواجی کا شایان شان استقبال کیا، ہندوؤں کو مغل سلطنت کا دشمن بنا کر سلطنت کے زوال کی راہ ہموار کی۔ اس پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے ہندوؤں پر کبھی بھروسہ نہیں کیا اور اہم عہدوں پر صرف مسلمانوں کا تقرر کیا، اس کے عہد میں سب سے زیادہ ہندو مارے گئے، ہندوؤں کو لوٹا گیا اور بہت سے مندروں کو مسمار کر کے وہاں مسجدیں تعمیر کی گئیں، ہندوؤں پر اس نے جزیہ لگایا اور نہ دینے والے جبراً مسلمان بنائے گئے، اس نے بھائیوں کو قتل کرایا، باپ کو قید کیا، دکن کی مسلم ریاستوں پر حملہ کیا، مرہٹوں کو چھیڑ کر مغل سلطنت کے زوال کے لیے راہ ہموار کی مگر کیا وہ حقیقت میں ایسا تھا، یا نہیں؟ اسی کا مدلل اور موثر جواب دینے کی کوشش علامہ شبلی نے مضامین عالمگیر میں کی ہے جو الندوہ لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء تک قسط وار شائع ہوئے، اس مضمون میں شبلی نے ایک مورخ کی تمام ذمے داریوں کو نبھانے کی پوری کوشش کی ہے۔

"اس مضمون میں انھوں نے نہایت ہی محققانہ اور ناقدانہ انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ اورنگ عالمگیر نے، مرہٹوں، ہندوؤں، راجپوتوں اور دکن کی ریاستوں اور پھر اپنے بھائیوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا۔ وہ کوئی بھی حکمراں ہوتا تو یہی سب کچھ کرتا۔" (۱۰)

شبلی کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا اور انگریز مصنفین نیز ان کے مقلدین نے اس عظیم بادشاہ کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے، اس مضمون کے لکھنے کی تحریک سید سلیمان ندوی کے بقول:

"شبلی اپنے بمبئی کے سفر کے دوران بڑودہ گئے تھے، محمد علی مرحوم (اڈیٹر کامریڈ) جو شبلی کے علی گڑھ کے شاگرد بھی تھے، اس زمانے میں بڑودہ میں نوکر تھے، ان کے اصرار پر وہ بڑودہ گئے اور ان ہی کے مکان پر قیام کیا اسی زمانۂ قیام میں انھوں نے مولانا سے یہ تحریک کی کہ وہ عالمگیر کے الزامات کی تحقیق وجواب میں مفصل مضمون لکھیں مولانا نے اس کو منظور کیا، چنانچہ اس سلسلے کا پہلا نمبر ۵ر دسمبر ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا اور اسی مہینے کے الندوہ میں شائع ہوا، سوا سو برس کے بعد ۶ نمبروں میں مارچ ۱۹۰۸ء میں یہ سلسلہ ختم ہوا اور مقبول ہوا۔" (۱۱)

شبلی نے اس مضمون میں انگریز مصنفین الفنسٹن اور لین پول پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں، اس لیے کہ اس زمانے میں اتحاد اسلامی (پین اسلامزم) سے متعلق شبلی کا خیال پختہ ہو چکا تھا اور اس کی وجہ سے وہ انگریزی سامراج اور انگریزوں کے سخت مخالف تھے، علی گڑھ تحریک سے بھی ان کے اختلاف بڑھ گئے تھے، مزید برآں وہ اس وقت ایسی کوئی بات نہیں لکھنا چاہتے تھے جس سے قومی اختلافات میں اضافہ ہو۔

اورنگ زیب پر جو الزامات ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے، اسی طویل فہرست میں سے ایک الزام یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مندر مسمار کیے، شبلی لکھتے ہیں کہ:

> ''اسی خاندان میں عادل بادشاہ شاہجہاں پر قریب یہی فرد قرارداد جرم قائم ہو سکتی ہے یا نہیں، باپ سے بغاوت کی، بھائیوں اور بھتیجوں کو قتل کرایا، دکن کی اسلامی ریاست مٹادی، ایک سال کے اندر ۶۵ بت خانے منہدم کرادیے اور ہمیشہ اس پر فخر کرتا رہا۔ یہ مسئلہ غور کے قابل ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شاہ جہاں کے الزامات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں اور عالم گیر کے وہی الزامات افسانہ بزم و انجمن ہیں۔ اس عقدے کا حل کرنا اگرچہ ایک تاریخی فرض ہے لیکن اس سے ایک قومی تفریق کو تحریک ہوتی ہے۔'' (۱۳)

شبلی کے اس رسالے کا موضوع عہد اورنگ زیب کی مفصل تاریخ نہیں بلکہ ان اعتراضات کا جائزہ ہے جو اورنگ زیب پر لگائے گئے، شبلی نے اپنے اس رسالے ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' میں چند متنازع فیہ مسئلوں اور واقعات کو جانچا ہے اور دلیلوں و مستند تاریخی حوالوں سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ناروا داری اور عہد شکنی کے جو الزامات اورنگ زیب کے خلاف لگائے جاتے ہیں وہ بے بنیاد ہیں، ان کا کوئی جواز نہیں شیعہ اور انگریز مورخین نے جان بوجھ کر واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔

شبلی کے سامنے مورخین اور سیاحوں کے بیانات اور تحریریں تھیں اور ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر انھیں یہ بھی علم تھا کہ ان مورخین نے کن اسباب کی بنا پر اورنگ زیب پر ایسے سنگین الزامات لگائے تھے، شبلی کے مطالعے میں تاریخ فرشتہ، منتخب اللباب، عالمگیر نامہ، خزانہ عامرہ، شاہجہاں نامہ، مرآۃ الخیال، جیسی کتابیں اور ہم عصر مورخ، یورپین مورخ لین پول، الفنسٹن سیاحوں میں

فرائز اور برنیر تھے۔

شبلی نے اورنگ زیب یا اس کے عہد کی کوئی مربوط تاریخ ترتیب نہ دے کر محض الزامات کا جائزہ لیا ہے، متعصب مورخ نے اورنگ زیب پر کذب وافتراء کا جو طومار باندھا تھا اور اصل واقعات میں جو رنگ آمیزی کی تھی شبلی نے اسی کی تحلیل وتنقید کرکے دروغ بیانیوں کا جواب دیا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

اعتراف

شبلی نے اپنے رسالے میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے عہد کی یا خود اس کی شخصی تاریخ لکھ رہے ہیں بلکہ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اورنگ زیب پر لگائے ہوئے الزامات کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں اور ان الزامات کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں ان کو قاری کے سامنے رکھ کر اس سے اس انصاف کی امید کرتے ہیں کہ وہ تاریخی شواہد کی روشنی میں الزامات کی حقیقت یا عدم حقیقت کا قائل ہو۔

کتاب کا پہلا باب اورنگ زیب عالمگیر اور دکن کے نام سے ہے، اس میں شبلی لکھتے ہیں کہ عالمگیر کی فرد قرارداد جرم میں سب سے بڑا واقعہ حیدرآباد کا ہے۔

۱- ریاست حیدرآباد ایک شیعہ ریاست تھی، اس لیے اس کی بربادی کے مقصد میں عالمگیر کا سخت مذہبی تعصب ثابت ہوتا ہے۔

۲- حیدرآباد کے مٹنے سے مرہٹوں کو قوت ہوگئی اس لیے یہ سیاسی جرم بھی ہے۔(۱۳)

شبلی نے تاریخی ثبوت سے اس کا مدلل جواب دیا ہے، اس کے بعد مرہٹے، ہندوؤں کی ناراضگی ہندوؤں کی ناراضی کے اسباب اور باپ بھائیوں کے معاملات پر الگ الگ باب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے، آخر میں اورنگ زیب کے انتظام سلطنت، ملکی اصلاحات، ٹیکسوں کی موقوفی، قانونِ مال گزاری اور بندوبست آراضی، عدل وانصاف اور تعلیمات وغیرہ جیسے امور سے بحث کرتے ہوئے اس کے ان محاسن کا بھی ذکر کیا ہے جس سے اس کے ذاتی کردار، شجاعت اور بہادری، مذہبی امور سے دلچسپی اور دیگر اصلاحات پر روشنی پڑتی ہے۔

شبلی نے اورنگ زیب کے ذاتی محاسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عالمگیر تیغ وقلم دونوں کا مالک تھا، اس کی انشاء پردازی کی داد مخالفوں تک نے دی ہے، وہ نہایت سنجیدہ اور متین تھا، کبھی نامناسب لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، نہایت رحیم اور وسیع الظرف تھا، اہل کمال کا نہایت قدر دان تھا، لوگوں سے نہایت اخلاق سے پیش آتا تھا، نہایت خشک زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لہو ولعب کی باتوں سے قطعاً محترز تھا۔'' (۱۴)

شبلی ان خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں:

''باوجود ان تمام خوبیوں کے عالمگیر میں یہ بڑا عیب تھا کہ وہ اپنی ذاتی شجاعت اور استقلال کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اسی وجہ سے وہ کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکا۔'' (۱۵)

شبلی نے اورنگ زیب سے ہندوؤں کے تعلقات اور ان کے ساتھ برتاؤ کو پوری تفصیل سے لکھا ہے، ہندوؤں کی ناراضی اور ان کی عام ناراضی کے اسباب کے عنوان سے دو باب لکھے ہیں، ان دو ابواب میں انھوں نے نہ صرف اورنگ زیب کے احکامات، فرامین اور اصلاحات کا ذکر کیا ہے بلکہ اکبر اور شاہجہاں کے عہد کے ہندو مسلم تعلقات، جاگیردارانہ نظام، منصب داری نظام وغیرہ کا تفصیلی ذکر کر کے اورنگ زیب کے عہد سے اس کا مقابلہ کیا ہے اور تمام الزامات کی بشمول بت شکنی کے تردید کی ہے۔

یورپین اور متعصب مورخین نے اورنگ زیب پر الزامات لگایا ہے کہ اس نے بڑے عہدوں سے ہندوؤں کو برطرف کر دیا، شبلی نے ہندو افسران، جاگیرداروں اور منصب داروں کی ایک تفصیلی فہرست کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ یورپین مورخین اور سیاحوں کا یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے، شبلی نے ہندو عہدیداروں کے جو نام دیے ہیں ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں:

عہدیدار	ولایت	سند تقرر یا اضافہ عہدہ یا عطائے منصب
راجہ بھیم سنگھ	راج سنگھ مہارانا اودے پور کا بیٹا اور مہارانہ جے	سنہ ۳۱ جلوس عالم گیری میں دکن سے آیا اور برہان پور کی مہم میں شریک ہوا، سنہ ۳۸ جلوس

	سنگھ کا بھائی تھا۔	میں پنج ہزاری کے منصب تک پہنچ کر مر گیا۔
اندر سنگھ	جے سنگھ مہارانا اودے	سنہ ۴۸ میں سہ ہزاری پر اضافہ ہوا۔
بہادر سنگھ	جے سنگھ مہارانا اودے سنگھ کا بھائی تھا۔	۴۳ء میں یک ہزار و پانصدی ہوا
اچلاجی	شیواجی کا داماد تھا	۲۹ جلوس میں پنج ہزاری منصب اور علم ونقارہ وغیرہ ملا
سروپ سنگھ	راجہ اودت سنگھ	۴۱ جلوس میں یک ہزاری منصب پر ترقی ہوئی۔
درگاداس راٹھور		۲۹ جلوس میں سہ ہزاری کا منصب ملا۔
کشورداس	منوہرداس گور	۲۶ جلوس میں شولاپور کا قلعہ دار تھا۔ (۱۶)

جزیہ

اورنگ زیب پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو ذلیل کرنے کے لئے جزیہ نافذ کیا، اس پر شبلی کا کہنا ہے کہ یہ الزام اس لیے قائم کیا جاتا ہے کہ لوگ جزیے کی حقیقت سے واقف نہیں (۱۷) شبلی نے جزیے کی حقیقت کو جس طرح سمجھایا ہے اگر اسی طرح آج کے مورخین سمجھاتے رہتے تو یہ ٹیکس اشتعال انگیز نہ سمجھا جاتا شبلی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''اسلام نے جو انتظام قائم کیا اس کی رو سے ہر مسلمان خدمت کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں ان کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی ہے، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہیں ہے نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات کے لیے راضی ہو سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی محافظت کے لئے معاوضہ دیں، اسی معاوضے کا نام جزیہ رکھا گیا، اگر وہ فوج میں شرکت چاہیں تو وہ جزیے سے بری کر دیے جائیں۔'' (۱۸)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ مسلم حکومت کی جانب سے غیر مسلموں پر لادا جانے والا بھاری بوجھ نہیں بلکہ ایک معمولی سا ٹیکس ہے جو انہیں فوجی خدمت سے الگ رکھنے اور جانی و مالی تحفظ فراہم کرنے کے عوض میں عائد کیا جاتا ہے، غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ثابت کرنے

کے لیے اسلام کے قانون جزیہ کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے اور اسے ان پر ایک زبردست مالی بوجھ اور ذلت کی نشانی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ (۱۹)

شبلی نے جہاں جزیہ کی افادیت بیان کی ہے وہیں انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اورنگ زیب کے ذریعہ جزیہ نافذ کرنے سے ہندوؤں کو شکایت ہوئی، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ محصول ایک مدت سے موقوف ہو چکا تھا، اس کا نئے سرے سے قائم کیا جانا کیونکر گوارا ہو سکتا تھا۔ (۲۰)

شیواجی کا استقبال

متعصب مورخین کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ اورنگ زیب نے شیواجی کا شایان شان استقبال نہیں کیا، اگر دربار میں عزت ملی ہوتی تو بعید نہیں کہ وہ اورنگ زیب کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا، شبلی بڑے مورخ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ متکلم بھی ہیں، اس لیے ان الزامات کی تردید میں وہ اپنے اسلامی جوش کو نہیں چھپا سکے اور ان کی تحریر سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ ایک غیور مسلمان ہیں جو اس قسم کے بے جا اتہامات اور حملوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔

''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' میں جس موقع پر اس کی تردید کی ہے کہ عالمگیر نے شیواجی کے ساتھ جیسا کہ متعصب مورخین کا خیال ہے، اچھا سلوک نہیں کیا، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اعزاز کو نہایت مناسب طریقے پر قائم رکھا، شبلی لکھتے ہیں:

> ''شیواجی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا؟ شاہی فوجوں نے اس کے تمام علاقے فتح کر لیے تھے، وہ قلعے میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا، اس کے خاص صدر نشیں قلعے کے برجوں پر شاہی فوج کا پھریرا اڑ چکا تھا، ان مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا اور دربار میں روانہ کیا گیا تاہم اس کے استقبال کے لیے اورنگ زیب عالمگیر نے دربار میں سب سے زیادہ جو شخص موزوں ہو سکتا تھا اس کو بھیجا، پنج ہزاری امراء کی صف میں جو خود راجہ جے سنگھ کا منصب تھا، اس کو جگہ دی، اس سے زیادہ اور کیا چاہتا تھا؟ کیا شہنشاہ ہند ایک مفتوح رہزن کے لیے تخت سے اتر آتا، بے شبہ یورپ اس قسم کی جھوٹی اور مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کرتا ہے لیکن اسلام سے اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔'' (۲۱)

یہاں علامہ شبلی نے اصل واقعہ یعنی شیواجی کے استقبال کا ذکر کرنے کے بعد استنباط نتائج میں اسلام کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مراد

علامہ شبلی نے مراد کی گرفتاری اور پھر اس کی موت پر بھی بحث کی ہے، لکھتے ہیں:

''دراصل واقعہ یہ ہے کہ مراد گو نہایت دلیر، بہادر اور جانباز تھا لیکن اس کے ساتھ نہایت سادہ لوح اور آسانی سے لوگوں کے دام میں آجاتا تھا، داراشکوہ پر جب اس کو فتح حاصل ہوچکی تو اب اس کو لوگوں کے بہکانے سے یہ خیال آیا کہ یہ معرکے میں نے سر کئے ہیں، میں ہی تنہا تخت سلطنت کا حقدار ہوں۔ اس خیال سے اس نے عالمگیر سے علاحدگی اختیار کی اور عالمگیر کے بڑے بڑے امراء کو بھاری تنخواہوں اور انعاموں کی طمع دلا کر توڑنا شروع کیا، چنانچہ بیس ہزار فوج اس کے رکاب میں جمع ہوگئی اور روز بروز عالمگیر کی فوج گھٹتی جارہی تھی، مجبوراً عالمگیر کو اس کا بندوبست کرنا پڑا۔'' (۴۲)

اورنگ زیب نے مراد کے ساتھ جو سلوک کیا، اسے شبلی نعمانی بھی درست نہیں سمجھتے، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''گو مراد سے علانیہ جنگ کرنے میں ہزاروں کا خون ہوتا لیکن اگر عالمگیر اور خوں ریزیوں کی طرح اس کو بھی گوارا کرتا اور مراد پر تدبیر سے نہیں بلکہ شمشیر سے قابو پاتا تو ہم اس کی مردانہ روش کی زیادہ داد دیتے، لیکن سچ یہ ہے کہ عالمگیر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خلیفہ منصور عباسی سے جس نے ابو مسلم اصفہانی بانی دولت عباسیہ کو دھوکے سے قتل کرادیا تھا، زیادہ مدح کا مستحق ہے۔'' (۴۳)

مندروں کا انہدام

اورنگ زیب پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے بہت سے مندر مسمار کئے اور قدیم مندروں کی مرمت اور جدید مندروں کی تعمیر پر پابندی عائد کی، علامہ شبلی نے اس الزام کا جائزہ لیا ہے اور تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف انھیں مندروں کو مسمار کیا جہاں حکومت کے خلاف حرکات وسکنات پائی جاتی تھیں اور سازشیں رچی جاتی تھیں۔

شبلی لکھتے ہیں:

"جس قدر بت خانے توڑے گئے انھیں مقامات کے توڑے گئے جہاں پُر زور بغاوتیں برپا ہوئیں، اورنگ زیب عالمگیر ۲۵ برس تک دکن میں رہا، ان ممالک میں ہزاروں بت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانے کو ہاتھ بھی لگایا ہو، الور کے مشہور مندر میں سیکڑوں تصویریں اور بت ہیں، عالمگیر اسی نواح میں میل دو میل کے فاصلے پر مدفون ہے، بڑے بڑے بزرگان دین کا یہاں پر مزار ہے جو عالمگیر سے بہت پہلے گزرے ہیں لیکن یہ بت اور تصویریں آج بھی موجود ہیں۔" (۲۴)

عہد اورنگ زیب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب حکومت کے خلاف سازش کو برداشت نہیں کرتا تھا، سازش جہاں ہوتی تھی اسے ختم کرنے اور ان مقامات کو مسمار کرنے میں کسی طرح کی مذہبی جانبداری سے کام نہیں لیتا تھا، اسی لیے عہد حاضر کے مورخین کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف مندر ہی نہیں توڑے بلکہ گولکنڈہ کی جامع مسجد کو منہدم کرنے کا صرف اس لیے حکم دیا کہ وہاں حکومت کے خلاف حرکات وسکنات پائی جاتی تھیں۔

یورپین اور ہندو مورخ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے چونکہ بت خانے گرائے اس لیے بغاوت ہوئی شبلی لکھتے ہیں کہ بغاوت ہوئی اس لیے بت خانے گرائے گئے۔ (۲۵)

اورنگ زیب نے اپنے عہد میں میلوں ٹھیلوں پر پابندی عائد کردی اور محرم کے جلوس کو لے کر ۱۰۷۹ ہجری میں برہان پور میں جو ہنگامہ ہوا، اس کی وجہ سے تعزیہ کے گشت پر روک لگادی، اورنگ زیب کے اس عمل میں مورخین کو مذہبی تعصب نظر آتا ہے، شبلی نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ عالمگیر کا یہ عمل مذہبی تعصب کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس سے نقض امن کا خطرہ تھا، اس میں عالمگیر کے مزاج کا دخل بھی ہوسکتا ہے، اس لیے کہ وہ نہایت روکھا پھیکا آدمی تھا، اس کو میلوں ٹھیلوں، ناچ رنگ، گانے بجانے، شراب کباب اور تمام ظاہری نمائش وتکلفات سے نفرت تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ ان چیزوں سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ (۲۶) شبلی کا کہنا ہے کہ اس طرح کے امور میں پابندی پر مذہبی تعصب کا قطعاً دخل نہیں تھا بلکہ انتظامیہ کو چست درست رکھنا اہم مقصد تھا۔

شبلی تمام اعتراضات کا جواب دینے کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں کہ جو تصویر اس کے مخالفوں نے کھینچی ہے، اس میں تو تمام تعصب اور عداوت کا رنگ بھرا گیا ہے، لیکن یہ کہنا بھی بالکل مبالغہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھا، باوجود ان تمام خوبیوں کے جو اس میں تھیں، ہم تیمور بادشاہوں کی فہرست میں اس کو وہی درجہ دے سکتے ہیں جو اسے ترتیب شمار کی رو سے حاصل تھا، تاہم عام اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص بھی پیدا نہیں ہوا۔

شبلی کی کتاب ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ باجود اس کوشش کے کہ معروضیت کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، وہ بالکل غیر جانب دار نہیں رہ سکے، شبلی کے اسلوب نگارش اور دلیلوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کی مذہبیت، حکومت کے کاروبار میں مذہبی اصولوں پر اس کے عمل اور داراشکوہ کے مذہبی خیالات سے اس کی ناپسندیدگی کی تائید میں ہیں پھر بھی بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کی یہ کتاب آج کے مورخین کے لئے ایک اہم ماخذ ہے اور اورنگ زیب سے متعلق لکھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مراجع

(۱) شبلی نعمانی الفاروق دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء ص ۹۔

(۲) ایضاً ص ۱۰-۹

(۳) ایضاً ص ۱۰

(۴) ایضاً ص ۱۸

(۵) ایضاً ص ۱۹

(۶) ایضاً ص ۱۵-۱۴

(۷) شبلی نعمانی دیباچہ المامون مطبع مفید عام آگرہ ص ۵

(۸) دیباچہ سیرۃ النعمان۔

(۹) شبلی نعمانی المامون قومی پریس لکھنؤ ص ۲

(۱۰) سید صباح الدین عبدالرحمٰن مولانا شبلی پر ایک نظر دار المصنفین، اعظم گڑھ ص ۸۷۔
(۱۱) سید سلیمان ندوی حیات شبلی دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۹، ص ۴۵۴۔
(۱۲) شبلی نعمانی ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۹، ص ۳-۲
(۱۳) ایضاً ص ۴
(۱۴) ایضاً ص ۱۲۶-۱۲۴۔
(۱۵) ایضاً ص ۱۲۶
(۱۶) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۶-۶۵۔
(۱۷) ایضاً ص ۶۷
(۱۸) سید صباح الدین عبدالرحمٰن مسلمانوں کی مذہبی رواداری، جلد ۱، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۸۹، ص ۱۰۲-۱۰۱۔
(۱۹) ڈاکٹر ظفر الاسلام، اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ عہد فیروز شاہی میں، ۱۹۹۸، علی گڑھ، ص ۹۴
(۲۰) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۶۷
(۲۱) ایضاً ص ۲۸-۲۷
(۲۲) ایضاً ص ۹۵
(۲۳) ایضاً ص ۹۶
(۲۴) ایضاً ص ۷۳
(۲۵) ایضاً ص ۷۳
(۲۶) ایضاً ص ۶۷

☆☆☆

علامہ شبلی نعمانی کے سیاسی افکار ونظریات

ڈاکٹر محی الدین آزاد اصلاحی☆

ہندوستان عہد مغلیہ میں اپنے حکمرانوں کی کوتاہ اندیشی، سیاسی بصیرت کی کمی، آپسی جنگ وجدال، رعایا کے غیر اطمینان بخش معاشی واقتصادی حالات اور ذہنی انتشار کی وجہ سے اس اندھیرے راستے پر گامزن تھا جہاں سے بڑی کوششوں کے باوجود واپسی ناممکن نظر آتی تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاجروں کے بھیس میں آئی ہوئی برطانوی سامراجی طاقتیں رفتہ رفتہ یہاں اپنے قدم جمانے لگیں اور ان کی منظم تدبیروں وریشہ دوانیوں کی وجہ سے اس ملک پر ان کا جزوی سامراج قائم ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء تک مغلیہ حکومت برائے نام باقی رہی، یہ تاریخی سال جس کو انگریز غدر اور ہم جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ہندوستان کے صوبۂ یوپی کے مشرقی حصے کے ضلع اعظم گڑھ جو قدیم زمانے سے مردم خیز رہا ہے، اس کے ایک گاؤں بندول میں عین اس دن جس دن مجاہدین آزادی نے اعظم گڑھ جیل کا پھاٹک توڑ دیا تھا علامہ شبلی نعمانی (۳/جون ۱۸۵۷ء، ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء) جیسی عظیم سیاسی مفکر، مدبر مصلح، شاعر، ادیب، کثیر الجہات اور جامع کمالات شخصیت جس کو عہد جدید کا معلم ہونے کا شرف حاصل ہے، پیدا ہوئی بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

> ''جس نے مسلمانوں کی زوال پذیر زندگی کو نشأۃ ثانیہ عطا کیا جس نے اسلامی علوم وفنون اور تاریخ وتمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے پیش کیا اور جس نے اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علماء کا ایسا گروہ پیدا کیا جو اس نئے زمانے میں اسلام کی نئی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔''(۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

☆ شعبۂ عربی، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔

''مولانا شبلی قدیم و جدید کے ایسے سنگم تھے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے، مرج البحرین یلتقیان۔ وہ ہمارے قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آرا و خیالات سے واقف بھی تھے، ساتھ ہی محقق بھی تھے، مؤرخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، شاعر بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے، اور نئے زمانے کے تقاضے اور مطالبے کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے۔'' (۲)

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی وہ فارسی و عربی زبانوں کے عالم اور سوانح نگاری کے جدید طرز کے بانی، علوم مشرقیہ کے بحرِ بے کراں تھے، متعدد مذہبی اور اخلاقی، سیاسی و قومی نظموں، تقریروں اور مضامین کے ذریعہ اپنے عہد کے مسلمانوں کو آئینہ دکھانے اور ان کی رہنمائی کرنے والی شخصیات میں ان کا شمار ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے جدید سیاسی تصورات کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تا کہ معاشرہ مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے کا اہل ہو سکے، انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی و سماجی فکر و شعور اور مذہبی زندگی میں اہم رول ادا کیا، عہد جوانی سے قوم وملت کی خدمت کا جذبہ ہمیشہ دامن گیر رہا، ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر نظر رکھی اور ہر مسئلے پر اپنی ایک الگ سوچی سمجھی رائے کا اظہار کیا مسلمانوں کے سیاسی مسائل پر مفکرانہ غور و فکر کے ساتھ ان کی زوال پذیر زندگی کو سدھارنے اور راہ راست پر لگانے کی کوشش کی اور اپنی پوری زندگی اسلام کی سربلندی ملت کی دردمندی، قوم اور وطن کی خیر خواہی و فلاح میں صرف کر دی، وہ عملاً سیاسی نہ تھے مگر اپنے خیالات اور فکر و شعور میں بھرپور سیاسی ملکہ رکھتے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی جس زمانے میں تعلیم سے فارغ ہوئے دنیائے اسلام میں ایک نئی تحریک پھیل رہی تھی وہ اتحاد اسلامی کی تحریک تھی اس کے داعی سید جمال الدین افغانی تھے جو آخری عمر میں قسطنطنیہ میں قیام پذیر رہے۔ (۳) جو ترکی حکومت کا دارالسلطنت اور اسلامی دور حکومت کا مرکز تھا، ترکوں سے علامہ شبلی نعمانی کو حد درجہ محبت تھی کیوں کہ اس زمانے میں آزاد مسلمان ملکوں میں ترکی واحد طاقتور ملک تھا، ساری دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردانہ نگاہیں اس کی طرف اٹھتی تھیں اگرچہ اسلامی مملکت اور شرعی خلافت کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا تھا پھر بھی ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے

وہ ایک بہت بڑا سہارا تھی، علامہ شبلیؒ کے نزدیک صرف ترکی ہی وہ سلطنت تھی جس کے پیکر میں ان کو اسلام کی شان وشکوہ کا جلوہ نظر آتا تھا۔ (۴) وہ اس کو اتحاد اسلامی کا گہوارہ شمار کرتے تھے، علی گڑھ جانے سے پہلے عین جوانی ۱۸۷۶ تا ۱۸۷۸ء میں روم وروس کی جنگ چھڑ گئی اس لڑائی میں ساری اسلامی دنیا ترکوں کے دوش بدوش کھڑی تھی اور جوش وہمدردی اپنے شباب پر تھی، ہندوستان میں بھی سلطان ترکی کی حمایت میں زور شور سے تقریر وتحریر کے ذریعہ لوگ اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے، ان کی مدد کے لئے چندہ جمع کیا جارہا تھا، اپنے ہم عصر علماء کی طرح علامہ ان حالات سے بے خبر نہ تھے، ان حالات نے ان کے اندر چھپی قومی وملی فکر کی آگ کو اور بھڑکا دیا اور بڑی لگن اور تندہی کے ساتھ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کے لئے ایک انجمن قائم کی جس کے وہ سکریٹری تھے۔ (۵) اپنے شہر اعظم گڑھ سے ترکوں کے لئے کئی ہزار روپے چندہ جمع کیا اور ترکی سفیر حسین حبیب آفندی (۶) مقیم بمبئی کی معرفت قسطنطنیہ روانہ کیا (۷) اس طرح اپنے قومی درد کا پہلا ثبوت دیا۔

اس عہد میں ترکوں یا خلافت کا نام لینا برطانوی حکومت کے نزدیک سیاسی نقطۂ نظر سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا تھا، علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے ملکی اور ملی افکار سے محبت اور برطانوی حکومت سے نفرت کی وجہ سے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ (۸) ترکی کے سفرنامے کی ترتیب میں صرف ان کا علمی اور تعلیمی مقصد ہی پیش نظر نہیں تھا بلکہ اس کے پس پشت مختلف قسم کے محرکات وعوامل تھے جن کو ہم علمی، تعلیمی اور سیاسی شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان تینوں شعبوں نے ان کی آنے والی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے، وہ اتحاد اسلامی کے پہلے سفیر تھے، علماء اور رہنمایان قوم میں سب سے پہلے انھوں نے اسلامی ممالک کا سفر کیا اور سلطان ترکی سے اعزاز کا تمغہ پایا۔ (۹) اس سفر کے بعد سیاسی طور پر انگریزوں سے ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کے نزدیک ان کا یہ جرم ناقابل معافی تھا، ان پر سلطان ترکی کا ایلچی ہونے کا الزام لگایا گیا اور ان کے پیچھے خفیہ پولس لگائی گئی۔ (۱۰) اس طرح جب اس زمانے میں خلافت عثمانی اور اتحاد اسلامی سے ڈرا جاتا تھا اس وقت ہندوستانی مبلغ کی حیثیت سے ان کی ایک الگ پہچان بن گئی اور ترک ان کی محبت اور عقیدت کا مرکز بن گئے سلطان معظم کو ان الفاظ میں یاد کیا:

''تازگی بدر وحنین از تو ہست ☆ زیب وطراز حرمین از تو ہست

جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ ☆ آں کہ بود شرع نبی راہ پناہ

فرہ دین نبوی از تو ہست ☆ بازوے اسلام قوی از تو ہست (۱۱)

علامہ شبلی نعمانی ہندوستان اور بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ وہ اس کے نباض بھی تھے، انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک قیمتی لمحہ علمی، قومی وملی کاموں کے لئے وقف کردیا تھا، ان کی یہ ذمہ داریاں انہیں وقت نہیں دیتی تھیں کہ وہ عملی سیاست کے میدان میں اپنے جوہر دکھائیں لیکن اسلامی ممالک اور ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات سے بے تعلق بھی نہ تھے، ان کے جیسا حساس شخص یہ کیسے گوارہ کرسکتا تھا، علی گڑھ کالج سے وابستہ ہونے کے باوجود انھوں نے سرسیدؒ کی سیاسی حکمت عملی کی مخالفت کی اور ان کی مرضی کے برخلاف ملکی اور غیر ملکی سیاست میں حصہ لیا، وہ اپنی رائے وارادے میں ہمیشہ مکمل آزادی پسند تھے، چنانچہ سیاسی امور میں سرسیدؒ سے اختلاف کے باوجود ان کی عظمت اور عزت کا دل کے ساتھ اعتراف کیا اور ان میں کبھی کمی نہیں آنے دی اور برابر مضامین اور منظومات کے ذریعہ اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ۹۴-۱۸۹۵ء میں آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلے میں یورپ کا ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بیانی کرکے دنیا کی نگاہوں میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا اور ہندوستان کے اخبار وجرائد میں اس کے مضامین کی نقلیں چھپ رہی تھیں تو ان کی قوت برداشت نے جواب دیدیا اور انھوں نے مسئلہ آرمینیا پر ایک مبسوط اور مسکت مقالہ ۲ر فروری ۱۸۹۶ء کو آزاد اخبار لکھنؤ میں لکھا جس میں ترکوں کے خلاف الزامات کی پرزور تردید کی اور حقیقت کا پردہ چاک کیا (۱۲) اور دنیا کے سامنے صحیح صورت حال کو پیش کیا انھوں نے ترکوں پر انگریزوں کے مظالم کی سخت مذمت کی وہاں عیسائیوں کو دی جانے والی مراعات کی تفصیلات کے ساتھ انگریزی اخبارات وجرائد کی غیر جانب داری کی طرف اشارہ کیا اور اس کی سخت الفاظ میں تنقید کی، یہ ان کی قوت ایمانی تھی کہ انھوں نے حکومت وقت کے عتاب کی نہ پرواہ کی اور نہ ڈرے گو کہ وہ علی گڑھ میں سرسیدؒ کے ساتھ تھے، قیام علی گڑھ کے دوران ہی ۱۸۹۷ء میں روم ویونان کی جنگ پیش آئی تو انھوں نے اپنے جذبات کو مصلحتاً قابو میں رکھا عربی اخبار وجرائد میں جو کچھ پڑھتے اپنی ذاتی مجلسوں میں ترکوں کے فضائل ومناقب اور بہادروں کی داستانوں اور اسلامی حمیت کو بیان کرتے

اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تو بلبل ہزار داستان بن جاتے تھے۔ (۱۳)

علامہ شبلی نعمانی ایک عظیم مفکر تھے وہ مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے حالات سے کافی فکر مند رہا کرتے تھے، اس دور میں مسلمانانِ ہند اور بین الاقوامی مسلمان کافی اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھا، انھیں ہر محاذ پر ناکامی اور ہزیمت کا سامنا تھا، بین الاقوامی سطح پر سب سے اہم مسئلہ ترکی تھا، صیہونی حکومتیں اس کے اوپر قبضہ اور تسلط جمانا چاہتی تھیں اور سیاسی اور عسکری طاقت وقوت کے زور پر اپنے سامراجی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے بہانے تلاش کر رہی تھیں اپنی جدید عسکری طاقت کی بدولت ان کو کامیابی بھی مل رہی تھی، یورپین حکومتوں کی مسلم سلطنت کے خلاف دشمنی دراصل اسلام سے دشمنی تھی اس لئے سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے انگریزوں کی مخالفت لازمی تھی، علامہ شبلی نعمانی ایک جوشیلے انسان تھے اسلام اور اسلامی مسائل سے دلچسپی ان کے دل میں جاگزیں تھی ان کے جیسا مفکر اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ اگر یہ طاقتیں اپنے مقاصد میں کسی حد تک کامیاب ہو گئیں تو پورے اسلامی دنیا پر ان کی حکومت ہو جائے گی اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت بھی ناممکن ہو جائے گی۔

روم اور یونان کی جنگ ختم ہونے کے بعد بھی حالات ترکوں کے خلاف ہی تھے اور وہاں پوری طرح امن وامان بھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ اچانک صیہونی طاقتوں نے ریشہ دوانیوں کا آغاز شروع کر دیا اور ۲۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی نے بلا کسی سبب کے طرابلس پر حملہ کر دیا (۱۴) جس کا ترک افواج کے افسروں نے انور بے (۱۵) کی سرکردگی میں بڑی دلیری اور بہادری سے مقابلہ کیا اس حملے سے جہاں عالم اسلامی میں غم وغصہ کا طوفان پیدا ہو گیا، ہندوستان میں بھی مسلمان وہاں کے حالات سے پریشان ہوا تھے، اور اپنے ترک بھائیوں کے ساتھ قومی وملی یکجہتی کا مظاہرہ کیا، علامہ شبلی نعمانی" کو اس عظیم حادثے سے ٹھیس لگی، ترک افواج کے بہادروں کے قصے سنا کر اپنے جذبہ قومی کو تسکین دیتے بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ:

> "ہر ہفتہ جب مصر کے عربی اخبارات آتے تھے تو ماسوا سے بے خبر ہو جاتے تھے اور ترک بہادروں کی جانبازی اور شجاعت کے قصے مزے لے کر بیان کرتے، انور بے، عزیز بے مصری، اور دوسرے نوجوان ترک افسر جو اٹلی کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنی جان

ہتھیلیوں پر رکھ کر چھپ چھپ کر طرابلس پہنچ رہے تھے ان کی جوانمردی کے قصوں کے دہرانے میں اس بڑھاپے میں بھی ان میں جوانی کی اکڑ پیدا ہو جاتی تھی۔" (۱۶)

جب ترکی نے اٹلی سے باہمی گفت وشنید کے بعد طرابلس کی خود مختاری کا اعلان کیا اور شیخ سنوسی اور انور بے وغیرہ نے اس کی آزادی کا بیڑا اٹھایا تو علامہ شبلی نعمانی نے بھی جوش وخروش کے ساتھ ان کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ تعاون اور مدد کا اعلان کیا اور جب انھوں نے اخبارات میں پڑھا کہ انور بے وغیرہ طرابلس میں اپنی نئی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اس سے بڑی خوشی محسوس ہوئی انھوں نے اپنے شاگردوں کو بلا کر صندوقچے سے روپیہ نکالا اور آدمی بھیج کر بازار سے مٹھائی منگائی خوشی اور مسرت کا یہ جلسہ دیر تک قائم رہا۔ (۱۷)

بیسویں صدی کے آغاز میں جنگ طرابلس جو ۱۹۱۲ء تک جاری رہی اور یہ ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ملک ترکی پر ایک اور جنگ کے بادل منڈلانے لگے، اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ریاست بلقان نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اس کی سرپرستی یورپ کی سلطنتیں کر رہی تھیں، ان مسلسل حملوں اور جنگ سے حکومت عثمانیہ کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا اور وہ کمزوری کی آخری حد تک پہنچ گئی، انگریزوں کی سرپرستی میں متحدہ فوجوں نے ترکوں پر وہ تشدد اور مظالم ڈھائے جن کو تاریخ کے اوراق میں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسے حالات وواقعات کو سنکر ہندوستانی مسلمانوں میں قومی وملی جذبہ ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھا انھوں نے برطانیہ حکومت سے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا کہ متحدہ بلقانی ریاستوں کی امداد دینا بند کر دے اور ان کو ترکوں پر تشدد سے روکے، علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے غم زدہ جذبات کو انگریزوں کے سامنے اس طرح پیش کیا:

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا ☆ مگر اس کا اثر جو کچھ ہے وہ ہندوستاں تک ہے
مگر ہم کیا کریں اس کو عالم گیری ملت ☆ عراق وفارس ونجد وحجاز وقیرواں تک ہے
منافق ہے جو کہتا ہے کہ میں ترکی سے یکسو ہوں ☆ یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے
ہمارا جوش اسلامی انھیں باور نہیں آتا ☆ یہ انداز تغافل جلوہ گاہ امتحاں تک ہے
پڑا سوتا ہے کوئی گنبد خضرائے یثرب میں ☆ کہ جس کا بندہ فرمان زمیں سے آسماں تک ہے
کوئی جا کر یہ کہدے ہم گنہگاروں کی جانب سے ☆ کہ اب مسلم کی ہستی تیری الطاف نہاں تک ہے (۱۸)

ترکوں پر پڑنے والی اس عظیم مصیبت سے زمین و آسمان کانپ رہے تھے اس حادثہ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں ناسور پیدا کر دیا، مسلمانانِ ہند میں اسلامی جذبات اور حمیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے دلوں میں بھی اعلانیہ آزادی اور حریت کی چنگاری سلگنے لگی، علامہ شبلی نعمانی اس سے کیسے الگ رہ سکتے تھے، اور اس درد کو بھلا ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا، انھیں تو بس ایک ہی فکر ستا رہی تھی کہ ہر جگہ مسلمان ذلیل ہو رہا ہے، اس کو ہزیمت اور پسپائی کے دور سے گذرنا پڑ رہا ہے، اسی سال انھوں نے اپنی مشہور نظم (شہر آشوب اسلام) ہنگامہ طرابلس و بلقان لکھی جس کو لکھنؤ کے ایک جلسہ میں نہایت درد و کرب کے ساتھ پڑھی جو ترکی کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔(۱۹) اس نظم میں ان کی درد انگیزی کس حد تک تھی اور مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کو کس طرح پیش کیا جس نے جلسہ میں موجود مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا خود روئے اور دوسروں کو بھی رلایا(۲۰) ان کی نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کبتک (۲۱)

اس کے بعد ظالم اقوام سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکہ، یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگریزی طوفان بیداد بلا تاکہ ؟
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامہ آہ وفغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہئے تم کو؟
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ وفغاں کب تک (۲۲)

آگے چل کر علامہ شبلی نعمانی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ان ظالم اقوام کی لڑائیاں ملکی یا سیاسی نہیں بلکہ وہ مذہبی صورت کی ہیں اور صلیبی جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کے اس مفکرانہ سوچ کی صحیح تصویر آج کے دور میں بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح یہ صیہونی طاقتیں آج مسلمانوں کو اقتصادی معاشی طور سے کمزور کرنے اور اپنے غاصبانہ عمل سے قبضہ اور لوٹنے کی کوشش میں برابر مصروف ہیں، آج افغانستان اور عراق کی جنگ یا عرب ممالک کے علاقوں پر ناجائز قبضہ بھی صلیبی جنگ کا ایک حصہ ہے لیکن اس دور میں کوئی نہیں جو علامہ شبلی نعمانی کی طرح کھل کر اسی مسئلہ پر جذبات کا اظہار کرے اور قوم وملت کو بیدار کرے، اس پس منظر میں علامہ کی ایک نظم کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خوں سے سینچیں گے تمہاری کھیتیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام ونشاں کب تک (۲۳)

اپنی نظم ''شہر آشوب اسلام'' کے آخری حصے میں ان کی مایوسی اور بڑھ جاتی ہے انھوں نے محسوس کرلیا کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرنے والا ہے مقامات مقدسہ کی حرمت خطرے میں پڑ جائے گی اور خادمین پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے گا، اپنے انھیں احساسات اور جذبات کی طرف انھوں نے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:

پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمہ توحید وگلبانگ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑ کر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن اماں شام ونجد وقیرواں کب تک (۲۴)

علامہ شبلی نعمانی ترکوں کی شکست کو ساری امت مسلمہ کے لئے ناکامی اور ان کے زوال سے تعبیر کرتے تھے، اور ترک بھائیوں کی مدد کو اولین ترجیح دینا اپنا قومی وملی فرض سمجھتے تھے، اس طرح کی مساعی جمیلہ میں ہمیشہ ترکوں کے ساتھ کھڑے رہے اور مسلمانان ہند کی عملی سرگرمیوں میں برابر شریک کار رہے، جب نومبر ۱۹۱۲ء کو ایک ڈاکٹروں کی ٹیم ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء) کی سربراہی میں جس میں علی گڑھ کے طلباء کے نمائندے بھی تھے (۲۵) ترکی روانہ ہوا تو علامہ شبلی نعمانی ان بہادر نوجوانوں کو کیسے بھول سکتے تھے یہ واقعہ اس انتہائی محبت وعشق کا گواہ ہے جو ان کے سلسلے میں پیش آیا بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

''ڈاکٹر صاحب اس وقت بالکل نوجوان تھے اور مولانا بوڑھے اس پر بھی منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری لکھنؤ ہوکر روانگی کے لئے دلی جارہے تھے، لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کے لئے موجود تھے، گاڑی روانہ ہونے کو ہے مولانا پلیٹ فارم پر موجود ہیں، ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے الوداعی سلام کہہ رہے ہیں کہ دفعۃً اس ہمہ تن جوش علامہ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، دفعۃً ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا آنسوؤں سے اس کے گرد وغبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لئے اور گاڑی اسلامی غیرت وحمیت کے ان گہر ہائے گرانمایہ کو لے کر آگے بڑھ گئی۔''(۲۶)

اپنے چند ماہ کے قیام ترکی میں ان بہادر نوجوانوں نے ترک مظلوم بھائیوں کی بڑی خدمت کی، ان کے زخموں کی مرہم پٹی اور علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ان کو مالی اور اخلاق امداد بھی پہنچائی جس سے ان کے دل میں ہندوستانی مسلمانوں کی محبت پیدا ہوگئی اور ان کو اس مدد سے بڑا سکون نصیب ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی اس وفد کے جذبہ قومی اور شاندار کارناموں سے بہت متأثر تھے، جب ڈاکٹر انصاری اپنے وفد کے ساتھ واپس آئے تو وہ اتفاق سے بمبئی میں موجود تھے، وہ استقبال کے لئے حاضر ہوئے، ڈاکٹر انصاری کی قدم بوسی کے لئے آگے بڑھے، انھوں نے معذرت چاہی تو فرمایا کہ''یہ تمہارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں۔''(۲۷)

اس وفد کی آمد کے موقع پر بمبئی میں مسلمانوں کی جانب سے منعقد ایک شاندار استقبالیہ پارٹی میں علامہ شبلی نعمانی نے اپنے پرسوز انداز میں اپنے درد وکرب کا اظہار کیا، اس کو سن کر موجود حاضرین کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے، ان کی نظم کے چند اشعار سے ان کی دلی جذبات کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری ☆ کہ آئے خیرت سے ممبران وفد انصاری
ہزاروں کوس جاکر بھائیوں کی تم نے خدمت کی ☆ یہی تھا درد اسلامی، یہی تھی رسم غم خواری
نگاہ حسرت آلود عزیزان کی سناں باری ☆ فغاں سینہ ریشان محبت کی شرر باری
مگر ایک جذبہ اسلام نے سب کو شکستیں دیں ☆ کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں بااین گرانباری

تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے ☆ کہ تم نے غازیان دین کی کی ناز برداری
تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں ☆ کہ دکھلائے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری (۲۸)

علامہ شبلی نعمانی اس کے باوجود مایوس نہیں ہوتے ہیں ان کے دل میں امید کی کرن ابھی باقی ہے، انہیں امید ہے کہ ایک نہ ایک دن سمندر میں جزر کے جلوے میں مد کے آثار ضرور دکھائی دیں گے انقلاب زمانہ مسلمانوں کی کھوئی عزت و وقار کو دوبارہ حاصل کرنے میں مدد دے گا، فرماتے ہیں:

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی ☆ تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے ☆ کہ ہم نے انقلاب چرخ گردولیوں بھی دیکھے ہیں
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی ☆ تو اب دست دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی (۲۹)

علامہ شبلی نعمانی کو ترکوں سے اس قدر محبت تھی کہ وہ ان کی ہر طرح سے مدد کو تیار رہتے تھے، انھوں نے اس سلسلے میں فقہی اجتہاد و روایات کا سہارا لے کر عید قرباں پر قربانی کے بجائے ترکوں کی اعانت کے جواز کا فتویٰ دیا، اور مفتی عبداللہ ٹونکوی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی ان کی رائے سے متفق تھے، (۳۰) لیکن بعض علماء کو اس رائے سے اتفاق نہ تھا ان میں ایک مولانا ظفر علی خاں صاحب جنھوں نے علی گڑھ کے زمانے میں علامہ شبلی نعمانی سے کسب فیض کیا تھا۔ (۳۱) ان کو اپنے شبہات تحریری شکل میں لکھ بھیجا تھا (۳۲) علامہ شبلی نعمانی نے اس کی وضاحت اپنے ۱۶/ نومبر ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں اس طرح دیا:

> ''بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے، اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو وہاں وہی سنت مقصود ہے، فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا، اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی کیا ترکوں کی جان مینڈھے بھی کم ہے۔'' (۳۳)

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے اس خط کو ۱۷/ نومبر ۱۹۱۲ء کو عام اخباروں میں شائع کرایا اور اس تحریک کو ہندوستان میں بڑے پیمانے پر تشہیر کرائی، ان کو اس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی، اور ہزاروں روپے چندے کے جمع ہو گئے، جس کو انھوں نے ترکوں کے لئے بھیجا اور برابر اپنی نظموں اور خطبات سے حوصلہ افزائی کرتے رہے، علامہ کی ان کوششوں کا مدتوں لوگوں کے دلوں پر

اثر رہا ان کو تھوڑا سکون اس وقت حاصل ہوا جب انھوں نے اخبارات میں پڑھا کہ ترک اس جنگ عظیم میں اڈریانوپل (ادرنہ) تک پیچھے ہٹ آئے تھے اور اڈریانوپل بھی ہاتھ سے جا چکا تھا مگر آخر آخر ایسی صورت ہوئی کہ انھوں نے اس شہر کو جو یورپ میں ان کا پہلا پایہ تخت تھا دوبارہ حاصل کر لیا مسلمانوں کو اس فتح سے بڑی خوشی ہوئی (۳۴) علامہ نے ۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو اس خوشی کے موقع پر مبارک باد کے چند اشعار پڑھے:

اے ترک! اے مجسمۂ کبریائے حق ☆ اے وہ کہ جس پر عالم ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہ ملت ختم الامم ہے تو ☆ تو آج زور بازوئے شاہ مجاز ہے
رنگین ہے جو تیری تیغ سے ہر صفحہ وجود ☆ مغرب ترا ہی عرصۂ گہِ ترک ناز ہے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں ستاں ☆ اب بھی فنائے ہستی دشمن کا راز ہے
رنگین جو ہے مرقع عالم کا ہر ورق ☆ شمشیر تیری خامہ رنگیں طراز ہے (۳۵)

مولانا شبلی نعمانی ترکی حکومت کی فتح کو ساری امت کی فتح و کامیابی تصور کرتے تھے، ان کو اسلامی اقدار اور اسلام سے گہری عقیدت تھی اس لئے وہ ہمیشہ بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی سربلندی چاہتے تھے، ان کے قومی اور ملی افکار ان کے سیاسی افکار کے آئینہ دار ہیں، ان کا ملی احساس ان کی انگریز دشمن کی وجہ سے پیدا ہوا جن کی سازشوں سے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمان اچھوتے نہ تھے، ان کے اندر بھی حب الوطنی اور نیشلزم کا جذبہ ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے، ان کی حب الوطنی کا جذبہ دوسرے برادران وطن کے ساتھ اشتراک عمل پر مجبور کرتا ہے، (۳۷) وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن پر اپنے لوگوں کی حکومت ہو۔

علامہ شبلی نعمانی ملکی اور قومی مسائل کے بارے میں برابر غور و فکر کرتے وہ سیاسی نہ تھے لیکن دیگر قوم پرست اور محبان وطن کی طرح ان کے حساس دل نے مجبور کیا کہ عملاً نہ سہی تو اپنے قلم اور زور خطابت کی طاقت سے اس کام کو انجام دیں، وہ خود کو اس سے الگ نہ رکھ سکے اور مسلمانوں کے اندر سیاسی بیداری اور فکر و شعور پیدا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مولانا طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں:

"سیاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں اب تک زیادہ تر نام جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے آئے ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست میں داخل ہوئے

قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا بلکہ انھوں نے ہی فرقہ پرستی کے دلدل سے
نکالنے میں خاص کام کیا جن میں سب سے اول نام مولانا شبلی کا آتا ہے۔'' (۳۸)

وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قومی و سیاسی مسائل پر اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور آزادانہ اپنی رائے عوام کے سامنے رکھی، یہ ان کا سیاسی فکر و شعور تھا کہ وقت کے سلگتے سیاسی مسئلوں میں دلچسپی لی، جمہوریت کی دعوت دی، کانگریس کی حمایت کی ہندو مسلم اتحاد، مسلم لیگ کے عزائم اور سیاسی مصالحت پر آرٹیکل اور نظمیں لکھیں، ہندوستان میں عالم گیر اتحاد کے وہ داعی رہے، تقسیم بنگال کی تنسیخ، واقعہ مسجد کانپور، اوقاف، تعطیل جمعہ جیسے حساس قومی مسائل کو حکومت وقت کے سامنے مدلل انداز میں پیش کیا اور بڑی حد تک اپنی باتوں کو منوانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ (۳۹)

علامہ شبلی نعمانی کے سیاسی افکار و نظریات بڑی حد تک کانگریس سے ملتے جلتے تھے وہ بڑی حد تک آزادی کے بھی حامی تھے، انگریزوں کی سرپرستی انہیں ناپسند تھی، ہندوستان کے عوام اور خاص کر مسلمانوں سے ان کی یہی خواہش رہی کہ وہ کانگریس کے ساتھ ملک کی آزادی میں اپنا اہم کردار ادا کریں، اس سلسلے میں ان کی سرسیدؒ سے اکثر بحثیں ہوا کرتی تھیں، علامہ پیارے لال شاکر میرٹھی مدیر ادیب کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

'' رائے میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسیدؒ کے ساتھ سولہ برس رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں
ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔'' (۴۰)

علامہ شبلی نعمانی شروع ہی سے جمہوریت کے شیدائی تھے اور ہندوستان کی آزادی کے حق میں تھے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہو چکی تھی اور ملک میں ایک نئی طرح کی فضا بننے لگی تھی، اگر سرسیدؒ کانگریس کے مخالف تھے تو علامہ شبلی نعمانی اس کے حق میں اپنی مدلل دلیلیں پیش کرتے یہ وہ دور تھا جب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ و دیگر انقلاب پسند علماء ہندوستان میں ہندوستانیوں کی حکومت چاہتے تھے اس لئے وہ کانگریس سے وابستہ ہو کر اس پارٹی کے نظریات و خیالات کو عام کر رہے تھے جب کہ وہ ابھی اپنے ابتدائی دور سے گذر رہی تھی، علامہ شبلی نعمانی نے بھی یہ محسوس کیا کہ جب تک ہندوستان کے تمام فرقے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلسل جدوجہد نہیں کریں گے برطانوی حکومت اس ملک کو نہیں چھوڑے گی اس لئے انھوں نے

کانگریس کے کام کو سراہا اور فرقہ پرست جماعتوں کی سخت مخالفت کی۔ (۴۱)

علامہ شبلی نعمانی جمہوری طرز حکومت کو اچھا اور مکمل نظام تصور کرتے تھے اور ہمیشہ اس کے علم برداروں میں رہے، علی گڑھ کالج میں قیام کے دوران جمہوری طرز حکومت کی حمایت میں موثر تقریر کی جب کہ اس دور میں جمہوریت کی باتیں کرنا اور سننا دونوں جرم تصور کیا جاتا تھا، طلباء نے ان کی موافقت میں رائے دی۔ (۴۲) سرسیدؒ نے اس رائے کو پسند نہیں کیا اور جمہوری طرز حکومت کی مخالفت میں ایک طویل مضمون لکھا اور اس کو ۲۸ر جون ۱۸۹۲ء علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا۔ (۴۳) علامہ شبلی نعمانی اسلام نظام حکومت کو مکمل جمہوری نظام تصور کرتے، ان کا خیال تھا کہ جمہوریت کی بنیاد مساوات پر ہے اور اسلام سے زیادہ مساوات و برابری کسی اور جگہ نہیں پائی جاتی، چنانچہ جب ترکی میں ۱۹۰۸ء میں دستور میں تبدیلی ہوئی جس کی رو سے سلطنت عثمانیہ ایک جمہوری حکومت بن گئی تو وہ بھی بے پناہ خوش ہوئے (۴۴) اور علی گڑھ کالج میں ۲۱ر فروری ۱۹۱۳ء کو "اسلام بحیثیت ایک مکمل مذہب" "اسلام کی بہترین جمہوریت" کے موضوع پر ایک پرزور لکچر دیا (۴۵)

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت اس وقت دیا جب ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے صوبہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تو شروع میں اس کی ہر قوم کے لوگوں نے مخالفت کی لیکن لارڈ کرزن نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی اور مذہبی خلیج کو گہرا کرنے کی کوشش کی چنانچہ ۱۱ر مارچ ۱۹۰۵ء کو ڈھاکہ میں ایک عظیم الشان جلسے میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ تقسیم بنگال صرف انتظامی امور کو ہلکا کرنے کے لئے نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک اسلامی صوبہ بنانا تھا جس میں مسلمانوں کا غلبہ ہو، اس تقریر کے بعد بہت سے سرکردہ مسلمانوں نے اس تجویز کو مان لیا لیکن ہندو سیاست دانوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کانگریس نے بھی اس کی مخالفت شروع کر دی اور اس فیصلہ کو ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کے مترادف قرار دیا لیکن اچانک ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر اس حکم کی منسوخی کا اعلان کیا گیا اس سے مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا لازمی تھا، اس وقت کے بعض سربرآوردہ لوگوں میں جیسے سر آغا خاں نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا تو مسلم لیگ کے بانی نواب وقار الملک نے اس کو مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی قرار دیا، علامہ کو اس واقعے سے بڑی تکلیف

پہنچی، انھوں نے اپنے مضامین اور تقریروں سے جہاں حکومت وقت کی اس بات کے لئے مذمت کی وہیں مسلم لیگ کے غلط نظریات کی بھی مخالفت کی اس سلسلے میں انھوں نے ''مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ'' کے عنوان سے مضامین لکھے یہ مضامین اس قدر مدلل اور موثر تھے کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی کہ ''اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا۔'' (۴۶)

انھوں نے اپنے مضمون میں تقسیم بنگال کو مسلمانوں کی غلط سیاسی سوجھ بوجھ اور مسلم رہنماؤں کی حکومت نوازی قرار دیا، ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس سے مل کر اپنے مطالبات حکومت کے سامنے رکھنے چاہئیں اور اس طرح وہ اپنے مقاصد میں باہم مل کر کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن علامہ شبلی نعمانی کی اس رائے سے مسلم لیگ لیڈر نواب وقار الملک متفق نہیں تھے کہ مسلمان کانگریس میں شامل ہوں انھوں نے اپنے ایک طویل مضمون میں اس طرح اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر مسلمان کانگریس میں شرکت کریں گے تو ان کی ہستی فنا ہو جائے گی، اس مضمون کے جواب میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''نواب وقار الملک کا سنجیدہ لیکن بہادرانہ مضمون ایک سچے دلیر مسلمان کی آواز ہو سکتی تھی، اگر اس میں غلط منطق شامل نہ ہو جاتی کہ ''ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائے گی، جس طرح معمولی دریا سمندر میں جاتے ہیں'' اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے انیس کرور اور مسلمانوں کے پانچ کرور افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے اگر دادا بھائی نوروزجی تمام ہندوستان کے مقابلے میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا .... ممبر ہو سکتا ہے، اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو پانچ کرور مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔'' (۴۷)

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا وہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی سیاست میں شمولیت اور حصہ داری کے بارے میں اپنی وقیع رائے پیش کر دی اور ان لوگوں کے خلاف آواز بلند کی جو مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو ہندوستان کے اکثریتی طبقہ سے الگ کرانا چاہتے ہیں انھوں نے ہندوستان کے

مسلمانوں کو بتلانے کی کوشش کی کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں میں قومی احساس، ملی جذبہ اور سیاسی شعور کی کمی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''پالیٹکس ایک سخت قومی احساس ہے اس کا ظہور بیگار کے طریقہ سے نہیں ہوتا، یہ احساس جب دل میں پیدا ہوتا ہے تو دل و دماغ اور اعضاء سب مصروف کار ہو جاتے ہیں اور خود بخود جد و جہد، محنت و سعی، تگ و دو ایثار و محویت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔'' (۴۸)

دوسری جگہ مسلم لیگ میں جو سیاسی احساس کی کمی نظر آتی ہے اس کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''مسلم لیگ کا طرز عمل بتاتا ہے کہ اس کی آواز ایک مصنوعی اور خارجی آواز ہے۔'' (۴۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ شبلی نعمانی قومی جدو جہد کی اہم ترین ترقی پسند طاقتوں کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں، وہ ایک عظیم مقصد کے حصول (آزادی) کے لئے سیاست کو ہندو مسلم اور مذہبی فرقہ وارانہ تقسیم کے خلاف تھے اور مسلمانوں کو سیاست میں آنے کی دعوت دی، علامہ نے اپنے مضمون (مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ) میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے چند اہم باتیں درج ذیل ہیں:

۱- قومی جدوجہد کے مقدس مقاصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا اور کانگریس کی موافقت کرنا چاہئے۔

۲- علامہ نے بعض مسلم رہنماؤں کی اس بات کا تفصیلی جواب دیا کہ کانگریس میں شامل ہونے کے بعد ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔

۳- ابھی مسلمانوں کو پالیٹکس کے قابل بننا چاہئے ابھی عملی سیاست میں حصہ لینے کا وقت نہیں آیا ہے ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے ہماری تعداد کم ہے اس لئے ''نیابتی اصول سلطنت ہمارے موافق نہیں'' جیسے نعرے چھوڑ کر عملی طور پر مسلمانوں کو بھی سیاست میں حصہ لینا چاہئے اور بے خوف وخطر اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

۴- ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہئے اور اگر ہم میں سلف رسپکٹ کا بھی کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھانا چاہئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں۔

۵- سیاست میں ان چیزوں کو اپنا نصب العین بنانا چاہئے جس پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہو۔

علامہ شبلی نعمانی نے جہاں مسلم لیگ پر تنقیدیں کی وہیں ان کو مفید مشوروں سے نوازا کہ وہ اپنی رکنیت کو عوامی سطح پر لے جائے اور اپنے کو مخصوص طبقے تک محدود نہ رکھے، اس کے آئین ومقاصد میں توسیع کی جائے، محض تحفظات کے حصول کے بجائے ہندوستان کے لئے حق ارادیت کے نصب العین کو شامل کیا جائے اور ان مخصوص قراردادوں کے سوا جن کا تعلق خالصاً مسلمانوں سے ہے باقی تمام قراردادیں جو کانگریس نے منظور کر رکھی ہیں، ان کے اس اظہار خیال کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ہل چل مچ گئی، یہاں تک کے مسلم لیگ کو بھی اپنی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس سلسلے میں جو مضامین انھوں نے لکھے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکردہ مسلمانوں کی کوششوں سے کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے قریب آئے یہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (۵۰)

ان کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کے قومی وسیاسی مسائل کو حکومتی سطح پر پیش کرنے ان تحریکات کو عملی جامہ پہنانے نیز مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار کرنے میں علامہ شبلی نعمانی کا بہت بڑا حصہ ہے، اگست ۱۹۱۳ء میں پیش آنے والا واقعہ مسجد کانپور ایک عظیم حادثہ ہے جس میں مچھلی بازار کی ایک مسجد کے باہری حصہ کو بغرض توسیع سڑک ضلع مجسٹریٹ کانپور کے ذریعہ منہدم کرادیا گیا، مسلمانوں میں شدید غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، اور انھوں نے منہدم شدہ حصے کی دوبارہ تعمیر شروع کردی یہ بات ضلعی حکام کو ناگوار گذری اور اس وقت کے ڈپٹی کمشنر پولیس بٹلر نے بے گناہ مسلمانوں پر گولیاں چلوادیں اور بڑی تعداد میں مسلمان شہید ہو گئے، اس کے بعد زیادتی یہ کیسی کہ مسلمانوں کو ہی نقض امن میں گرفتار کیا گیا، اس عظیم واقعہ نے مسلمانوں کے دل ودماغ پر گہرا اثر چھوڑا، بلا تفریق مذہب وملت تمام لوگوں نے اس حادثہ کی مذمت کی، جلوس نکالا اور حکومت کے سامنے اپنے جذبات کو پیش کیا، علامہ شبلی نعمانی بھلا اس میں پیچھے کیوں رہتے، بمبئی میں قیام کرتے ہوئے بھی انھوں نے اس تحریک میں حصہ لیا اور احتجاجی جلسوں میں شریک ہوئے اور تقریروں واپنی معرکۃ الاراء نظموں کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں پر جو اثر ڈالا اس کو پڑھ کر آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے

ہیں، ان کی ایک نظم "ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جان نظر پڑے ☆ دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خوردسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر ☆ بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر ☆ نید آگئی ہے، منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجوان ہیں بے خبر نشۂ شباب ☆ ظاہر میں گرچہ صاحب عقل وشعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ ☆ مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں (۵۱)

اس کے علاوہ بھی اس حادثہ سے متعلق کچھ اور بھی نظمیں کہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں ہنگامہ مسجد کانپور، علماء زندانی، آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم، کانپور میونسپلٹی کا خطاب مسجد مچھلی بازار کان پور سے، خون کے چند قطرے، پابہ زنجیران کانپور اور مسجد کانپور کا وفد اور سرجیمس مسٹن کا جواب۔

وقف علی الاولاد کا مسئلہ بھی ان کے عہد کا ایک اہم قومی وملی مسئلہ تھا جس کے بارے میں سرسیدؒ نے سب سے پہلے قدم اٹھایا اور اپنی لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں "وقف خاندانی" کے نام سے ایک مسودہ قانون پیش کیا لیکن اس کو منظور کرانے میں ناکام رہے۔ (۵۲) ان کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے اس کا بیڑا اٹھایا اور اپنی کوششوں اور جدوجہد سے ایک تجویز مرتب کی جس کو ندوۃ العلماء کی سنگ بنیاد کے سلسلے میں ہونے والے جلسہ عام کے موقع پر نومبر ۱۹۰۸ء میں مجلس انتظامیہ میں علماء کے سامنے پیش کیا اور اس کے فوراً بعد کھلے اجلاس میں یہ تجویز منظور کرائی، جس سے مسلمانوں کے اندر بھی وقف علی الاولاد کے سلسلے میں تحریک پیدا ہوئی اور اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی نے شیعہ اور ہندو لیڈروں سے اس کی تائید کرائی اور حکومت وقت کو بھی اس تجویز کے سامنے سر جھکانا پڑا اور مسٹر محمد علی جناح کی تحریک سے اسمبلی نے اس کو قانون بنانا منظور کیا۔ (۵۳)

مسئلہ وقف علی الاولاد کی طرح عام اوقاف اسلامی کے متعلق بھی انھوں نے سوچا کہ کس طرح اوقاف کی جائیدادیں اور کثیر رقمیں بیکار پڑی ہوئی ہیں اور قومی کاموں میں صرف نہیں ہو رہی ہیں ان کے اچھے حسن انتظام کی ضرورت ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ کے دور میں بہت سی اسلامی تنظیموں اور مسلم لیگ وغیرہ نے اس کی تجویزیں گورنمنٹ کے پاس بھیجیں لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، لیکن

علامہ شبلی نعمانیؒ نے جنوری ۱۹۱۴ء میں اس طرح اس تحریک کو شروع کیا کہ فروری ۱۹۱۴ء میں حکومت نے اوقاف کے متعلق ایک یادداشت شائع کی، ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی یہ تحریک آگے بڑھتی گئی اور اکثر صوبوں کی حکومتوں نے اس کے متعلق سوچنا اور قانون بنانا شروع کر دیا۔

نماز جمعہ کی تعطیل کے مسئلہ کی طرف بھی انھوں نے توجہ دی اور حکومت کے سامنے اس کو اس طرح پیش کیا جس طرح وقف علی الاولاد مسئلہ کو پیش کیا تھا، انھوں نے سب سے پہلے اپریل ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں جو لکھنؤ میں ہوا اس مسئلہ سے متعلق رزولیشن پیش کیا۔ (۵۴) اور اس تحریک کو عملی شکل دی جلد ہی کئی صوبوں کی حکومتوں نے اس تجویز کو مان لیا اور جمعہ کے دن مسلمانوں کے لئے کچھ وقفہ چھٹی کا اعلان کیا۔

اگر ہم علامہ شبلی نعمانیؒ کے مندرجہ بالا نظریات وخیالات کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ہندوستان اور بین الاقوامی مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات ومسائل پر جس طرح انھوں نے اظہار خیال کیا اور جس طرح اس کو ایک تحریک کی شکل دی اور ان تحریکات میں صف اول میں رہے یہ ان کی سیاسی وقومی بصیرت اور ملی احساس دردمندی کا واضح ثبوت ہے، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ مسلمانوں کے دلوں میں بیداری وجوش پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

حواشی:

(۱) حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء دیباچہ ص ۱۷-۱۸

(۲) حیات شبلی ص ۹-۱۰

(۳) ایضاً ص ۹۴۔

(۴) ایضاً ص ۵۸۸۔

(۵) یادگار شبلی: ایس، ایم اکرام ادارہ ثقافت لاہور طبع دوم ۱۹۹۲ء ص ۷۷۔

(۶) حیات شبلی ص ۹۵

(۷) ایضاً ص ۵۸۸۔

(۸) ایضاً ص ۵۸۹۔

(۹) مقالات شبلی جلد ہشتم علامہ شبلی نعمانی۔ دار المصنفین اعظم گڑھ جدید ایڈیشن ۲۰۰۰ء دیباچہ ص ۴

(۱۰) حیات شبلی ص ۵۸۹۔

(۱۱) ایضاً ص ۵۸۸۔

(۱۲) ایضاً ص ۵۸۹۔

(۱۳) ایضاً ص ۵۹۰۔

(۱۴) ایضاً ص ۵۹۱۔

(۱۵) ایضاً ص ۵۹۱۔

(۱۶) ایضاً ص ۵۹۲۔

(۱۷) ایضاً ص ۵۹۲۔

(۱۸) کلیاب شبلی اردو۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی معارف پریس اعظم گڑھ طبع ششم ۱۹۸۷ء ص ۵۹-۶۰

(۱۹) حیات شبلی ص ۵۸۹۔

(۲۰) ایضاً ص ۵۹۷۔

(۲۱) کلیات شبلی اردو ص ۵۳۔

(۲۲) کلیلت شبلی اردو ص ۵۳-۵۴۔

(۲۳) ایضاً ص ۵۴۔

(۲۴) ایضاً ص ۵۴۔

(۲۵) البصیر، علامہ شبلی نمبر جون تا دسمبر ۱۹۵۷ء اسلامیہ کالج چینوٹ پاکستان ص ۲۰

(۲۶) حیات شبلی ص ۵۹۷۔

(۲۷) ایضاً ص ۵۹۷۔

(۲۸) کلیات شبلی اردو ص ۵۵

(۲۹) ایضاً ص ۵۶۔

(۳۰) حیات شبلی ص ۶۰۰۔

(۳۱) مکاتیب شبلی حصہ اول مولانا سید سلیمان ندوی مطبع دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۶۶ء ص ۳۴۲۔

(۳۲) حیات شبلی ص ۶۰۰۔

(۳۳) مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۳۴۲۔

(۳۴) حیات شبلی ص ۶۰۱۔

(۳۵) کلیات شبلی اردو ص ۵۹۔

(۳۷) البصیر شبلی نمبر مقالات شبلی عبید اللہ خان ایم۔اے، ص ۸۱۔

(۳۸) روح روشن مستقبل، مولانا طفیل احمد منگلوری، نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۴ء ص ۶۳۔

(۳۹) مقالات شبلی جلد ہشتم ص ۴۔

(۴۰) رسالہ معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ نومبر ۱۹۲۳ء ص ۳۹۴ نیز دیکھئے حیات شبلی ص ۶۱۰۔

(۴۱) البصیر شبلی نمبر ص ۱۸۱۔

(۴۲) حیات شبلی ص ۱۴۰۔

(۴۳) شبلی کی علمی وادبی خدمات، مرتبہ خلیق انجم مقالہ (علامہ شبلی کے سیاسی افکار، از ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۹۶ء ص ۱۷۲۔ نیز دیکھئے حیات شبلی ص ۱۶۰۔

(۴۴) ایضاً ص ۵۹۰۔

(۴۵) شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۱۷۳۔

(۴۶) حیات شبلی ص ۶۱۴۔

(۴۷) مقالات شبلی ہشتم ص ۱۳۷-۱۳۸۔

(۴۸) مقالات شبلی ص ۱۵۴۔

(۴۹) ایضاً ص ۱۵۵۔

(۵۰) حیات شبلی ص ۶۲۸۔

(۵۱) کلیات شبلی اردو ص ۷۷۔

(۵۲) حیات شبلی ص ۵۳۸۔

(۵۳) مقالات شبلی جلد ہشتم دیباچہ ص ۴۰۔

(۵۴) حیات شبلی ص ۵۴۹۔

☆☆☆

علامہ شبلی نعمانی
اور
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد تعظیم ☆

علامہ شبلی نعمانی ایک جگہ رقمطراز ہیں ''اگر دنیا کی عجیب وغریب غلط فہمیوں کی فہرست تیار کی جائے تو ان میں یوروپ اور مورخین یوروپ کی غلط بیانیوں کو سب سے اونچے درجے پر رکھنا پڑے گا۔''(۱) اور پھر ان کے نزدیک حقیقت یہ تھی کہ ''اکثر واقعات کسی خاص وقتی سبب سے شہرت کے منظر پر آجاتے ہیں اور پھر عام تقلید کے اثر جو خاصہ انسانی ہے، شہرت عام کی بنا پر لوگ اس پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں اور کسی کو تنقید اور تحقیق کا خیال تک نہیں آتا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مسلمات عامہ میں داخل ہوجاتے۔'' ساتھ ہی ''فلسفہ تاریخ کا ایک راز ہے کہ جو واقعات جس قدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہوتی ہے۔'' لہذا ضروری ہے کہ ان شواہد کی تلاش کی جائے جن سے ان کی صداقت کی تصدیق ہوسکے۔''(۲) دراصل ہندوستان کی تاریخ میں اورنگ زیب کے ساتھ بھی معاملہ کچھ اسی طرح کا ہے، ہندوستان میں برطانوی استعمار نے اپنی حکومت کو جائز قرار دینے اور حکومت مخالف آوازوں کو دبانے و منتشر کرنے کے لئے خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت ہندوستان کی تاریخ کو استعماری چشمے سے دیکھتے ہوئے لکھا اور اپنے دور حکومت کو سابقہ حکومتوں سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی، لہٰذا ضروری تھا کہ سابقہ ادوار کی تصویر کشی کچھ اس انداز میں کی جائے کہ انگریزی عہد نہ صرف ان سے بہتر لگے اور نعمت سمجھا جائے بلکہ ہندوستانیوں کے اتحاد کو بھی توڑا جاسکے، اس کام کے لئے تاریخ

☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

سے بہتر کوئی اور آلہ نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ تاریخ ہی وہ مضمون ہے جس سے ملک وملت کے شیرازہ کو متحد و منظم کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ نفرت کے وہ بیج بوئے جا سکتے ہیں جس سے ایک توانا درخت نشو و نما پا سکے، اس مقصد کے پیش نظر انگریزوں نے بالخصوص عہد وسطی کو ہندوکش اور غیر ملکی حکمرانوں کی حکومت کے بطور پیش کیا، جن کی حکومت انگریزوں کے مطابق استحصال اور مذہب دشمنی پر مبنی تھی، اس لئے ان لوگوں نے عہد وسطی کے بجائے مسلم ہندوستانی نامی اصطلاح کا استعمال کیا، ساتھ ہی مغل خاندان کے دو عظیم بادشاہوں اکبر اور اورنگ زیب کی شبیہ بالترتیب مسلم مخالف و اسلام مخالف اور ہندو مخالف و ہندوکشی کو اس شدت کے ساتھ پیش کی کہ آج ان دونوں عظیم بادشاہوں کے نام آتے ہی ایسا ہی تصور ذہن میں ابھرتا ہے، اس کے پس پشت مقصد تھا ہندوستان میں ہندو مسلم منافرت پیدا کرنا، ہندوستانیوں کو فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کرنا تا کہ ان کے لئے ہندوستان پر حکومت کرنا اور استحصال کرنا آسان ہو جائے، ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی تاریخ میں راون اور اورنگ زیب سے بڑا کمینہ اور کوئی نہ ملے گا'' کچھ اس طرح کی تصویر کھینچی ہے ہمارے دانشوروں نے ،اورنگ زیب فرشتہ نہیں تھا، باپ کو قیدی بنانے والا اپنے بھائیوں کا قاتل اور کچھ بھی ہو فرشتہ تو قطعاً نہیں تھا، اورنگ زیب ہندوستانی تاریخ کا شیطان تھا؟ ہندوستان کو کابل سے کاویری تک کی وسعت بخشنے والا، اس کے ایک ایک انگ کو جوڑنے والا، اس کی رومانیت، اس کی تہذیب اور انسانی زندگی سے پیار کرنے والا اور جو کچھ ہو شیطان نہیں ہو سکتا۔

اشوک اور اکبر سے بھی وسیع تر ہندوستان کا نقشہ بنانے والا اسی ملک میں اپجا ہوا اور یہیں کی آب و ہوا میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گذر کر اسی زمین کی مٹی میں رل مل جانے والا یہ خالص ہندوستانی حکمراں اتنا برا نہ ہوتا اگر اسے آج کے آئینہ میں دیکھنے کی مجبوری نہ ہوتی ...... آخر ہم کب تک تاریخ کو اس کے چوکھٹے سے ہٹا کر آج کی ڈھول سے اٹے ہوئے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے؟ کب تک ہم اپنے من گھڑت افسانوں کو آنے والی نسلوں کے لئے تاریخ کی صورت میں پیش کر کے انسانوں کو جانوروں کی طرح آپس میں لڑاتے رہیں گے؟'' (۳) اسی لئے شبلی لکھتے ہیں:

''اس عقدہ کا حل کرنا تاریخی فرض ہے۔'' (۴) شبلی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اور شعور کی

منزلیں طے کیں دراصل یہی دور تھا جب استعمار اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ ہندوستان کے استحصال اور انتشار کاری میں مصروف تھا۔

شبلی پہلے ہندوستانی مورخ ہیں جنھوں نے یوروپین مورخین کے ذریعہ استعمالی ماخذ جن کی بنیاد پر یورپین نے اورنگ زیب کی شبیہ ایک کٹرسنی مسلم بادشاہ کے بطور پیش کی تھی، کا استعمال کرتے ہوئے ایک نئی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی اور اورنگ زیب کو ایک کٹرسنی کے علاوہ بھی پیش کیا۔

جہاں تک شبلی کے نظریہ تاریخ وفلسفہ تاریخ کی بات ہے، شبلی 'الفاروق' میں رقم طراز ہیں: ''تاریخ کا نصب العین ان واقعات اور حالات کا پتہ چلانا ہے جن سے یہ دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گذشتہ زمانے سے کیوں کر بطور نتیجہ پیدا ہوا ہے۔'' (۵) شبلی ایسے مستقبل پر نظر رکھتے تھے جو ماضی سے ہم آہنگ ہو۔ شبلی کے نزدیک روایت اور روایات ملی بطور ورثہ منتقل ہوتی ہیں، ان کا خیال تھا کہ ہر قدم ماضی کی اساس پر ہونا چاہئے۔ (۶) شبلی کہتے ہیں کہ تاریخ لکھتے وقت دو باتوں پر نظر رکھنی چاہئے، [۱] جس عہد کا حال لکھا جائے، اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات درج کیے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب۔ ہر بات پر پورا زور دینا چاہئے۔ [۲] کوشش کرنی چاہئے کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔ (۷) واقعات کی درستی کو جانچنے کے دو طریقے ہیں روایت اور درایت۔ چونکہ مسلمانوں میں حدیث اور رجال کے علوم کی پوری نشو ونما ہو چکی تھی اس لئے ابتدائی مسلم تاریخ نویسوں نے روایت کے طریقے کو پورے طور پر تنقیدی انداز میں استعمال کیا، لیکن درایت کا طریقہ نظر انداز کر دیا گیا، درایت سے ان کی مراد مختصراً یہ ہے کہ عقل سلیم اور اصول عقلی کی روشنی میں واقعات کو جانچا اور ماخذوں کو پرکھا جائے، وہ اس بات کے بھی حق میں تھے کہ اصول اسباب وعلل کی روشنی میں واقعات کی ترجمانی کرتے وقت قیاس اور اجتہاد سے کام لینا چاہئے۔ (۸)

ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں کہ شبلی نے ہندوستان پر بہت کچھ نہیں لکھا اور اس ضمن میں بھی ایک نکتہ لائق توجہ ہے وہ دنیائے اسلام کو اپنا وطن اور اس کی تاریخ کو اپنی قومی تاریخ سمجھتے تھے،

'المامون' کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ اور تیموریہ کے کارنامے بڑی آب و تاب سے دکھائے گئے لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے۔'' (۹) یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان سے باہر اسلام اور اس کے کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا، ان کا رسالہ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر واحد کتاب ہے جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ پر لکھی، اس کے علاوہ ان کے چند مضامین اور ہیں مثلاً گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ، جہاں گیر کی توزک جہاں گیری، عبدالباقی کی مآثر رحیمی، زیب النساء، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر۔ (۱۰)

میرے پیش نظر علامہ شبلی کی تصنیف 'اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر' ہے جس میں انھوں نے اورنگ زیب پر عائد مختلف الزامات کا جواب ان ہی ہم عصر ماخذوں کی بنیاد پر دینے کی کوشش کی جس کو بنیاد بنا کر یوروپی مورخین نے اورنگ زیب پر عائد کیے ہیں، تمہید میں ہی علامہ شبلی نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ''تاریخ تحقیق طلب ہے اور بنا شواہد کے واقعات صداقت بے معنی ہے۔ (۱۱) ساتھ ہی تاریخ کی عمر قیامت کے دامن سے بندھی ہے۔'' (۱۲) شبلی اورنگ زیب اور شیواجی کے معاملے میں اس الزام کہ اگر شیواجی کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا تو وہ مطیع ہو جاتا؟ کا بڑا مدلل اور تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہیں، اور حقائق کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ یہ ناممکن تھا، کیوں کہ شیواجی کی پوری زندگی عیاری اور سازشوں سے پر تھی، وہ لکھتے ہیں کہ شیواجی کی تمام زندگی میں پابندی عہد کا کونسا واقعہ ہے۔ افضل خاں کا دغابازانہ قتل، بیجاپور اور گولکنڈہ کے ساتھ مکارانہ سازشیں، شہروں اور قصبوں پر غفلت اور بے خبری میں چھاپے مارنا کیا ان واقعات سے اس قسم کے نتائج کی امید ہو سکتی ہے۔'' (۱۳)

مرزا راجہ جے سنگھ کی کوششوں سے شیواجی کی سپردگی اور دربار میں پیشی بعدہٗ دربار سے اس کو پنج ہزاری منصب کا عطا ہونا جس کو الفنسٹن اپنی کتاب کے نوٹ میں تیسرے درجے کا منصب قرار دیتے ہیں، پر تبصرہ کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں کہ نامور مورخ کو معلوم نہیں کہ راجہ جے سنگھ کا خود

منصب اس وقت تک پنج ہزاری سے زیادہ نہ تھا، اس فتح عظیم کے صلہ میں جب اس کے منصب میں دو ہزار کا اضافہ ہوا تب جا کر وہ ہفت ہزار ہوا تھا۔ (۱۴) ساتھ ہی شبلی نے جہاں گیر اور شاہ جہاں کے عہد میں اس طرح کی مثالیں دیتے ہوئے کہ پانچ ہزاری منصب بڑے نامور راجپوت راجاؤں کو عطا ہوئے تھے، وضاحت کی ہے۔

اورنگ زیب اور شیواجی کے مابین نزاع کا تجزیہ شبلی نے بڑا مدلل کیا ہے اس معاملے میں شبلی کی تاریخی بصیرت اور استدلالی طریقہ کار پوری طرح عیاں رہے۔ اس میں کہیں دفاعی انداز نہیں پایا جاتا بلکہ بعد کے تمام جدید مورخین بھی اورنگ زیب اور شیواجی کے تعلقات کے سلسلے میں یہی رائے رکھتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جب اکبر متحدہ مغل ہندوستان کے بیچ ایک آزاد ریاست کے بطور چتوڑ کو برداشت نہ کر سکتا تھا جدید ہندوستان نے حیدر آباد اور کشمیر جیسی دیسی ریاستوں کو برداشت نہیں کیا تو اورنگ زیب کیسے مغل سلطنت کی سرحد کے قریب ایک ایسی طاقت کو قبول کر سکتا تھا جس کے شب خوں حملے مغل سلطنت پر ہو رہے تھے جس کی وجہ سے مغل سرحدیں انتشار کا شکار تھیں، سنبھا کا قتل بھی اسی سیاست کے مدنظر تھا، کیا آج کے زمانے میں ملک دشمن عناصر کو سزائے موت نہیں دی جاتی لیکن اورنگ زیب نے سنبھا کے بیٹے ساہو کے ساتھ عمدہ سلوک کیا، شبلی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اورنگ زیب نے مراٹھوں کے سلسلے میں ابتداء ہی کوئی ٹھوس پالیسی اختیار نہیں کی تھی، اور جب کی تو کافی دیر ہو چکی تھی، اس وقت تک مراٹھوں نے دکن میں کافی انتشار برپا کر دیا تھا، جس کا استیصال کرنے کے لئے اورنگ زیب کو اپنی حکمرانی کے نصف ایام دکن میں گذارنے پڑے تھے، علامہ شبلی کو اس بات کا احساس تھا کہ مرہٹہ ایک زندہ قوم بن رہے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ "مرہٹے شاہجہاں کے زمانے میں پوری قوت حاصل کر چکے تھے، دکن سے مدراس تک پھیل گئے تھے، سیکڑوں نہایت مضبوط اور سر بفلک قلعے ان کے قبضے میں تھے، ان سب باتوں کے علاوہ ایک زندہ قوم بن رہے تھے اور یہ ان کا عین عروج شباب تھا۔" (۱۵) شیواجی، سنبھا، راجہ رام اور سنتا کی موت کے بعد مرہٹے منتشر ہو گئے، شبلی لکھتے ہیں اب مرہٹے کوئی حکومت یا قوم نہ تھے، بلکہ خانہ بدوش راہزن تھے جو ادھر ادھر پھرتے تھے اور موقع پا کر یا چوری چھپے لوٹ مار کرتے تھے۔" (۱۶) جنھیں

دبانے کے لئے اورنگ زیب کو اپنی زندگی کا ایک حصہ نذر کرنا پڑا۔ اکبر اور اورنگ زیب کے درمیان یہ بھی ایک فرق تھا کہ اکبر کے دور میں راجپوت ایک زندہ قوم تھے اور اکبر نے ان کو اپنی حکومت میں شامل کر کے مغل سلطنت کے استحکام میں ان کی قوت کو استعمال کیا، مگر اورنگ زیب کے دور میں یہ کام مراٹھوں سے نہ لیا جا سکا۔

اورنگ زیب اور ہندوؤں کی ناراضگی کے عنوان سے لکھتے ہوئے شبلی نے لکھا ہے کہ ''یورپین مورخوں نے ہندوؤں کی ناراضگی کے جو اسباب بتائے ہیں ان میں خلط مبحث ہو گیا ہے یعنی مذہبی اور پولیٹکل باتیں مل گئی ہیں، اس لئے اس مسئلہ زیر بحث کی تحلیل و تحقیق ضروری ہے کہ دونوں سے الگ الگ بحث کی جائے۔ (۱۷) اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی مذہب اور سیاست کو یکجا کرنے کے قائل نظر نہیں آتے مگر وہ خود اورنگ زیب کو اسلامی حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ''عالمگیر کے ساتھ دکن کی مہمات میں بہت سے راجپوت راجہ شریک تھے، اور نہایت جانبازی اور وفاداری کے ساتھ خود اپنے ہم مذہب مراٹھوں سے لڑتے تھے۔ اور اگر آج اسلامی حکومت ہوتی تو آج بھی یہ ہوتا۔'' (۱۸) عالمگیر کو اگرچہ خلافت کا دعویٰ نہ تھا تاہم وہ مسلمان بادشاہ تھا اس کا فرض تھا کہ وہ حکومت میں اس قدر اسلامی شان باقی رکھے جس قدر ایک اسلامی حکومت کے لئے اصل عنصر کے لحاظ سے ضروری ہے۔'' (۱۹) یا ''مزاج میں سخت کفایت شعاری تھی یہ وصف حضرت عمر فاروقؓ کے جانشین کے لئے گو موزوں ہے لیکن شاہجہاں کے تخت پر بیٹھنے کے لئے کام نہیں آسکتا۔'' (۲۰)

دراصل اورنگ زیب ایک بادشاہ تھا اس نے اپنی سلطنت میں شریعت کے قوانین کے علاوہ ضوابط بھی بنائے اور عدل و انصاف اور قانون کو بنائے رکھنے کے لئے ایک طرف اس نے فتاوائے عالمگیری کو مدون کرایا تو دوسری طرف اس نے ہندو قوانین کو 'مت اچھرا' کے عنوان سے مدون کرایا تاکہ عدل و انصاف ممکن ہو سکے اور شہنشاہیت کے آمرانہ رویہ سے انحراف کیا نیز قانون کی بالادستی غیر راست طریقے سے قائم کرنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب کے بہت سے افعال کو شرعی کہا جا سکتا ہے جو اس کے مزاج کا حصہ ہو سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ تھا

جہاں اکثریت غیر مسلم عوام کی تھی اور روز اول سے ہی ہندو افراد کار حکومت کا حصہ تھے لہٰذا صرف مذہبی بنیاد پر حکومت ممکن نہ تھی، اسلام دراصل دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے مذہب کے ساتھ ساتھ دنیاوی وسیاسی اصول وضابطے بھی بیان کئے ہیں جو اپنے آپ میں مثال ہیں، بلکہ جدید دنیا نے بھی بہت سے معاملات میں اسلامی قوانین وشریعت سے رجوع کیا ہے، عہد وسطیٰ میں اس طرح کے قوانین کا فقدان ہونے کے سبب مسلمان بادشاہوں نے شریعت کی طرف رخ کیا لیکن جہاں مسلم عوام کے ساتھ دیگر اقوام اقلیت میں تھیں وہاں انھوں نے اسلامی قوانین پر کافی حد تک عمل کیا اور ضوابط بھی بنائے خاص طور پر مالگذاری اور محصول کے تعلق میں، خلافت راشدہ کے بعد ایسے ابواب کا نفاذ ہوتا رہا، ہندوستان میں مسلمان جب آئے تو اپنے ساتھ ان ہی محصولات کو لائے جن کی اصطلاحیں اسلامی تھیں مگر عملاً اسلامی جذبے کے ساتھ وصول نہ کئے جاتے تھے، بلکہ مقصد حکومت کے مالیات میں اضافہ کرنا تھا، اس لئے ہمیں ہر دور میں ایسے محصول نظر آجاتے ہیں جن کی اصل اسلامی نہیں ہے کیوں کہ بنیادی طور پر خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت قائم ہی نہ ہوسکی بلکہ شہنشاہیت اور ملوکیت کا قیام عمل میں آگیا تھا جہاں بادشاہ کی مرضی قانون کا درجہ رکھتی تھی، مگر عوام میں اپنی ساکھ بنائے رکھنے کے لئے اسلامی اصطلاحات کا جاری رکھنا ضروری تھا، تاکہ بوقت ضرورت مذہب کے نام پر جذبات کا استحصال کیا جاسکے۔

اورنگ زیب نے اگر ایک طرف کچھ ابواب کو ختم کیا جو غیر اسلامی تھے تو دوسری طرف اس نے مال گذاری کو اسی طرح وصول کیا جس طرح مغل سلطنت میں اس سے قبل وصول کی جاتی تھی یعنی کل فصل کا نصف جو اسلامی عشر وخمس سے مختلف ہے۔

راجپوت بغاوت دراصل مراٹھوں کی بغاوت تھی، راٹھوروں کے علاوہ دیگر راجپوت خاندان اورنگ زیب کے ساتھ تھے، شبلی نے راجپوت بغاوت کا تجزیہ بھی بڑے معروضی انداز میں کیا اور لکھتے ہیں: ”یورپین مورخ کہتے ہیں کہ ایک راجپوت نے بھی عالمگیر کی حمایت میں انگلی نہ ہلائی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صرف فوجی راجپوت بلکہ راجپوتوں کے بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اخیر وقت تک عالمگیر کے ساتھ فوجی مہمات میں شریک رہے اور مرہٹوں کو پامال کرنے میں وہ مسلمان

افسروں کے داہنے ہاتھ تھے۔" (۲۱) مراٹھوں کی بغاوت کا مفصل بیان ہم عصر مورخ ایشور داس ناگر فتوحات عالمگیری میں دیتا ہے اور کہیں بھی اورنگ زیب کی کاروائی کو مذہبی جذبے کے تحت بیان نہیں کرتا، جدید مورخین نے راٹھور بغاوت کے لئے ایشور داس کو سب سے اہم ماخذ تصور کیا ہے، ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کئے جانے کے الزام کا جواب شبلی نے بڑے مدلل طریقے سے دیتے ہوئے امراء کی ایک فہرست دی ہے کہ ہندو امراء کی تعداد اورنگ زیب کے عہد میں بڑھ گئی تھی نہ کہ کم ہوئی تھی، اور وہ بڑے اہم منصب داروں میں شمار ہوتے تھے۔ (۲۲) جب کہ واقعہ بھی یہی ہے، اطہر علی صاحب نے عہد اورنگ زیب کے ہندو امراء کی مکمل فرست تیار کی جس میں انھوں نے بھی ثابت کیا کہ اورنگ زیب کے پہلے دور حکومت ۱۶۵۸ء سے ۱۶۷۸ء تک پنج ہزاری اور اس سے اونچے درجے کے منصب داروں کی کل تعداد ۵۱ تھی جس میں ۱۰ ہندو حضرات تھے، سہ ہزاری سے چہار ہزاری پانصد کے منصبداروں کی کل تعداد ۳۴۵ تھی جس میں ۷۷ ہندو تھے اور دوسرے دور حکومت ۱۶۷۹ء سے ۱۷۰۷ء تک پنج ہزاری اور اس سے اونچے درجے کے منصب داروں کی کل تعداد ۷۹ تھی جس میں ۲۶ ہندو تھے، سہ ہزاری سے چہار ہزاری پانصد تک کے منصب داروں کی کل تعداد ۱۳۳ میں ۳۶ ہندو تھے اور ایک ہزاری سے دو ہزار ہفت صد کے منصب داروں کی کل تعداد ۳۶۳ تھی جس میں ۱۲۰ ہندو تھے، پہلے دور میں کل چھ سات ہزاری منصب داروں میں عمدۃ الملک مرزا راجہ جے سنگ اور مہاراجہ جسونت سنگھ اگر سات ہزاری منصب دار تھے تو دوسرے دور میں راجہ ساہو سات ہزاری منصب دار تھا، (۲۳) اس بحث میں شبلی اورنگ زیب کے جزیہ کے نفاذ پر بحث نہیں کرتے اور کہتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ "جزیہ کوئی ناگوار چیز نہ تھی بلکہ غیر قوموں کے حق میں رحمت تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں نے اس سے ناراضگی ظاہر کی۔" (۲۴)

ایشور داس ناگر فتوحات عالمگیری میں جزیہ سے متعلق لکھتا ہے کہ "ظل سبحانی نے عنایت اللہ خان کو جزیہ وصولی کی نگرانی کے لئے مقرر کیا ساتھ ہی اس کو یہ بھی حکم دیا کہ تمام سرکاری ملازمین جزیہ سے مستثنیٰ ہیں، ان کے علاوہ تمام ذمیوں سے سختی کے ساتھ شریعت کے مطابق جزیہ وصول کیا جائے، شریعت کے مطابق ایک امیر آدمی سے جس کی ملکیت ڈھائی ہزار روپے ہو اس سے کہا جائے

کہ وہ ۴۸ درہم جو ۱۳ روپئے کے برابر ہوتے ہیں ادا کرے، متوسط طبقے کے انسان جن کی ملکیت بحیثیت مجموعی ڈھائی سو روپئے ہو ان سے ۲۴ درہم جو ساڑھے چھ روپئے کے برابر ہوتے ہیں وصول کیا جائے اور غریب آدمی جس کی ملکیت ۵۲ روپئے ہو اور اپنے بیوی بچوں کو پالنے کے قابل ہو اس سے ۱۲ درہم جو تین روپئے چار آنے کے برابر ہوتے ہیں جزیہ وصول کیا جائے، اندھے، لنگڑے اور نادار مفلس لوگوں پر جزیہ نہیں لگایا جاتا، شاہی فرمان کے مطابق عنایت اللہ خان نے پورے ملک میں جزیہ وصول کرنے کے لئے متصدی مقرر کئے۔'' (۲۵) ایشور داس کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جزیہ تمام غیر مسلم رعایا پر عائد نہیں تھا اور نہ تمام لوگوں کے ساتھ سختی کا رویہ اپنایا گیا تھا، وہ لکھتا ہے کہ ''ناظم حیدر آباد نے اطلاع دی ہے کہ غربت کی وجہ سے حیدر آباد کے عوام جزیہ دینے سے قاصر ہیں جب ان سے جزیہ ادا کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ بھاگ جاتے ہیں، ظل سبحانی نے حکم دیا کہ ایک سال کا جزیہ محصول سیر وغیرہ اور دیگر ابواب نہ لئے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے گاؤں اور محال میں رہ کر کھیتی کریں اور اپنے اپنے پیشوں میں مشغول رہیں۔'' (۲۶) ایشور داس کے اس بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جزیہ وصولی کے سلسلے میں حکومت کا رویہ کافی نرم تھا، ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اورنگ زیب کے لئے زراعت زیادہ اہم تھی بمقابلے جزیہ کے، کیوں کہ زراعت سے ہونے والی محصول آمدنی ہی مغل حکومت کی معیشت کی اصل بنیاد تھی، لہٰذا اسے بچائے رکھنے کے لئے جزیہ کا معاف کیا جانا اس کے لئے چنداں پریشانی کا باعث نہ تھا، اورنگ زیب نے اگر ایک طرف جزیہ لیا تو دوسری طرف اس نے بہت سے ٹیکس معاف بھی کر دیئے جن پر عام طور پر مورخین نے بحث نہیں کی ہے، شبلی نے لکھا ہے کہ ''تمام سلاطین کے زمانے سے مال گذاری کے علاوہ بیسیوں ناجائز ٹیکس اور محصول جاری تھے، جن کی مجموعی تعداد مال گذاری کے برابر پہنچ جاتی تھی، مثلاً چنگی پانداری (مکان کا ٹیکس) سرشاری، برشاری، برگدی، طوقانہ، جرمانہ، شکرانہ وغیرہ وغیرہ، ان محصولوں کی تعداد ۸۰ تک پہنچتی تھی، اور ان کی آمدنی جیسا کہ قاضی خان نے لکھا ہے کروڑوں سے زیادہ تھی، عالمگیر نے یہ تمام محاصل یک قلم موقوف کر دیئے۔'' (۲۹)

شبلی اورنگ زیب کے ذریعہ مندروں کے انہدام کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

''الزامات عالمگیر کی فہرست میں یہ الزام سب سے زیادہ جلی حروفوں میں لکھا جاتا ہے، اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر عالمگیر نے امن واماں کی حالت میں اپنی رعایا کے بت خانے گرائے ہیں تو وہ اسلام کی حقیقت کو نہیں سمجھتا تھا، خلفائے راشدین سے زیادہ کون اسلام کا حامی ہو سکتا ہے انھوں نے سیکڑوں ہزاروں شہر فتح کیے، دنیا کے بڑے بڑے حصے ان کے زیر حکومت آئے جس میں ان کے ہاتھ سے کسی قسم کے معبد اور پرستشگاہ کو ٹھیس بھی لگی ہو، عالمگیر نے ان سب کے خلاف کیا تو بے شبہ اس خاص معاملے میں وہ اسلام کا جائز مقام نہیں ہے۔ (۲۸)

علامہ شبلی یہاں مندروں کے انہدام کا تجزیہ سیاسی اعتبار سے کرتے ہیں اور مذہب اور پالیٹکس کو الگ کر دیتے ہیں اور بنارس و متھرا کے بت خانوں کے انہدام کو اس علاقے میں ہندوؤں کو شورش کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھتے ہیں، متھرا میں نرسنگھ دیو بندیلہ کے تعمیر کردہ مندر جو ابوالفضل کی لوٹ سے بنوایا گیا تھا کا انہدام ہوا تھا جو بقول شبلی مسلمانوں کے مال سے بنا تھا۔ (۲۹) یہاں شبلی جواز میں جو واقعتاً اس علاقے میں جاٹوں کی شورش تھی کو پیش کرتے ہیں، جس کو بعد کے جدید مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے مگر شبلی ایک اضافی جملہ لگا دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے مال سے بنا تھا، یہ تضاد دراصل اس لئے نظر آتا ہے کہ ان کے لاشعور میں اورنگ زیب کی حکومت کا تصور اسلامی حکومت کا ہے یہ کشمکش ان کی کتاب میں کئی جگہوں پر نظر آتی ہے، حالانکہ انھیں اعتراف ہے کہ مغل حکومت اسلامی حکومت نہ تھی اور واقعہ بھی یہی ہے، ساتھ ہی وہ اس بات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ عالمگیر ۲۵ سال تک دکن میں رہا اور ان ممالک میں ہزاروں بت خانے موجود تھے لیکن کسی بھی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانے کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ (۳۰) شبلی اورنگ زیب کے ذریعہ مختلف مندروں کو دیئے گئے، عطیات کا تذکرہ نہیں کرتے ہیں۔

اورنگ زیب کے اپنے باپ اور بھائیوں سے معاملات کے تعلق سے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''اس کے اوصاف کا سب سے بدنما داغ ہے۔'' عالمگیر کے دامن پر بھائیوں کے خون کی چھینٹیں ہیں اور اس کے مظلوموں میں خود اس کا نامور باپ شہنشاہ بھی قید خانے کی کڑیاں جھیل رہا ہے، بے شبہ ہم کو نہایت ٹھنڈے دل سے بے رورعایت ان جرائم کی تحقیقات کرنی چاہئے اور بہت احتیاط رکھنی

چاہئے کہ میزان عدل کا پلہ طرف داری کے رخ نہ جھک جائے۔'' (۳۱) اس کے بعد انھوں نے ان کتب کی فہرست دی ہے جن کی بنیاد پر انھوں نے واقعات کا تجزیہ کیا ہے وہ ہیں عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری، منتخب اللباب، واقعات عالمگیری، سفرنامہ برنیر اور فیاض القوانین، وہ لکھتے ہیں: ''ان میں پہلی اور دوسری کتاب میں اگر چہ تفصیلی حالات ہیں اور وہ عالمگیر کی حمایت کے لئے زیادہ مفید ہے لیکن ہم اس لئے ان سے استشہاد نہیں کر سکتے کہ عالمگیر نامہ گویا خود عالمگیر کی تصنیف ہے اور مآثر کا وہ حصہ جس میں واقعات متنازعہ ہیں عالمگیر نامہ ہی سے ماخوذ ہیں۔ ان کتابوں سے ہم صرف ان موقعوں پر استشہاد کریں گے جہاں اور مورخین بھی ان کے ہم زبان ہیں، شیعہ وسنی کا تفرقہ کرنا اگر چہ ہم کو نہایت ناگوار ہے اور ہم ان دشمنان قوم کو نہایت کمینہ خصلت سمجھتے ہیں جو اسلامی فرقوں میں باہم ناگواری پیدا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعضوں نے ان کو معاش کا ذریعہ بنالیا ہے لیکن واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ عالمگیر سنی تھا اور اس کے تمام مورخین یعنی نعمت خان عالی، کاظم شیرازی، عاقل خان، خافی خاں شیعہ تھے، اس سے یہ غرض نہیں کہ ان مورخین کا بیان اختلاف مذہب کی بنا پر نا قابل اعتبار ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ ایشیائی مورخین کی طبیعتوں پر اختلاف مذہب کا خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے، اور سچ پوچھو تو یوروپ کے مورخین بھی اس اثر سے خالی نہیں صرف یہ فرق ہے کہ یوروپین مورخین جس حسن سے تعصب کا استعمال کر سکتے ہیں ایشیائی مورخ نہیں۔'' (۳۲)

اگر اختلاف مذہب کی بنیاد پر نعمت خان، کاظم شیرازی، عاقل خان، خافی خان وغیرہ کا بیان نا قابل اعتبار ہے تو پھر اس الزام سے شبلی بھی نہیں بچ سکتے کیوں کہ شبلی بھی سنی مسلمان ہیں، اور اورنگ زیب بھی کٹر سنی مسلمان تھا، حالاں کہ دیگر معاملات میں ان ہی مؤرخین کے بیانات کو شبلی بطور سند پیش کر کے اورنگ زیب کے مخالفین کے الزامات کی رد کرتے ہیں۔

شبلی لکھتے ہیں کہ ۱۷ر رمضان ۱۶۵۸ء/ ۱۰۶۸ھ کو عالم گیر نے شہزادہ محمد سلطان کو بھیجا کہ قلعہ شاہی پر جا کر قبضہ کرلے اور شاہ جہاں کی خدمت میں عرض کرے کہ حضور اب قلعہ سے باہر تشریف نہ لائیں، یہی آخر واقعہ ہے جو عالمگیر کے اخلاق مرصع کی سب سے بدنما تصویر ہے۔'' (۳۳) شبلی نے بڑی ایمانداری کے ساتھ اورنگ زیب کی اس غلطی کا اعتراف کیا ہے، شبلی لکھتے ہیں

کہ ''جب مراد اور شجاع نے اپنے اپنے صوبوں میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تب بھی عالمگیر نے کوئی کارروائی نہ کی بلکہ مراد کو خط لکھا کہ ابھی حضور اقدس زندہ ہیں۔'' (۳۴) مگر خود اورنگ زیب نے شاہجہاں کی زندگی میں ہی اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا، یہ تو کھلی بغاوت تھی کہ بادشاہ وقت زندہ ہے اور اس کے وکیل یا ولی عہد (دارا) سے جنگ ہو رہی ہے۔

علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ ''یوروپین مورخین عموماً لکھتے ہیں کہ عالمگیر نے مراد سے معاہدہ کیا تھا کہ سلطنت آپ کو یعنی مراد کو ملے گی میں دارا شکوہ کے استیصال کے بعد حج کو چلا جاؤں گا، برنیر صاحب لکھتے ہیں کہ اسی بنا پر عالمگیر ہمیشہ مراد کو حضرت کے لفظ سے خطاب کرتا تھا، خافی خان کے طرز تحریر سے پایا جاتا ہے کہ مراد کو سلطنت کی امید دلائی گئی تھی لیکن یہ ایک نہایت تاریخی غلطی ہوگی، بے شبہ تینوں بھائیوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا لیکن خافی خان اور یوروپین مورخوں نے اس کی تحقیق کرنے کی تکلیف گوارہ نہ کی کہ وہ معاہدہ کیا تھا، مرزا مراد نے اپنے خطوط میں جو عالمگیر اور شجاع کو لکھے ہیں جا بجا اس کا اشارہ کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ دارا شکوہ جب ہم میں سے کسی ایک پر چڑھائی کرے تو اور بھائی اعانت میں شریک ہوں۔'' (۳۵) اور پھر عاقل خاں کے حوالے سے تقسیم سلطنت کی بات کرتے ہیں اور مراد کے بادشاہ بنانے کے معاہدہ کو یوروپین کی صریح افترا و بہتان قرار دیتے ہیں، مگر شاید علامہ شبلی کی نظر سے فتوحات عالمگیری ورق ۱۷ الف، ب ۱۸ الف، ۳۱ الف، آداب عالمگیری جلد اول میں ۴۷۷ نسخہ دلکشا ورق ۱۲ اب، واقعات عالمگیری ۳۵، ۱۴، ۱۵ نظر سے نہیں گذریں جن میں اس معاہدہ اور اورنگ زیب و امراء کے درمیان خطوط و شرائط کی تفصیل درج ہے، یہ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ ''اورنگ زیب نے محمد مراد بخش کو تخت و تاج کا لالچ دیا اور لکھا تھا کہ میں خاموشی سے ایک کونے میں رہ کر رات دن خدا کی عبادت کروں گا، خدا کا فضل و کرم ہوا تو یہ میرے لئے سچی خوشی ہوگی، اورنگ زیب اور مراد بخش کے اجین میں ملنے کے بعد دونوں بھائیوں نے قرآن کی قسم کھا کر یہ طے کیا کہ تخت پر مراد بخش بیٹھے گا اور اورنگ زیب وزارت اور انتظامی امور کو سنبھالے گا، آداب عالمگیری میں دونوں بھائیوں کے مابین سلطنت کی تقسیم کا معاہدہ بھی موجود ہے، یہاں علامہ شبلی اس واقعہ کا مکمل و غیر جانب دارانہ تجزیہ نہیں کرتے ہیں۔

شبلی کے یہاں کچھ جگہوں پر تضادات بھی نظر آتے ہیں ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ''اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عالمگیر نہایت روکا پھیکا آدمی تھا، اس کو میلوں ٹھیلوں، ناچ رنگ، گانے بجانے، شراب کباب اور تمام ظاہر نمائش و تکلفات سے نفرت تھی، اور وہ سمجھتا تھا کہ ان چیزوں سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔'' (۳۶) حالانکہ اورنگ زیب وینا بجانے میں ماہر تھا۔ (۳۷) جوانی کے عالم میں اورنگ زیب زین آبادی کے عشق میں گرفتار ہوا اور بقول حمید الدین خان مؤلف احکام عالمگیری زین آبادی کے اصرار پر شراب تک پینے کو تیار ہو گیا تھا، نیز اورنگ زیب نے اپنے خالو سیف خان سے زین آبادی کو اپنے حرم سے ہیرا بائی کے عوض لیا تھا۔ (۳۸)

دیبال پور میں اورنگ زیب کے ہاتھوں جسونت سنگھ کی شکست کے بعد جب جسونت سنگھ اپنے وطن پہنچا تو علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ ''تاریخ میں یہ واقعہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ راجہ جب بھاگ کر وطن پہنچا تو اس کی بیوی نے اس کو اپنے پاس نہ آنے دیا اور تمام عمر کبھی اس سے ہمبستر نہ ہوئی کہ پیٹھ دکھانے والا میری ہم صحبتی کے قابل نہیں۔'' شبلی نے یہ بات خافی خان کی منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۴۳ کے حوالے سے نقل کی ہے جو صرف ایک بازاری خبر معلوم ہوتی ہے کیوں کہ یہ واقعہ ۱۶۵۸ء/ ۱۰۶۸ھ کا ہے اور راجہ جسونت سنگھ کی موت ۱۶۷۹ء/ ۱۰۸۹ھ کو ہوئی تھی جب کہ اس کے ایک ماہ کے بچے کو منصب نہ ملنے پر راٹھوروں نے بغاوت کی تھی، (۳۹) اگر واقعی ایسا تھا تو بچہ کہاں سے آ گیا، یہ زبردست تضاد ہے۔

علامہ شبلی دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے معاملات کے بعد دارا شکوہ کے قتل کے سلسلے میں عمدہ تجزیہ کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ''موافق و مخالف دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ دارا شکوہ اپنی بدتدبیری، خود رائی، کج طبعی کی وجہ سے اس قابل نہ تھا کہ تیمور کے تخت کا مالک ہوتا، اس سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ بھائیوں کی جنگ کی ابتدا اس کی طرف سے ہوئی اور عالمگیر، مراد شجاع کو مجبوراً اس کے حملوں کو روکنا پڑا، یہ بھی کچھ الزام کی بات نہیں کہ دارا شکوہ گرفتار کر کے دربار لایا گیا لیکن اعتراض یہ ہے کہ یہ بالکل ممکن تھا کہ وہ کسی محفوظ مقام پر نظر بند رکھا جاتا، وہ کتنا ہی برا سہی لیکن بھائی تھا اور بڑا بھائی تھا اگر عالمگیر اس کے خون سے ہاتھ رنگین نہ کرتا تو اخلاقی مرقع میں اس کی تصویر اس

قدر نفرت انگیز نہ ہوتی۔

بے شبہ یہ اعتراض بظاہر نہایت قوی ہے لیکن تیموری خاندان بلکہ تمام ایشیائی سلطنتوں میں مدعیان سلطنت قید اور نظر بند ہو کر بھی سلطنت کے منصوبوں سے دست بردار نہیں ہوتے اس کے ساتھ ان کے طرفداروں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اس وقت تک نچلا نہیں بیٹھتا جب تک نخل آرزو کے تمام رگ وریشے نہ کٹ جائیں۔(۴۰) آگے لکھتے ہیں کہ ''یہ قطعی ہے کہ دارا شکوہ جب تک زندہ رہتا سازشیں برپا رہتیں اور ملک کو امن وامان نصیب نہ ہوتا، اس لئے عالمگیر کو وہی کرنا پڑا جو خود اس کے باپ شاہجہاں سے اس کو ترکہ میں ملا تھا، شاہجہاں نے اپنے بھائیوں (داور بخش وشہریار) اور حقیقی بھتیجوں (ہوشنگ وغیرہ) کو قتل کرادیا تھا، عالمگیر کو بھی اس قسم کی بھینٹ چڑھانے کا حق تھا۔''(۴۱)

علامہ شبلی کو پورا احساس تھا کہ دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان ہونے والی جنگیں تخت شاہی حاصل کرنے کے لئے ہیں اور معاملات پوری طرح سیاست سے وابستہ ہیں، اس لئے وہ اورنگ زیب کے ذریعہ لئے گئے دارا کے ملحد ہونے کے متعلق فتویٰ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ایک مدعی سلطنت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

مراد کے معاملے میں شبلی لکھتے ہیں کہ ''مراد عالمگیر کا دست وبازو تھا، جسونت سنگھ کے معرکے میں اسی کی پامردی اور اندھادھند جانبازی نے دارا شکوہ کی فتح کا پانسہ الٹ دیا تھا، وہ ابتداء سے عالمگیر کا ہوا خواہ اور اطاعت گذار تھا، اور جو کچھ کرتا تھا عالمگیر کے تیور دیکھ کر کرتا تھا، ایسے جانباز اور مطیع کو عالمگیر کے ہاتھ سے یہ صلہ ملا کہ قید ہوا اور پھر قید زندگی سے آزاد ہو گیا۔''(۶۷) بقول شبلی خانی خان اس واقعہ کی تفصیل بہم نہیں پہنچا تا شبلی نے بھی عاقل خاں کے حوالے سے لکھا ہے جب کہ ایشور داس ناگر فتوحات عالمگیری میں اس واقعہ کو تفصیل سے تحریر کرتا ہے، شبلی بھی اس سچائی کا اعتراف اور تنقید ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''انصاف یہ ہے کہ عاقل خان کی تحریر کے موافق جس طرح مراد کو گرفتار کیا گیا یعنی عالمگیر نے اس کو درد شکم کے بہانے سے بلایا اور قیلولہ کرنے کے لئے جب وہ خوابگاہ راحت میں گیا تو ایک لونڈی بھیج کر اس کے ہتھیار منگوا لئے پھر شیخ میر وغیرہ کو بھیج کر

اس کو گرفتار کرالیا یہ ایک ایسا کام ہے جو پولیٹکل قانون کی رو سے گو جائز ہے اور گو مراد سے علانیہ جنگ کرنے میں ہزاروں کا خون ہوتا لیکن اگر عالمگیر اور خونریزیوں کی طرح اس کو بھی گوارا کرتے اور مراد پر تدبیر سے نہیں بلکہ شمشیر سے قابو پاتا تو ہم اس کی مردانہ روش کی زیادہ داد دیتے لیکن سچ یہ ہے کہ عالمگیر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خلیفہ منصور عباسی سے جس نے ابومسلم اصفہانی بانی دولت عباسیہ کو دھوکے سے بلا کر قتل کرادیا تھا، زیادہ مدح کا مستحق ہے۔'' (۴۳)

آخر میں شبلی نے اورنگ زیب کے کردار پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں ''باوجود ان تمام خوبیوں کے کے عالمگیر میں یہ بڑا عیب تھا کہ وہ اپنی ذاتی شجاعت اور استقلال کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اسی وجہ سے کسی کو وہ اپنا دوست نہ بنا سکا۔'' (۴۴) مرہٹوں کے تعاقب میں اس نے زائد از ضرورت اپنی کوشش صرف کی۔'' ''مزاج میں سخت کفایت شعاری تھی'' عالمگیر کی جو تصویر مخالفوں نے کھینچی ہے اس میں تو تمام تر تعصب اور عداوت کا رنگ بھر گیا ہے لیکن یہ کہنا بھی بالکل مبالغہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھا باوجود ان تمام خوبیوں کے جو اس میں تھیں ہم تیموری سلاطین کی فہرست میں وہی درجہ اس کو دے سکتے ہیں جو اسے ترتیب شمار کی رو سے حاصل تھا، تاہم عام اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص بھی پیدا نہیں ہوا۔'' (۴۵) یہ شبلی کی مورخانہ بصیرت و ایمانداری کا تقاضا تھا کہ وہ مندرجہ بالا خیالات کا واضح اظہار کریں، جادوناتھ سرکار بھی اورنگ زیب میں کسی بھی اخلاقی کمزوری کے فقدان کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں اور بہ حیثیت انسان اور حکمراں اس کی اہلیت اور اس کی سادگی کے معترف ہیں، اور اس کی صرف ایک غیر مذہبی کمزوری کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس کی حکومت کے انتظام میں پائی جاتی ہے وہ ہے اس کی حد سے متجاوز مرکزیت۔ (۴۶)

اورنگ زیب پر لکھتے ہوئے ہر شخص نے شعوری و غیر شعوری طور پر مذہبی تناظر کو پیش نظر رکھا ہے خواہ اورنگ زیب کی تنقید کی ہو یا دفاع کیا ہو، اورنگ زیب سے قبل بھی ہندوستان کے مسلم حکمراں عمومی زبان میں ''کٹر سنی مسلمان'' تھے مگر ان کے ساتھ مورخین نے ایسا معاملہ روا نہ رکھا جیسا کہ اورنگ زیب کے ساتھ کیا جاتا ہے، دراصل اس کے پیچھے وہ مغربی استعمار کام کر رہا تھا جس کا مقصد

ہندوستانیوں کو مختلف خطوط پر تقسیم کرنا تھا نیز اپنے عہد کو گذشتہ عہد سے افضل ثابت کرنا تھا تاکہ ان کے خلاف اٹھنے والی آوازیں متحد نہ ہوسکیں، واقعتا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برعظیم کے مسلمانوں میں شدید احساس بے چارگی پیدا ہوئی، ایک طرف ان کا شاندار ماضی تھا اور پر عظمت مغل سلطنت کے نشانات سارے برعظیم میں پھیلے ہوئے تھے اور دوسری طرف وہ معاشی سطح پر کنگال اور نفسیاتی سطح پر شدید احساس محرومی کا شکار تھے۔ یاد رہے کہ ۱۸۵۷ء میں سرسید احمد خاں کی عمر ۴۰ سال تھی اور شبلی نعمانی اسی سال پیدا ہوئے تھے۔تاریخ سے لگاؤ کا شبلی کا زمانہ مسلمانوں کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا ہے، اسی کشمکش کے دور میں حال کے تقاضے اتنے شدید اور مستقبل کے تقاضے اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا اور ماضی سے ولولہ حاصل کرنا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا بہت مشکل مسئلہ تھا، لیکن شبلی اس آزمائش میں پورے اترے۔" (۴۷)

شبلی نے نئی نسل کی ذہنی تربیت اس کی عظمت اور اس کی بنیادی فکر سے واقف کرانے کے مقصد سے مسلمانوں کی تاریخ کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق دوبارہ لکھا تاکہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اس تاریخ کو دوبارہ دلچسپی سے پڑھ سکیں، بقول شیخ محمد اکرم: "شبلی نے ہندوستانی مسلمانوں کو صحیح طور اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا اور یہ الفاروق، المامون، الغزالی، سیرۃ النعمان ہی کا فیض ہے کہ ہندوستان کے خواندہ مسلمانوں کو ان عظیم الشان شخصیتوں سے خاصی واقفیت ہے۔" (۴۸) یہی وجہ تھی کہ بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ: "انھوں نے ایسے لوگوں کی تاریخیں رقم کیں جو زمانے کی تقدیر تھے، وہ شخصی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی بجائے شخصی اعمال سے ظہور پذیر ہونے والے نتائج کو بیان کرتے ہیں، شبلی ایک مسلسل تاریخ نگار نہ تھے، ان کی نظر تاریخ کے چند نمایاں ٹکڑوں اور حصوں پر پڑتی ہے یعنی ساری تصویر کے بجائے چند نقطے۔ تاریخ کے صرف ان ہی چند نقطوں کو ابھار دینا ان کا واحد نصب العین تھا۔ علامہ نے کارلائل کے فلسفہ تاریخ سے استفادہ کیا ہے، کارلائل کے نزدیک محور تاریخ نامور اور غیر معمولی شخصیات ہیں جن کے افکار اور اعمال انسانی، تہذیب میں تغیرات برپا کرتے ہیں انقلاب لاتے ہیں، اور گوناگوں تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔" (۴۹)

شبلی کی معنویت آج کے دور میں بحیثیت مورخ اس لئے اور زیادہ ہوگئی ہے کہ وہ پہلے

ہندوستانی مورخ ہیں جنھوں نے اورنگ زیب کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا اور تقابلی و تجزیاتی مطالعہ کے ذریعہ اورنگ زیب کی ایک نئی شبیہ پیش کی۔ شبلی کے بعد اس نہج پر مارکسی اور جدید مورخین نے کام کیا جیسے اطہر علی صاحب نے عہد عالمگیر کے امراء کی مکمل فہرست پیش کرتے ہوئے ہندو امراء کی مکمل کیفیت پیش کی اور ستیش چندرا نے جزیہ کے نفاذ پر بڑا مدلل مقالہ تحریر کیا، حالاں کہ شبلی ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' میں واقعات کی تاریخی ترتیب و زمانی ترتیب کا خیال نہیں کرتے بلکہ ان کے ''ہیرو'' بادشاہ اورنگ زیب کے اوپر عائد الزامات کا جواب وہ اپنی تاریخی بصیرت کے ساتھ تاریخی تناظر میں دیتے ہیں، ساتھ ہی ان کے نزدیک ان الزامات کی نوعیت کی گمبھیرتا الگ الگ ہے اور اس کے مطابق ہی وہ اپنی ترتیب قائم کرتے ہوئے جوابات و جواز پیش کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی نے اورنگ زیب کے سلسلے میں انگریزوں کے پیدا کردہ بھرم کو حقائق کی روشنی میں توڑا ہے، تاہم، ہم شبلی کی تشریح و توضیح سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ شبلی نے بادشاہ اورنگ زیب کے مطالعہ کی ایک نئی جہت و سمت متعین کی تھی۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ: سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، لاہور، ص ۷۰۔

(۲) شبلی نعمانی: اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، طبع جدید، دہلی، ص ۴۔

(۳) ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد: اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر (اردو)، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۰ء

(۴) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، ص ۶۔

(۵) شبلی نعمانی: الفارق، طبع جدید، دہلی، ص ۳۸۔

(۶) مقالات یوم شبلی، مطبوعہ مسلم اکادمی، محمد نگر لاہور، ص ۱۲-۱۱۔

(۷) الفاروق، ص ۳۹۔

(۸) ایضاً، ص ۴۱-۴۰۔

(۹) شبلی نعمانی: المامون، قومی پریس لکھنؤ، ص ۲۔

(۱۰) محب الحسن: ہندوستانی دور وسطی کے مورخین (اردو) دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۹۹۔

(۱۱) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، ص ۴۔

(۱۲) ایضاً، ص ۳۱۔

(۱۳) ایضاً، ص ۳۴۔

(۱۴) ایضاً، ص ۲۹۔

(۱۵) ایضاً، ص ۴۶۔

(۱۶) ایضاً، ص ۴۷۔

(۱۷) ایضاً، ص ۵۰۔

(۱۸) ایضاً، ص ۶۱۔

(۱۹) ایضاً، ص ۱۲۵۔

(۲۰) ایضاً، ص ۱۳۵۔

(۲۱) ایضاً، ص ۶۰۔

(۲۲) ایضاً، ص ۶۸۔

(۲۳) محمد اطہر علی: اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء (اردو)، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۲۹۲، ۲۶۱، ۶۱۔ اکھلیش جائسوال: اورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ تعلقات، پٹنہ ۱۹۹۶ء، ص ۹۲-۹۱۔

(۲۴) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، ص ۷۰۔

(۲۵) فتوحات عالمگیری، ایشور داس ناگر، روٹوگراف نمبر R-۴۴ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ص ورق ۴۷ ب، ۵۷ الف۔

(۲۶) ایضاً، ورق ۱۱۲ الف۔

(۲۷) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، ص ۱۱۳۔

(۲۸) ایضاً، ص ۷۳۔

(۲۹) ایضاً، ص ۷۸۔

(۳۰) ایضاً، ص ۷۶۔

(۳۱) ایضاً،ص۸۰-۷۹۔

(۳۲) ایضاً،ص۸۱۔

(۳۳) ایضاً،ص۸۴۔

(۳۴) ایضاً،ص۱۰۳،۸۶-۸۵۔

(۳۵) ایضاً،ص۱۰۶۔

(۳۶) ایضاً،ص۷۱۔

(۳۷) ساقی مستعد خاں، مآثر عالمگیری، اردو ترجمہ محمد فدا علی طالب، کراچی ۱۹۶۲ء، ص ۷۰-۴۷، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۱۲۷۔

(۳۸) حمید الدین خان: احکام عالمگیری، اردو ترجمہ ڈاکٹر خالد حسن قادری، لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۳۳۔ شاہنواز خان: مآثر الامراء، جلد اول ص ۸۰۷، کلکتہ ۱۹۴۱ء۔

(۳۹) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، ص ۵۶۔

(۴۰) ایضاً،ص۹۸-۹۹۔

(۴۱) ایضاً،ص۹۹۔

(۴۲) ایضاً،ص۱۰۰۔

(۴۳) ایضاً،ص۱۰۲۔

(۴۴) ایضاً،ص ص۱۳۴۔

(۴۵) ایضاً،ص۱۳۵۔

(۴۶) جادو ناتھ سرکار، تاریخ اورنگ زیب، جلد پنجم، کلکتہ ۱۹۷۴ء، ص ۴۷۹-۴۷۵۔

(۴۷) مقالات یوم شبلی، ص ۱۳۔

(۴۸) شیخ محمد اکرام: موج کوثر، طبع جدید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۲۶۔

(۴۹) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ص ۱۶۵-۱۶۱۔

☆☆☆

سفرنامۂ روم ومصروشام - چند معروضات

عمیر منظر ☆

اردو سفرناموں کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو شروع سے اب تک سفرناموں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آتی ہے، اس فہرست میں یقیناً ایسے سفرنامے ہیں جو زبان و بیان کے خلاقانہ استعمال کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص مقصد ومنہاج کے دائرے میں خاص اہمیت کے حامل ہیں، اردو کے اولین سفرنامے کی حیثیت سے یوسف خاں کمل پوش کی کتاب ''عجائبات فرنگ'' امتیازی صفات کی حامل تو ہے ہی اس کتاب سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سفرنامہ نگاروں کے پیش نظر عموماً کیا کیا باتیں رہی ہیں، جنھیں ان کے لکھنے والوں نے خاص اہمیت دی ہے۔

خاص نقطۂ نگاہ سے لکھے ہوئے سفرناموں میں سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی نعمانی کے سفرنامے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں، یہاں سرسید اور آزاد کے سفرناموں سے قطع نظر ہم شبلی کے مشہور سفرنامے ''سفرنامہ روم ومصروشام'' کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرتے ہیں۔

شبلی کے سفرنامۂ روم ومصروشام کو ایک تعلیمی وتہذیبی مشن سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان کا مقصد نئی تہذیب اور معاشرے کو صرف دیکھنا ہی نہیں تھا بلکہ اپنے روشن ماضی کے آثار سے حال کی تعمیر کا فریضہ بھی انجام دینا تھا، جن مقامات کو شبلی اپنی مورخانہ بصیرت کے ذریعہ بہت پہلے دیکھ چکے تھے اب کھلی آنکھوں سے ان کا نظارہ کر رہے تھے۔ اس سفر کا مقصد بیان کرتے ہوئے شبلی نے لکھا ہے:

☆ Omair manzar@yahoo.com

"جس زمانے میں مجھے ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا تھا، اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے، وہ مقصد کے لئے کافی نہیں ہو سکتا، یہی خیال تھا جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی۔" (۱)

یہ عبارت شبلی کے وسعت مطالعہ اور ہندوستان میں موجود کتابوں سے باخبری کا واضح اعلان ہے، سفرنامے کے مطالعہ سے یہ یقین مزید مستحکم ہو جاتا ہے کہ انھیں نادر، اہم اور کمیاب کتابوں کی معلومات کس قدر تھی۔

شبلی کے اس سفر کا آغاز بمبئی سے ہوا، بمبئی سے عدن اور عدن سے سمرنا تک کے حالات اور واقعات کو مولانا نے جس شرح وبسط کے ساتھ رقم کیا ہے اس سے پورے بلاد اسلامیہ کی معلومات ہی نہیں حاصل ہوتیں بلکہ ان مقامات کی ایک ایک چیز آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتی ہے، تہذیب ومعاشرت، موسم، ماحول، عمارات اور تعلیمی وخانگی زندگی کے جملہ احوال وکوائف ہمیں اس طرح معلوم ہوتے ہیں گویا ہم نے خود انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اس مطالعہ سے قسطنطنیہ، بیروت اور مصر کی تعلیمی صورت حال، وہاں کے کالجوں، طلبا کے مزاج، ان کی علمی استعداد اور طرز بود وباش اور اس پورے تعلیمی نظام کا خاکہ سب کچھ مولانا صرف بیان ہی نہیں کرتے بلکہ جگہ جگہ ہندوستانی تعلیم گاہوں سے موازنہ کر کے خوبی وخامی کی طرف اشارہ بھی کرتے جاتے ہیں، اس سفرنامے کا سب سے روشن پہلو روم ومصر وشام کی تعلیمی صورت حال کی عکاسی ہے، ان ممالک کی تعلیمی زندگی، مسائل اور صورت حال پر تبصرہ کرتے وقت بالعموم ہندوستانی مسلمان شبلی کے پیش نظر رہتے ہیں، وہ جہاں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر خوش ہوتے ہیں وہیں ان کی تنزلی پر ماتم بھی کرتے ہیں، سفرنامے کے آئینے میں شبلی کی جو شخصیت نمایاں ہوتی ہے وہ ایک وسیع النظر اور حمیت پسند مسلمان کی ہے جو اپنے تعلیمی وتہذیبی ورثے پر فخر ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی بازیافت کے لئے کوشاں بھی نظر آتا ہے، سفر کی یہ ساری صعوبتیں صرف اسی لئے گوارا کی گئی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اور ان کی مذہبی وعلمی کارگزاریوں کے خلاف جاری ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر کے انھیں بے اثر کیا جا سکے۔ شبلی ایسے مورخ اور ادیب تھے جن کا دل اسلامیان عالم کی ہر تکلیف اور اتہام پر غیرت وحمیت سے لبریز ہوا اٹھتا تھا، یورپی مورخوں کے اسلام مخالف خیالات وافکار اور سازشوں سے شبلی

خوب واقف تھے، سفرنامے کے مقدمے میں ہی انھوں نے لکھا ہے:

یورپ نے کسی زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لئے تھے، ایک مدت تک وہ علانیہ اس طریقے سے ظاہر کئے جاتے تھے کہ مذہبی تعصب کا رنگ صاف نظر آتا تھا اور اس وقت قبول عام کا یہی باقاعدہ ذریعہ تھا لیکن جب یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہو گئے تو اس پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا، اب یہ طریقہ چنداں مفید نہیں سمجھا جاتا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھے جائیں بلکہ بجائے اس کے یہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قوموں، اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرائے میں ظاہر کئے جاتے ہیں اور عام تصنیفات، قصوں، ناولوں ضرب المثلوں کے ذریعہ سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ (۲)

ان الفاظ سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہیروز آف اسلام کے سلسلے کا مقصد محض تاریخ نویسی یا سیرت نگاری نہیں تھا، بلکہ اسلام کے روشن ماضی پر جو گرد و غبار کی دبیز تہہ جم گئی تھی، اسے ہٹانا اور صاف کرنا تھا تاکہ اسلام کی حقیقی صورت حال سامنے آ سکے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، شبلی کا یہ سفر اصلاً ایک تعلیمی سفر تھا، سفرنامے میں یہی پہلو سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، اس آئینے میں ہم بلاد اسلامیہ کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ شبلی کو حیرت اس بات پر نہیں ہے کہ مسلمانوں کے علمی خزانے سے اہل یورپ فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ افسوس یہ ہے کہ آج ہماری تعلیمی حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔ قسطنطنیہ کے ذکر میں شبلی نے ایک کلیدی نکتہ یہ پیش کیا ہے کہ حریت فکر حکومت کے زیر سایہ پروان نہیں چڑھ سکتی، انھوں نے یورپ کی ان دانشگاہوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن کے قیام میں حکومت کے بجائے اہل قوم کا حصہ ہے، انھوں نے لکھا ہے:

''اس سے بڑھ کر یہ افسوس کہ قسطنطنیہ کے تمام کالج اور دارالعلوم جن کا میں نے ذکر کیا ہے حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس طرف کچھ توجہ نہیں کی، یعنی اتنے بڑے دارالسلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گو کتنی مقتدر اور دولت مند ہو لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں، جس قوم

کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے، اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں۔ (۳)

شبلی کے تعلیمی مشن میں کشادگی اور وسعت فکر و نظر کو مرکزی اہمیت حاصل تھی، وہ قدیم علمی روایات کے یکسر اسیر بھی نہیں تھے مگر علم و دانش کے تازہ جھونکوں سے خود کو الگ کرنا بھی انھیں گوارا نہیں تھا، جدید و قدیم تعلیمی نظریات کے تناظر میں سفرنامے کا یہ اقتباس سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے:

> ترکوں میں تعلیم کا آغاز سلطنت کے ساتھ ہوا یہ وہی تعلیم تھی جس کو ہم آج قدیم تعلیم کے نام سے یاد کرتے ہیں ...... لیکن موجودہ تعلیم کی پستی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلے میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفرنامے میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی ......
>
> ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج و افسوس ظاہر کرتے ہیں وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے، میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے، اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقے سے جاری ہے وہ بالکل بے سود اور بے معنی ہے تو خواہ مخواہ رنج ہوتا ہے۔ (۴)

تعلیم کے قدیم و جدید نظریات پر شبلی کا موقف دانشمندانہ بھی ہے اور بہتر صورت حال کا غماز بھی ان دو نظریات کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے، ذہنی رویے اور طریقۂ عمل میں بھی یکسانیت ہے، البتہ قدیم و جدید کے امتزاج سے بہتر نتائج کی کوششیں ہنوز جاری ہیں مگر اب تک کوئی قابل ذکر تجربہ سامنے نہیں آسکا ہے۔

خارزار حیات کی ان دو پگڈنڈیوں کو ترقی کی عظیم شاہراہ میں تبدیل کر دینا اس قوم کے بس کا روگ نہیں جس سے قدرت نے غور و فکر جہد و عمل اور اجتہاد و استنباط کی صلاحیت چھین لی ہو، تہذیب اسلامی کے درخشندہ ستاروں نے اپنی ضیا پاشیوں سے زندگی کے ہر شعبے کو منور کیا ہے اور تابندہ راہ عمل کے نقوش چھوڑے ہیں مگر ہم آج تک ان کے نقوش پا کو اپنی جبیں کی خاک نہیں

بنا سکے، ہم عہد عباسی کی علمی ترقیات اور یورپ کے نشاۃ ثانیہ پر اپنے احسانات کا ڈھنڈورا تو خوب پیٹتے ہیں، مگر میدان عمل میں اپنے خوابوں کے تعبیری خاکے کے لئے ایک سیدھی لکیر بھی نہیں کھینچ سکتے، شبلی کے نظریۂ تعلیم اور ان کے احساسات کے مثبت رخ سے کسی کو انکار نہیں مگر محض ہمارے قومی مسیحاؤں کے تاثرات ہمارے درد کا مداوا نہیں بن سکتے، جس طرح محض اپنے دینی علوم کا تحفظ ہماری کامیابی کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔ دیوبند، ندوہ اور علی گڑھ کے قیام و استحکام کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں کسی بڑی تبدیلی کا سراغ نہیں ملتا، تاریخی تبدیلی قومی اور سرکاری سرحدوں کی پابند نہیں ہوتی، جذبۂ شوق اور جنون عمل کی محتاج ہوتی ہے، عہد عباسی کی علمی ترقیات اس کی واضح مثال ہیں، درج بالا اقتباس میں جو بات ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ شبلی کے رنج و غم کا سبب ہے "یہ تعلیم جس طریقے سے جاری ہے وہ بالکل بے سود اور بے معنی ہے تو خواہ مخواہ رنج ہوتا ہے"۔ دماغی اور روحانی قوتوں کی بقا کے لئے مادی اور کائناتی ضرورتوں سے دست کش ہو جانا عقل مندی نہیں ہے، شبلی بھی ایسا نہیں چاہتے تھے اور ان کے غم کا سبب بھی یہی ہے، شبلی کے پورے سفرنامے میں ماضی کی بازیافت کا شور سنائی دیتا ہے لیکن وہ جس نوعیت کی بازیافت چاہتے تھے وہ نہ علی گڑھ میں ممکن ہوئی اور نہ ندوہ میں، ہمیں شبلی کی اسی خلش کو اپنے راہ عمل کا چراغ بنانا چاہئے۔

سفرنامے میں شبلی نے ترکی، بیروت اور مصر کی جو تعلیمی زندگی پیش کی ہے وہ بہت تسلی بخش نہیں ہے، شبلی کی مایوسی کا کوئی ایک رخ نہیں ہے بلکہ یہاں کے اساتذہ، طلبہ اور نصاب تعلیم سب سے وہ مایوس ہوئے، تعلیمی نظام اور اقامتی طلبہ کے معمولات اور کتب خانوں کے ذیل میں شبلی نے جو کچھ لکھا ہے وہ بلاشبہ معلومات سے پُر ہے لیکن ان کے مطالعہ سے جو ذہنیت اور فکری میلانات کی جو مجموعی تصویر ابھرتی ہے وہ شبلی کے لئے اور خود ہم سب کے لئے بھی خوشگوار اثرات کی حامل نہیں، کہیں کہیں اگر کوئی بہتر صورت حال دکھائی دیتی ہے تو اسے ہم عام انسانی وصف پر محمول کر سکتے ہیں، اسے کسی کارنامے کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا، قسطنطنیہ کے مکتب حربیہ کی رپورٹ میں وہاں کے طلبہ کی خوش سلیقگی، اساتذہ کا اخلاق اور تعلیم کی متعدد شاخوں کے ذکر کے بعد شبلی لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ وسعت عمارت، فراہمی آلات علمی، وسعت تعلیم اور خوبی انتظام کے لحاظ سے تمام قسطنطنیہ میں اس سے عمدہ کوئی کالج نہیں ہے، البتہ یہ افسوس ہے کہ اس کی

اعلیٰ کلاسوں میں تعلیم پانے والے زیادہ تر عیسائی ہیں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔(۵)

ترکی کی علمی حالت، وہاں کے مصنفین، کتب خانوں، اخبارات ورسائل حکماء اور ائمہ فن کی تصنیفات کے ذکر کے بعد شبلی کا یہ تجزیہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلامی میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابتر اور ذلیل ہو گیا ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے اور جس قدر کہیں کہیں بچھ رہ گیا ہے، آئندہ اس کی بھی امید نہیں۔(۶)

جامعہ ازہر کے طلباء کے اخلاق کے بارے میں شبلی نے لکھا ہے:

''مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامعہ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی اور چیز سے نہیں ہوا...... لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے ...... طالب علموں کی دنائیت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے ہیں کہ براس سیدنا الحسین یعنی تجھ کو امام حسین کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت وشان بڑھائیں گے۔(۷)

یہاں کے نصاب کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''یہاں مستقل اور اصل طور پر صرف فقہ ونحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لیے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں۔ منطق، فلسفہ، ریاضی، اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی، بیان کی تعلیم ہے لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلوم کے کسی طرح شایان شان نہیں۔'' (۸)

اساتذہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''شیخ طبان حال میں ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کی ایک شرح ہے اس شرح کو اس قدر مہتم بالشان سمجھا گیا ہے کہ اس کی شرحیں اور شرحوں کے حاشیے درس میں داخل ہیں، اور اس تمام سلسلہ کا ضبط وحفظ کرنا بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے...... میں نے طلبہ سے

دریافت کیا کہ شیخ ازہر جو استاد الکل خیال کیے جاتے ہیں، ان کی کوئی تصنیف بھی ہے،
انھوں نے بڑے فخر سے کہا کہ ہاں صبان پر بڑے معرکے کے حاشیے لکھے ہیں۔"(۹)

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو شعر و ادب کے نگار خانے میں پہلی بار افادی تصور ادب کا کلیدی نکتہ پیش کیا گیا تھا، سرسید، حالی اور ان کے رفقا اس میں پیش پیش تھے، البتہ شبلی نے بزرگوں کے درمیان سے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا وہ مقصدیت سے اتنا لبریز نہیں تھا مگر سفرنامے کے مطالعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہاں شبلی نعمانی کی فکر اپنے بزرگوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، مقصدیت کا یہی تصور تعلیم کے راستے ترقی کی شاہراہ کو جاتا ہے لیکن ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے بعد کامیابی کی یہ شاہ کلید ہمارے ہاتھ نہیں آئی، تاریخ کے صفحات اس کے برعکس نتائج پیش کرتے ہیں، یہاں کسی بھی کامیابی کے پیچھے تعلیم کے بجائے قوت واقتدار کی کارفرمائی نظر آتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تعلیم کھاد اور پانی کا کام کر تو سکتی ہے زمین کا نہیں، یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا وظیفہ پڑھنے والے ان کی علمی کارگزاریوں کا ورد کرتے نہیں تھکتے، وہ ان کی بیداری میں عربوں کی احسان مندیوں کا ذکر تو کرتے ہیں مگر صلیبی جنگوں کے کلیدی کردار کو فراموش کر جاتے ہیں، اقتدار وسلطنت کی اسی لڑائی نے یورپ کو موقع فراہم کیا کہ وہ عروج وکامیابی کی راہ پر گامزن ہو۔

نہ صرف پوری اسلامی تاریخ بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور خلفائے راشدین کا عمل اس کا ثبوت ہے کہ تعلیم کبھی آغاز نہیں بن سکتی، تعلیم ایک نظام ہے اور کسی نظام کے قیام کے لئے اس میں تصرفات کے لئے، اسے اپنے رنگ میں ڈھالنے کے لئے قوت کی ضرورت ہے، اگر قوت نہیں ہے تو اس نظام سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ تعلیم ناگزیر ہے بقا کے لئے تحفظ کے لئے اور سلطنت ناگزیر ہے، عروج کے لئے تعلیم ایک مدافعانہ عمل ہے اور سلطنت جارحانہ، مدافعت زوال کی علامت ہے اور جارحیت شوق عروج کی، یہاں یہ واضح کر دوں کہ جارحانہ سے میری مراد وہ منفی عمل نہیں جو ظلم وتشدد پر منتج ہوتا ہے بلکہ یہاں اس سے میری مراد فعالیت سے ہے، ہمیں تاریخ میں کوئی ایسی قوم نہیں ملتی جس نے محض تعلیم کی بنیاد پر عروج وارتقا کی منزلیں سر کی ہوں، ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا عمل تب شروع ہوتا ہے جب حکومتوں کے تخت اس کے زیر نگیں آ جاتے ہیں، انفرادی اور جماعتی سطح پر تعلیم سے کامیابی تو حاصل کی جا سکتی ہے مگر قومی

اور تہذیبی سطح پر خود تعلیم کے مخصوص میدان میں بھی ہم عروج وارتقاء کے اعلیٰ مقام تک نہیں پہنچ سکتے، پیٹ بھر کھانا ملنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم خوش حال زندگی گزار رہے ہیں، اگر تعلیم ہی کامیابی کی شاہ کلید ہوتی تو کوئی ترقی یافتہ قوم زوال وانحطاط کا شکار نہ ہوتی۔ زندگی کے اور دوسرے مظاہر کی طرح یہ بھی ایک تہذیبی مظہر ہے۔ جس پر عروج وزوال کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں آخر یہ کلید کیسے ہوسکتی ہے۔

یہ شبلی کا وصف ہی قرار پائے گا کہ ہمیشہ ان کے افکار وخیالات کی نہ صرف بازگشت ہوتی رہی بلکہ حمایت ومخالفت میں معرکہ آرائیاں بھی ہوتی رہیں، حیات شبلی والے سید سلیمان ندوی ہوں یا شبلی نامہ والے شیخ اکرم، یہ شبلی کی شخصیت، سیرت اور جودت طبع کا خلاقانہ اظہار ہی تو ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق اخذ وقبول کی روایت پر گامزن ہے۔ بقول میر

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

حوالہ:

(۱) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۸
(۲) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۲
(۳) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۵۴
(۴) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۶۷
(۵) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۶۴
(۶) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۸۴
(۷) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۱۷۴-۱۷۵
(۸) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۱۷۵
(۹) سفرنامۂ روم ومصر وشام ص ۱۷۵-۱۷۶

☆☆☆

شبلی کی اردو نظمیں

سرفراز نواز☆

علامہ شبلی کو حیاتِ جاوداں عطا کرنے والی ان کی وہ کتابیں ہیں جو نثر میں لکھی گئیں، انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا، اس کو اپنے فکری شعور اور اجتہادی بصیرت سے ادب و انشاء کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا، یہی وجہ ہے ان کے علمی و ادبی کمالات کا یہ پہلو دنیا کی نگاہوں میں روشن رہا مگر ان کی شاعرانہ صناعی نظروں سے اوجھل رہی، شبلی بنیادی طور پر شاعر تھے مگر انھوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا اور نہ ہی اس کو اپنے لئے باعثِ عزت سمجھا۔ وہ عملی طور پر ایک متحرک اور فعال شخص تھے، ان کے پیش نظر قوم کے مسائل تھے، وہ قوم کی فلاح و بہبود اور علمی بیداری کے خواہاں تھے، وہ بڑی ہی دیانتداری اور نیک نیتی کے ساتھ علمی تحریکوں میں سرگرم رہے۔ مگر شاعرانہ طبیعت کی جولانی جب عود کر آتی تو نغمات کے سوز و گداز میں ڈھل جاتی اور شبلی خود کو روک نہ پاتے۔ انھوں نے علی گڑھ کے عظیم الشان جلسوں میں بیشتر نظمیں پڑھیں جو ان کی قومی ہمدردی اور فکر کی مظہر ہیں۔

مولانا نے شاعری کا آغاز فارسی شعر سے کیا۔ فارسی زبان پر ان کی گہری دسترس تھی، اور وہ فارسی زبان و ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے، اردو میں شعر گوئی محض تفریح طبع کے لئے اور منھ کا مزہ بدلنے کے لئے کرتے، ان کے فارسی اشعار کے مجموعے 'بوئے گل' اور 'دستِ گل' تو ان کی زندگی میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے تھے لیکن اردو شاعری مختلف رسالوں کے اوراق پر بکھری ہوئی تھی، دارالمصنفین نے ان کے اردو کلام کو یکجا کر کے 'کلیات شبلی (اردو)' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔

☆ شعبۂ انگریزی، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔

کلیاتِ شبلی (اردو) مثنوی، قصائد، غزلوں اور کچھ مذہبی، اخلاقی اور سیاسی نظموں پر مشتمل ہے، کلیات میں شامل نظمیں ہمیں خاص طور پر متوجہ کرتی ہیں۔ یہ نظمیں گو کہ مذہبی، اخلاقی اور سیاسی ہیں اور ان میں سے بیشتر عصری تقاضوں کے پیشِ نظر لکھی گئیں مگر ان میں فنی لوچ اور کمزوری کا کہیں گزر نہیں، شبلی کی وسیع النظری اور فنکارانہ بالادستی ان کے علم کے بحرِ بیکراں میں بہ صورتِ موج رواں جلوہ گر ہے، ان کی نظمیں سلاست، روانی اور اثر آفرینی کی کیفیات سے معمور ہیں، ان کی مثنوی 'صبحِ امید' قابلِ ذکر ہے، اگر ہم مثنوی کی روایت پر نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مثنوی کا مخصوص میدان حسن و عشق کی روداد سے مزین اور اس کی طلسماتی فضا میں مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی کے سوا کچھ نہیں، اردو کی مشہور مثنویاں سحرالبیان اور گلزارِ نسیم بھی اسی وصف کی غمازی کرتی ہیں، شبلی نے یہاں بھی اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مثنوی کی روایت سے انحراف کیا اور مثنوی کے دامن سے نیا مضمون باندھا، کلیاتِ شبلی کے مقدمہ میں سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

> ''اس وقت تک مثنوی صرف قصوں کہانیوں کے لئے تھی، ابھی تک اس کو قومی مقصد کے لئے کام میں نہیں لایا گیا تھا، بلکہ اب بھی وہ اس فیض سے گویا محروم ہی ہے، مولانا نے اس راہ میں پہل کی اور وہ چیز جو اب تک میر حسنؔ، مرزا شوقؔ اور پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی سحر بیانیوں سے صرف حسن و عشق اور سحر و طلسم کا تماشا گاہ تھی، وہ قومی ترقی و تنزلی کا عبرت انگیز منظر بن گئی۔'' (سید سلیمان ندوی، کلیاتِ شبلی (اردو) ص ۸)

یہ مثنوی مولانا نے اپنے قیامِ علی گڑھ کے دوران لکھی، اس مثنوی میں وہ قوم کی زبوں حالی کا تذکرہ بڑے پر درد لہجے میں کرتے ہیں، قوم کو اس کے ماضی کی شاندار تصویر دکھاتے ہیں، جب وہ اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور اپنی تمام تر فتوحات اور علمی کارناموں سے عالم میں نمایاں تھی مگر رفتہ رفتہ جب وہ غفلت، تعطل اور جمود کا شکار ہوئی تو اپنا وقار کھو بیٹھی، اور دنیا میں بے حیثیت ہو کر رہ گئی، ایسے عالم میں سرسید کی آواز بڑی حوصلہ افزا اور راحت بخش تھی، شبلی ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور قوم کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ سرسید کی انقلاب آفریں صدا پر لبیک کہے۔

مثنوی کا مضمون نیا ہے مگر دل پذیر اسلوبِ بیان، زبان کی لطافت اور تشبیہ و استعارات

کے حسن نے اسے وہ انداز عطا کر دیا ہے جو شبلی کا ہی حصہ ہے۔ مثنوی کی بحر وہی ہے جو مثنوی گلزار نسیم کی ہے۔ زبان و بیان کی تمام خوبیوں سے مالا مال، شبلی کے مخصوص لب و لہجہ کی غماز یہ مثنوی اپنا ایک انفرادی مقام رکھتی ہے۔

قوم کے تابناک ماضی اور اس کی شان اور شوکت و عظمت و جلال کے ذکر کے ساتھ مثنوی کا آغاز خوبصورت انداز سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی فتوحات اور علمی کارناموں کو اس طرح یاد کیا ہے:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام ☆ جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی ☆ جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال ☆ کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے ☆ قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر ☆ ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے ☆ اٹلی کو کنوئیں جھکا دیے تھے
با ایں ہمہ جاہ و شوکت و فر ☆ اقلیم ہنر بھی تھے مسخر
ہست میں بلند پایہ اس کا ☆ تھا فلسفہ زیر سایہ اس کا
منطق میں ہوا جو گرم جولاں ☆ تھامے تھے رکاب مصر و یوناں

پھر مولانا نے اس جمود کا نقشہ کھینچا ہے جو قوم پر اس طرح طاری ہوا کہ وہ اپنے سنہرے ماضی سے بے خبر ہو گئی اور خود اپنی صلاحیتوں کو فراموش کر بیٹھی اور زوال و انحطاط کا شکار ہو گئی:

اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے ☆ عیسیٰ کو تلاش چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے ☆ اک بوند کو ترس گیا ہے
اسلام کی جان پر بنی ہے ☆ دم توڑ رہا ہے جاں کنی ہے
ہر چند یہ ہو چکی تھی حالت ☆ ہم تھے وہی مستِ خواب راحت

....

وہ فلسفۂ کہن ہمارا ☆ گنجینۂ علم وفن ہمارا
وہ اوجِ کمالِ نکتہ دانی ☆ یعنی وہ مسائل معانی
معقول کو، فقہ کو، ادب کو ☆ ہم ہاتھ سے کھو چکے ہیں سب کو

سرسید کی سحر انگیز شخصیت کا خاکہ شبلی نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کھینچا ہے، ان کی سفید، لمبی داڑھی کو دمِ سحر چھٹکی ہوئی چاندنی سے تعبیر کرنا مولانا کے اسلوب کی چاشنی اور ان کی جمالیاتی حس کا بہترین نمونہ ہے۔

صورت سے عیاں جلال شاہی ☆ چہرے پر فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سفیدی ☆ چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم ☆ توقیر کی صورتِ مجسم

مولانا قوم کی ابتر حالت سے رنجیدہ خاطر تو ہیں مگر وہ مایوس نہیں ہیں، بلکہ وہ ہمہ وقت اس فکر میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ کس طرح سے امت مسلمہ کو خواب غفلت سے بیدار کیا جائے اور وہ عظمت وجلالت جو اس نے اپنی تساہلانہ زندگی، بے حسی اور تعلیم سے عدم توجہی کے نتیجہ میں کھو دیا ان کا حصول دوبارہ ممکن ہو سکے۔ وہ سعی پیہم میں یقین رکھتے ہیں، اور اپنے مسلک کی روایت کا پاس رکھتے ہوئے مایوسی کے گھنے اندھیرے میں بھی امید اور عزم کی شمع روشن رکھتے ہیں، انھیں قوم کے نوجوانوں کے سینوں میں وہ آب وتاب دکھائی دیتی ہے جو ذرا حوصلہ پا کر شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے اور نور کے مینار روشن کر سکتی ہے، ان کے اسلاف کا خون ان کی رگوں میں بیدار ہو جائے تو پھر چمن کے پھولوں کو سرخ روئی عطا کر سکتا ہے، اور ماحول کو عطر بیز کر سکتا ہے۔ مثنوی کا خاتمہ امید سے پُر ان خوبصورت اشعار پر ہوتا ہے:

گو دورِ فلک ہوا دگر گوں ☆ پھر بھی رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی ☆ اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش ہے وہی ☆ دن ڈھل گیا تپش ہے وہی
اس جام میں ہے شراب باقی ☆ اب تک ہے گہر میں آب باقی

گوخوار ہیں طرز و خو وہی ہے ☆ مرجھا گئے پھول، بو وہی ہے

شبلی کسی منظر، شخص، احساس یا واقعہ کی تصویر کو بڑی دلآویزی کے ساتھ خوبصورت الفاظ کے موتیوں میں پرو کر شاعرانہ حسن بخشنے کا ہنر خوب جانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی میں چاہے وہ مسلمانوں کے ماضی یا حال کی تصویر پیش کر رہے ہوں یا سرسید کی بارعب شخصیت اور ان کے کارناموں کا نقشہ کھینچ رہے ہوں، ان کی شاعرانہ فنکاری پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، یہ مثنوی سلاست وروانی، فصاحت وبلاغت، ایجاز واختصار، حسن ترکیب وبندش الفاظ کی خوبیوں سے آراستہ ہے اور بلاشبہ اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

شبلی نے اپنی شاعری میں انھیں مضامین کو جگہ دی جو ان کی طبع سلیم سے موافقت رکھتے تھے، اسی لئے ان کی شاعری اخلاقی قدروں کی ترجمان ہے۔ قوم وملت کی فلاح وبہبود کے راستوں کی تلاش وبازیافت کی صدا ان کے شعری آہنگ کا حصہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری صرف پند ونصائح کے دائرے میں سمٹ کر اپنا ادبی حسن اور وقار کھودیتی ہے، شبلی کی صناعی کا یہ کارنامہ ہے کہ روایت سے ہٹ کر انھوں نے شاعری اور ادب کو افادیت اور مقصدیت کے پہلو سے روشناس کرانے کے باوجود اس کے فنی تقاضوں پر آنچ نہ آنے دی، شبلی کی نظموں کے مطالعہ سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مولانا نے فنکارانہ مہارت کے ساتھ مواد اور ہیئت کے توازن کو برقرار رکھا اور اپنی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کیا۔

کلیات میں مثنوی کے بعد ہماری نظر چند مذہبی، اخلاقی اور سیاسی نظموں پر پڑتی ہے۔ مذہبی نظموں میں رسولؐ اور آل رسول کی زندگی سے کچھ واقعات شعر کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شبلی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے واقعاتی شاعری کی بنیاد ڈالی، اس سے پہلے اس نوع کی نظموں کی کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں ہے۔ کلیات میں چند مذہبی اور اخلاقی نظمیں بعنوان ''ہجرت نبوی''، ''تعمیر مسجد نبوی'' ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی اور رسولؐ ''مساوات اسلام''، ''عدل جہانگیری'' وغیرہ ہیں، ان میں سے کچھ نظمیں جیسے ''اہل بیت رسول کی زندگی'' ''مساواتِ اسلام'' اور ''خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ'' اپنی اثر آفرینی اور ڈرامائی کیفیت کے سبب

خاص توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ نظم "اہل بیت رسولؐ کی زندگی" سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال ☆ گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا

گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں ☆ چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار ☆ گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

مندرجہ بالا اشعار کس قدر سادگی اور سلاست سے پُر ہیں۔ سیدہ فاطمہؓ کی روزمرہ کی زندگی کا ایک واقعہ قلمبند کیا گیا ہے، مگر اسلوب بیان کی دلکشی کے ساتھ نظم میں ایک ڈرامائی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے جو نظم کے حسن میں اضافہ کرتی ہے، حضورؐ کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی کی محنت کش زندگی کا یہ منظر دلوں کو چھوتا ہے۔ محبوب الٰہی کی بیٹی اور اتنی مشقتیں! فاطمہؓ اپنے والد کے پاس عرضِ حال کے لئے حاضر ہوتی ہیں مگر شرم وحیا آڑے آتی ہے، بنا کچھ کہے واپس آتی ہیں، حضرت علیؓ کے ذریعے پیغام پہنچاتی ہیں۔ حضور فرماتے ہیں کہ تم سے بھی زیادہ مستحق لوگ موجود ہیں، مجھے پہلے ان کا انتظام کرنا ہے، یہ سن کر فاطمہؓ اپنی عرضی پر نادم ہوتی ہیں یہ تھا بیت رسولؐ کی زندگی کا ایک باب! قوم کی بیٹیوں کے لئے صبر و رضا کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے! شبلی نے اپنی اخلاقی نظموں میں ایسے ہی مضامین کو برتا جو دلوں پر اثر انداز ہوں اور ہمیں غور و فکر کی دعوت بھی دیں۔ آخری شعر میں پورے واقعے کو سمیٹ کر یوں پیش کیا گیا ہے:

یوں کی ہے اہل بیتِ مطہر نے زندگی ☆ یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

نظم "ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر" بھی متاثر کرتی ہے، جنگِ احد میں کافروں نے یہ خبر اڑائی کہ نعوذ باللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیے گئے، اس خبر سے متاثر ہونے والی ایک انصار خاتون کا واقعہ اس نظم میں بیان کیا گیا ہے۔ جب میدان جنگ کی خبریں ان تک پہنچیں تو معلوم ہوا کہ ان کے والد، خاوند اور بھائی میدانِ جنگ میں شہید ہوئے مگر خاتون کو اپنے نبی کی زیادہ فکر تھی اور وہ ان کے لئے زیادہ تشویش میں مبتلا تھیں۔ شبلی نے پورے واقعے کی بڑی دلآویز اور موثر منظر کشی کی ہے۔

اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا ☆ یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ امم

سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضورؐ ☆ گرچہ زخمی ہیں سروسینہ و پہلو وشکم

بڑھ کے اس نے رخِ اقدس کو جو دیکھا تو کہا ☆ تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہے سب رنج والم

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی، برادر بھی فدا ☆ اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

مندرجہ بالا اشعار واقعاتی شاعری کا حصہ ہیں مگر لفظوں کی فصاحت اور حسنِ ترتیب اور اسلوبِ بیان کے جادو نے ان کو وہ حسن عطا کیا ہے کہ اس سے بہتر منظر نگاری اور جذبات نگاری کی مثال اردو شاعری میں ذرا کم ملتی ہے۔

اخلاقی نظموں کے ذیل میں ایک اور نظم ''مساوات اسلام'' بھی قابل ذکر ہے، یہاں اسلام کے نظریۂ مساوات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ روایت بڑی اہم ہے کہ بلال حبشیؓ ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد مدینہ میں اپنے عقد کے خواہشمند ہوئے تو کسی نے ان کے حسب ونسب پر انگلی نہیں اٹھائی بلکہ نبی کے نزدیک ان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بہت سی دوشیزاؤں نے خوشی خوشی ان کی زوجیت میں آنے کے لئے رضامندی ظاہر کی۔

گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور ☆ جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر

عہدِ فاروقی میں جس دن کہ ہوئی ان کی وفات ☆ یہ کہا حضرتِ فاروق نے بادیدۂ تر

اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا ☆ اٹھ گیا آج نقیبِ چشمِ پیغمبر

ایک دوسری نظم 'خلافت فاروقی' کا ایک واقعہ بھی صحابہ کی زندگیوں کے روشن باب ہمارے سامنے کھولتی ہے۔ ان کے دورِ خلافت میں ملک میں قحط پڑا، امیر المومنین کی حیثیت سے ان کے دن کا سکون اور راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں، وہ ذمہ داری کے احساس اور اپنی بے بسی سے مجبور تصویرِ رنج وملال تھے، رات میں گشت کرتے۔ ایک دن ایک ضعیف العمر عورت چولہے پر کچھ پکاتی ملی جس کے کئی بچے بھوک کی شدت سے بے حال نظر آئے، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ بچوں کو بہلانے کے لئے اس نے پانی کا برتن چولھے پر چڑھا رکھا ہے، حضرت عمرؓ بے اختیار رونے لگے، فوراً سودا سلف منگایا خود بیٹھ کر چولھے میں آگ پھونکی اور بچوں کو کھانا کھلا کر لوٹے۔

اس طرح مولانا نے اپنی اخلاقی نظموں کے مضمون اسلامی تاریخ سے منتخب کئے، بلاشبہ

رسول اور صحابہ کی زندگیوں سے سنجیدہ اور معتبر مواد انھیں کہیں اور سے دستیاب نہ ہوتا، یہ ان کی ذہنی بالیدگی اور فکری تقدس کا شعور تھا جس نے ان کے قلم کو انسانی تاریخ کی اس روشن وادی کی سیر کرائی جو ہر آنے والے زمانے میں پوری عالم انسانیت کے لئے مشعل راہ ہے، یہ نظمیں صرف اپنی مقصدیت کے اعتبار سے ہی کامیاب نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارے شاعرانہ ذوق کی بھی تسکین کرتی ہیں اور فنی لحاظ سے بھی پختہ اور مضبوط ہیں۔

شاعر عام انسانوں کے درمیان ہی رہتا ہے مگر اس کا مشاہدہ عمیق ہوتا ہے، وہ اپنے گردوپیش کے ماحول سے مواد کشید کرتا ہے اور اسے اپنے اعلیٰ پروازِ تخیل کی مدد سے نئی اور خوبصورت شکل عطا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تلخ، ناگوار اور ناپسندیدہ مضامین بھی شاعری کے قالب میں ڈھلنے کے بعد صرف گوارا ہی نہیں بلکہ قابلِ انگیز بھی ہو جاتے ہیں، بعض شعراء اپنے عہد کے ہنگامی مسائل اور حالات سے بہ ظاہر بے غرض نظر آتے ہیں مگر ان کے کلام کا بین السطور مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ ان کی شاعری میں بلاواسطہ طور پر ہی سہی ان کے عہد کی دھڑکن موجود ہوتی ہے۔ کچھ شعراء نے کھل کر اپنے عہد کی نمائندگی کی اور اپنے دور کے سماجی اور سیاسی حالات کو شاعری کے آئینے مین دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔ یہ صحیح ہے کہ ہنگامی اور عارضی مسائل کی شاعری اپنے مخصوص عہد میں قبولیت حاصل کرتی ہے پھر رفتہ رفتہ اس کی معنویت اور دلکشی کم ہونے لگتی ہے مگر اس کے برعکس وہ شعراء جنھوں نے انفرادی تجربات کو آفاقی بنانے کا ہنر جان لیا وہ تغیر زمان و مکاں کے باوجود کبھی مایوس نہیں کرتے، علامہ شبلی بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دور کی سیاسی بے اعتدالیوں اور سماجی انتشار سے متاثر ہو کر انھوں نے جو نظمیں لکھیں وہ ان کے ذاتی غم کا اظہار قطعی نہیں ہیں مگر ان کی طبیعت میں وہ سوز و گداز تھا جو قومی غم کو بھی شخصی غم کے احساس کے برابر کر دیتا تھا۔ ان کی یہ تڑپ اور غم کسی واقعہ سے تحریک پا کر شاعری کے پیکر میں ڈھلتا تو روح کی گہرائیوں تک اتر جاتا اور سب کو بے کل کر دیتا۔ احساس کی یہی شدت شبلی کی سیاسی نظموں کو وہ لافانی رنگ عطا کرتی ہے جو انھیں وقت کی حد بندیوں سے نکال کر ہر دور میں دھڑکنے والے حساس دلوں کو مضطرب کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ ان نظموں کا خاص وصف شاعر کا وہ پرخلوص لہجہ ہے

جو قاری کو اس کا ہمنوا بنا لیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کا سیاسی اور سماجی منظرنامہ تبدیل ہوا۔ انگریزی حکومت کی قلعی کھلنے لگی۔ اس حکومت کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ رسائل، جرائد اور اخبارات میں سرکار کی بے اعتدالیاں بے نقاب ہونے لگیں۔ شعراء، ادباء اور صحافیوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر ان پر طنز و تعریض کے نشتر برسائے۔ ایسے وقت میں شبلی کی سیاسی نظمیں سامنے آتی ہیں۔ شبلی نے اعتدال کی راہ اپنائی۔ ان نظموں میں احتجاج کا رنگ ہونے کے باوجود جذبے کا ابال نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کی متانت اور سوز و گداز ملتا ہے۔

مولانا کی سیاسی نظموں میں ''شہر آشوب اسلام'' خصوصی توجہ کی حامل ہے۔ ہنگامۂ طرابلس و بلقان نے سارے عالم اسلام کو متاثر کیا۔ ان کی بازگشت ہندوستان میں بھی پہنچی۔ ترکوں سے مسلمانانِ ہند کا ایک مذہبی تعلق اور جذباتی لگاؤ تھا۔ لہٰذا ترکوں کی شکست و ریخت اور بربادی خود ان کی ذاتی بربادی کے مترادف تھی۔ وہ ان کے رنج والم میں پوری طرح شریک تھے۔ شبلی کے حساس دل نے اس غم کی تپش کو جذبات کی شدت میں پگھلا کر شاعری کی روح میں اس طرح داخل کر دیا کہ وہ آفاقی غم بن کر تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو گیا۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کبتک ☆ چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کبتک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے ☆ فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کبتک

مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے ☆ کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کبتک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے ☆ اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کبتک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشہ دیکھنے والے ☆ یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کبتک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے ☆ یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کبتک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو ☆ یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کبتک

یہ جوش انگیزئ طوفانِ بیداد و بلا تا کے؟ ☆ یہ لطف اندوزئ ہنگامۂ آہ و فغاں کبتک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ☆ ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کبتک

یہ بات شبلی کے لئے باعثِ تشویش تھی کہ ایک ایک کر کے اسلامی حکومتوں کے مراکز کرۂ ارض سے مٹ رہے تھے۔ ایسی حالت میں انھیں قوم کا مستقبل غیر محفوظ اور تاریک نظر آیا اور ان کا دل تڑپ اٹھا۔ جذبے کی صداقت اور احساس کی گہرائی کا بے ساختہ اظہار ہی اس نظم کو وہ اثر آفریں لہجہ بخشتا ہے جو ہمارے دلوں کو چھوتا ہے۔

'ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں' بھی ایک اہم نظم ہے۔ ۱۹۱۲ء میں مچھلی بازار کان پور کی مسجد کی دیوار بہ حکم سرکار منہدم کردی گئی جس کے ردعمل میں شہر کے مسلمان مشتعل ہو گئے اور انھوں نے زبردست احتجاج کیا۔ عوام اور پولیس کے مابین تصادم میں بہت سے بے گناہ مسلمان شہید ہوئے جس میں بوڑھے اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ نظم پوری طرح سے ایک ہنگامی صورتحال کی روداد ہے اور معصوم بے گناہوں پر پولیس کے ظلم وتشدد کی منظرکشی کرتی ہے۔ شبلی نے اس حادثۂ خونین کی اتنی سچی تصویر پیش کی ہے کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم خود جائے حادثہ پر موجود رہے ہوں اس دردناک واقعے کے چشم دید گواہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس حادثہ کے بہت دنوں کے بعد بھی یہ نظم ہر خاص وعام کی زبان پر تھی اور آج بھی ہمیں اسی طرح متاثر کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر ☆ لذت شناسِ ذوق دلِ ناصبور ہیں

کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا ☆ جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا ☆ 'ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں'

اسی واقعے کی مزید تفصیل بہ عنوان 'علمائے زندانی' پیش کی گئی ہے۔ اس موقع پر علماء کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ شبلی کو افسوس تھا کہ وہ اس وقت بمبئی میں ہونے کے باعث شہادت سے محروم رہ گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا شمار بھی قوم کے شہیدانِ وفا میں ہوتا۔ اس نظم کا یہ شعر تو زبانِ زدعام ہو گیا۔

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

اس طرح علامہ شبلی نے واقعاتی شاعری کو ایک نیا حسن بخشا۔ اپنے اسلوب کی دلکشی

اور جادو بیانی، اپنے پروقار لب و لہجے کی سادگی و متانت اور لفظوں کی حسن ترتیب کے جوہر سے انھیں مزین کر کے ایک جداگانہ مقام عطا کیا۔

مولانا نے طنزیہ رنگ کی شاعری میں بھی اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ مگر ان نظموں کے مضمون بھی کسی نہ کسی واقعے سے اخذ کئے گئے ہیں۔ کیوں کہ مولانا نے شاعری کا دامن شہرت اور مقبولیت کی غرض سے نہیں پکڑا بلکہ ان کے پیش نظر قوم کی اصلاح تھی۔ یہ الگ بات کہ شاعرانہ مزاج کے حامل ہونے کی وجہ سے ان کے احساسات کا موثر اظہار شاعری میں ہوا۔ اس نوع کی مشہور نظم 'جنگ یورپ اور ہندوستانی' ہے۔ طنز و مزاح کی چاشنی سے پُر یہ نظم ہماری طنزیہ شاعری کے سرمائے میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

اک جرمنی نے مجھ سے کہا ازراہِ غرور ☆ آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم ☆ اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل ☆ آئین شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعوئ غرور ☆ دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمن سے دس گنے ☆ تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور ☆ پھر وہ کہا جو لائق اظہار بھی نہیں
"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ☆ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

اس کے علاوہ مولانا نے قصیدے بھی لکھے مگر اس صنف سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ مولانا کے قطعے بھی خوب ہیں۔ اپنی برجستگی اور معنوی لطافت کی خصوصیات کے سبب یہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ قطعے مولانا نے مختلف مواقع پر کہے۔ شبلی کو سرسید کی کانگریس کی مخالفت پر اعتراض تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سرسید نے کانگریس کی مخالفت انگریزوں کے اثر سے کی۔ اس سلسلے کا یہ قطعہ مشہور ہے:

کوئی پوچھے تو کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

اپنی دیگر تصانیف کی تکمیل کے بعد جب انھوں نے سیرت النبی لکھنا شروع کیا تو اپنے احساسات کی ترجمانی بڑے ہی خوبصورت انداز میں اس قطعہ کے حوالے سے کی:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی ☆ مجھے چندے مقیمِ داستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبر خاتم ☆ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

دنیائے علم و ادب میں شبلی جیسی جلیل القدر شخصیت کم ہی ملے گی۔ ان کی جامع شخصیت کا ایک پہلو ان کی شاعرانہ فنکاری بھی ہے۔ شبلی کا یہ امتیاز رہا ہے کہ انھوں نے جس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اسے اپنی صلاحیتوں اور جوہر سے صرف تقویت ہی نہیں بخشی بلکہ ان میں نئے پہلو کے امکانات بھی روشن کیے۔ ان کی نظمیں اپنی اثر آفرینی اور اعلیٰ فنکاری کی بدولت اردو ادب کا بہترین سرمایۂ ناز ہیں۔ ان نظموں میں وہ آفاقی عناصر موجود ہیں جو ہر آنے والے دور میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کو محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

☆☆☆☆

مولانا شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار
اور
عہد حاضر میں ان کی معنویت

احمد☆

تاریخ ہند میں سن اٹھارہ سو ستاون سلطنت مغلیہ کے مکمل زوال اور برطانوی استعماریت کے استحکام کا انقلاب آفریں سال تھا، انقلاب ۱۸۵۷ء کے اسی ہنگامہ خیز سال میں مولانا شبلی نعمانی کی ولادت ہوئی، انیسویں صدی کا یہ نصف آخر ہماری، سیاسی، سماجی، معاشی، قومی، تعلیمی اور ملی تاریخ میں اتھل پتھل کے لیے کافی اہمیت کا حامل رہا ہے، اسی عہد میں مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، علوم وفنون، تعلیم وتربیت کے تحفظ اور بقا کا حل قدیم وجدید تعلیم کے سنگم میں تلاش کیا جارہا تھا، جدید تخیلات سے لیس ایک دانشور طبقہ نمودار ہوا، شبلی اسی فکری دبستان کی ایک ممتاز علامت بن کر نمودار ہوئے۔

شبلی کی ہمہ جہت شخصیت کے ہر پہلو پر مزید تحقیق اور نئے انکشافات کی ضرورت ہے:

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

کے مصداق ان کی خدمات کے اعتراف کے لیے ایسے علمی سمینار قابل تحسین ہیں۔

شبلی نعمانی ملک وملت کی ان قدآور شخصیات میں سے ایک تھے جنھوں نے ہماری سیاسی،

☆ ریسرچ اسکالر، شعبۂ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

فکری، عملی اور خصوصاً تعلیمی بقا اور ترقی کے لیے نہ صرف جدوجہد کی بلکہ پوری زندگی ہمہ تن مصروف عمل رہے، ان کے اصلاحی اور تعلیمی نظریات کے نقوش ان کی تحریروں اور تقریروں اور اشعار میں نمایاں ہیں۔

وہ بیک وقت مورخ، مفکر، شاعر، ادیب، نقاد، دردمند قوم وملت بھی کچھ تھے، ان کی تصنیفات وتالیفات سے ہر طبقہ اور ہر مزاج کے صاحب بصیرت نے استفادہ کیا، ان کی قابلیت، علمیت، ذہانت وفطانت اور شوق مطالعہ کی دلیل ان کی وہ تصنیفات وتالیفات ہیں، جنھیں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہو چکا ہے، انھوں نے کبھی فلسفہ اور تاریخ کو موضوع سخن بنایا، تو کبھی تحقیق وتنقید کی فصیلوں پر کمندیں ڈالیں اور کبھی شعروسخن کی محفلوں میں نغمہ ریزی کی اور کبھی مصلح قوم اور مفکر ملت کی طرح قوم کے جیالوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا، ان کی علمی صلاحیت، ان کا استدلالی طرز بیان، محققانہ بصیرت، مورخانہ تلاش وجستجو، فلسفیانہ انداز فکر، تنقیدی گیرائی، انشاپردازانہ سادہ بیانی اور شاعرانہ طرز کلامی میں حد درجہ جاذبیت اور کشش تھی، جو ان کے معاصرین میں بہت کم لوگوں کے یہاں نظر آتی ہے، ان کی عبقری شخصیت کی جامعیت کا اعتراف ہر طبقہ کے مفکرین نے کیا ہے نیز ان کی تصنیفات وتالیفات ہر صاحب بصیرت کے لیے مشعل راہ رہی ہیں، انھوں نے جدید اور قدیم کے دھاروں کو باہم دست وگریباں کرنے کی سعی پیہم کی، بلاشبہ شبلی نعمانی ہماری تعلیمی تحریک کا ایک روشن مینار رہے ہیں۔

شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار کا سب سے نمایاں پہلو ان کی مذہبی تعلیمات میں نظر آتا ہے، وہ قوم کے سامنے ایسا کردار پیش کرنا چاہتے تھے جو ان کے عقیدے اور عمل کو صحیح سمت دے سکیں، نوجوانوں کے ضمیر میں تعلیمی احساس جگانا اور قوم وملت کے نونہالوں کے دل میں خودی کا جذبہ بیدار کرنا اور اس اجتماعی شعور کو اسلامی خطوط پر تشکیل دینا شبلی کے تعلیمی تصور کا غماز تھا، جہاں وہ ملک وملت کے نوجوانوں کو ایک طرف اپنے جاندار وشاندار ماضی کے اقدار اور اس کے تزک واحتشام کی یاد دلانا چاہتے تھے وہیں ان میں جدید اور قدیم کے خوبصورت امتزاج سے باطل کے طوفانوں کا رخ پھیر دینے کا حوصلہ بھی بھر دینا چاہتے تھے۔

شبلی کے تعلیمی نظریہ کی انفرادیت یہ تھی کہ اسلامی طرز تعلیم کے تربیت یافتہ ہونے کے

باوجود دوسرے علماء کی طرح دنیا کے حالات وواقعات سے بے خبر نہ تھے، نہ ہی مغربی تعلیمات سے متاثر اور مغرب زدہ ہی تھے بلکہ دونوں کے یکساں حصول کے علم بردار۔ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک دینی علوم کی اولیت کے قائل تھے، دراصل مغربی تہذیب سے متاثر ہوکر مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ دانشور طبقہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ دنیاوی علوم وفنون اور سیاسی تدابیر سب مغرب کا ہی حصہ ہیں، غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری کا یہ خطرناک تصور قوم کو کس راستہ پر گامزن کرتا اس کا شبلی کو بخوبی احساس تھا، یہی وجہ ہے کہ عصری علوم کے حصول کے ساتھ وہ دینی تعلیم کے حصول کو ہمیشہ فوقیت دیتے رہے۔(۱) اور خیر الامور اوسطہا کے پابند عمل رہے۔

اس کی دلچسپ وجہ یہ تھی کہ شبلی کو علی گڑھ کالج کے انگریزی جاننے والے طلبہ کے اسلام سے دور ہوتے ہوئے کردار نے انھیں دل برداشتہ کردیا تھا، لہٰذا انھوں نے نئی نسل کو اسلام سے بہرہ ور کرنے کے لیے ندوۃ العلما اور دار المصنفین جیسے اداروں کی تاسیس کی فکر کی اور عصری علوم کے لیے نیشنل اسکول قایم کیا، ساتھ ہی ساتھ مدرسوں کے قدیم فرسودہ نظام تعلیم اور نصابوں میں بھی عصری علوم کی تعلیم کی گنجائش کی فراہمی کا جواز پیش کیا، آج کے جدید سائنسی ترقیاتی عہد میں ان کی اور زیادہ ضرورت ہے۔

دینی تعلیمات کی طرف میلان شبلی نعمانی کے تعلیمی نظریہ کا اہم پہلو تھا، علی گڑھ کالج میں رہ کر انھوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ جدید تعلیم کے ساتھ روشن خیالی کے پردہ میں چھپی ہوئی مذہبی بیزاری بھی آرہی تھی اور چونکہ بنیادی طور پر پہلے وہ عالم دین تھے لہٰذا اس کے لیے کسی خاص طریقہ کار کو اختیار کرنے کے لیے فکرمند تھے، اگر چہ سرسید نے علی گڑھ کالج میں جدید تعلیم کے ساتھ قدیم مذہبی تعلیم کا بھی اہتمام کیا تھا اور قدیم تعلیم کے لیے دیندار لوگوں کا تقرر بھی کیا تھا نیز جدید وقدیم کے اختلاط سے یہ کوشش کی گئی تھی کہ قدیم سرمایہ تعلیم مذہب اور دین کی مدافعت میں معین ومددگار ثابت ہوگا اور جدید علوم میں واقفیت اور مہارت دنیاوی معاملات کی ترقی میں معاون ہوگی لیکن جدید علوم وفنون کو اولیت حاصل تھی جس سے کسی نہ کسی حد تک سرسید بھی مطمئن نہ تھے،(۲) جب کہ شبلی قدیم تعلیم کی فوقیت کے حامی اور قائل تھے۔

حیات شبلی پر تبصرہ کرتے ہوئے آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ''شبلی بھی سرسید کی طرح نئے

حالات اور نئی ضروریات سے متاثر تھے وہ علوم جدید کی تعلیم کے حامی تھے، یورپ کی ترقیوں کے مداح تھے، سرسید کا خیال یہ تھا کہ اس علمی تحریک کی بنیاد مغرب کے طبیعاتی علوم پر رکھنا چاہیے، وہ قدیم خیالات کے لوگوں سے قیادت چھین کر نئے لوگوں کے ہاتھوں میں دے دینا چاہتے تھے، شبلی خود ایک قدیم دبستان سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان کے ذہن میں ترقی اور نشوونما کی صلاحیت تھی، علی گڑھ نے شبلی کو بہت کچھ دیا، انگریزی کی تعلیم اور علوم جدیدہ کی تعلیم کی اہمیت کا انھیں اندازہ ہوا مگر ان کا مشن یہ تھا کہ قیادت حالات سے باخبر اور حریت پسند عالم کریں۔'' (۳)

غالباً باخبر اور حریت پسند عالم سے مراد اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور یا مفکر سے نہیں بلکہ ایسے علماء سے ہے جو دنیا کو بتا سکیں کہ نظریہ اضافیت، کشمکش ثقل اور نباتات وحیوانات میں ارتقاء سب کچھ کہیں نہ کہیں استعاروں اور کنایوں میں قرآن کریم میں موجود ہے۔

شبلی نے ایسے علماء کی تعلیم اور تربیت کی رہنمائی کی جو قرآنی تعلیمات کو جدید سائنسی انکشافات سے مستحکم کر سکیں اور یہ بتا سکیں کہ براق کہ جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ کا سفر کیا تھا، اس کی رفتار موجودہ سائنس کی برق کی رفتار سے کم نہیں تھی اور آج کے ریڈیائی نظام کو آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل حضرت عمر نے جنگ قادسیہ میں یا ساریۃ الی الجبل کے ذریعہ دیے گئے اپنے پیغام میں پیش کر دیا تھا۔

مولانا شبلی کی خواہش تھی کہ ہر فن کے اہل کمال پیدا کیے جائیں جو درجہ تکمیل کے ذریعہ ممکن تھا، دوسری جدید ضرورتوں سے باخبر علماء پیدا کرنا جس کے لیے انگریزی دانی اور جدید علوم کی تعلیم ضروری تھی، اگر ان مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی تو پھر ندوہ کی کیا ضرورت تھی اس کے لیے صرف قدیم تعلیم کے لیے عربی مدارس کافی تھے۔ (۴)

مشرقی علوم کی حمایت:

شبلی مشرقی علوم کے حصول کے حمایتی اور اسے مسلمانوں کی ترقی کا ضامن قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی، بے شبہہ مشرقی تعلیم و تعلم کی جو اسکیم ہے، وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے لیکن اس تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں

جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت اور تاریخ کسی چیز کو زندہ نہیں رکھ سکتی۔

انگریزی تعلیم کی اہمیت پر زور:

علی گڑھ میں قیام کے دوران شبلی کو انگریزی تعلیم کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا، اپنے احباب کو انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی تلقین کرتے رہتے تھے، وہ انگریزی تعلیم کو صرف اس لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے ذریعہ جدید علوم وفنون سیکھنے میں آسانی ہوتی تھی اور یہ زبان موجودہ وقت کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی تھی،(۶) اس کے باوجود وہ مغربیت زدہ ہرگز نہیں تھے، انھوں نے انگریزوں کے فرسودہ نظام اور ظاہری ریا ونمود کی جم کر مذمت بھی کی ہے۔

اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کا قیام جہاں آج ہم اس سمینار میں موجود ہیں علامہ شبلی کی اسی فکر کا نتیجہ ہے، انھیں جدید اور قدیم کے امتزاج کی اہمیت کا اندازہ نہ ہوتا تو شاید آج ہم یہاں جمع بھی نہ ہوتے۔

بورڈنگ اسکول کا قیام

علامہ شبلی تعلیمی وتربیتی نشوونما کے لیے بورڈنگ کے قیام کو مقدم سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اسکول کی عمارت کی تعمیر سے قبل بورڈنگ تعمیر کرانے کے حق میں تھے، ان کے مطابق تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کی تربیت بھی انتہائی ضروری ہے جو بورڈنگ کے بغیر ممکن نہیں، ایسے بورڈنگ اسکول کے قیام کی ضرورت ہے جہاں طلباء کی صحیح تربیت کی جاتی ہو، آج جب ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکے ہیں اس کا شدت سے احساس کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں پیش رفت بھی ہو رہی ہے، متعدد سرکاری اور پرائیویٹ بورڈنگ اسکولوں کا قیام اسی کا پیش خیمہ ہے، جو دوسرے اداروں کی بہ نسبت زیادہ موثر، فعال اور کامیاب بھی ہیں۔

تعلیمی نظام میں تعلیمی نگہداشت کو کسی بھی تعلیمی ادارے کی ترقی کا ضامن تصور کیا جاتا ہے، علامہ شبلی اس سے بھی بے خبر نہ تھے، اسکول کی ذرا سی بات کے لیے باخبر رہنا چاہتے تھے، اسکول کی باقاعدہ رپورٹ منگواتے اور علی گڑھ میں رہ کر اس کی نگرانی کرتے، رپورٹ کے نقائص

پر نظر رکھتے اور احباب اور اعزاء سے اس کی فرمائش کرتے اور ان کی گرفت بھی کرتے، بچوں کی تعلیمی استعداد معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے، آج کے جدید اسکولوں میں طلباء کی اکتسابی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے تحصیلی جانچ کروائی جاتی ہے، یہ ایک جدید طرز ہے لیکن علامہ شبلی نعمانی نے اس کا اندازہ بہت پہلے کر لیا تھا۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کا قیام ان کی تعلیمی اصلاحات کا انتہائی شاندار نمونہ ہے، ندوہ کو انھوں نے نہایت مفید اور کار آمد ادارہ بنایا، اس کے لیے قواعد وضوابط بنائے، نصاب تعلیم متعین کیا، ندوہ کا نصاب اگرچہ مولانا کی مرضی کے مطابق جاری نہ ہو سکا تاہم جس جدید وقدیم تعلیم کے امتزاج کا انھوں نے خاکہ پیش کیا تھا نہ صرف اسے سراہا گیا بلکہ آنے والے وقتوں میں اس کا نفاذ بھی کسی نہ کسی حد تک ہوا، ان کا خیال تھا کہ ندوہ سے علماء اور دانشوروں کی ایسی جماعت نکلے جو حالات حاضرہ سے کما حقہ واقف ہو، نیز جدید علوم وفنون سے بھی نابلد نہ ہو، یہاں کے فارغ التحصیل طلباء مسائل حاضرہ کو دین کی روشنی میں سمجھ کر اس کا مدبرانہ فیصلہ کر سکیں، جب دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو دنیا کی بھی تعلیم ملے گی تو ان کے انداز فکر میں وسعت وگیرائی پیدا ہوگی اور ان کے فیصلے دقیق ہوں گے، مولانا شبلی کا خیال تھا کہ ندوہ دیوبند نہیں بن سکتا اور دیوبند خود دیوبند کب تک رہ سکتا ہے، تعلیم کے سلسلہ میں اپنے خیالات ونظریات کو مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں اکثر دہرایا کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنی نظامت کے دوران ان پر سختی سے عمل بھی کرنا چاہا مگر مخالفین کی وجہ سے انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی۔

مولانا شبلی کا مجوزہ دارالعلوم قدیم وجدید علوم کی درسگاہ تھی، انھوں نے سب سے پہلے نصاب کی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی، ان کے دلائل سے نصاب تعلیم میں تبدیلی بھی منظور ہوگئی، مگر اس کا نفاذ عملی طور پر نہ ہو سکا، اپنی معتمدی کے زمانے میں اس کے لیے بڑی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے، اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول: اساتذہ جدید علوم سے ناواقف تھے جب خود ناواقف تھے تو طلباء کو کیا پڑھاتے۔ دوم مولانا انگریزی کو داخل نصاب کرنا چاہتے تھے اور ندوہ والے انگریزی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ سوم ندوہ والے شبلی کو علی گڑھ کالج کا نمائندہ سمجھتے تھے، اس لیے مولانا میں بھی انھیں نیچریت کی بو آتی تھی۔ (۷)

جدید وقدیم کا سنگم:

قیام ترکی کے دوران شبلی کو وہاں کے طرز تعلیم کا جائزہ لینے کا موقع ملا، انھیں احساس ہوا کہ وہاں عربی تعلیم محدود ہے اور جدید تعلیم بڑی وسعت کے ساتھ دی جارہی ہے مگر دونوں طرح کی تعلیم الگ الگ دی جاتی تھی، شبلی دونوں طرز کی تعلیم میں ہم آہنگی کے قائل تھے، ان کے خیال میں یہی اصلی تعلیمی ترقی کی ضامن ہوسکتی تھی، ان کا نظریہ تھا کہ قدیم تعلیم کی معرفت دین سے واقفیت نیز ایمان میں استحکام و پختگی پیدا ہوتی ہے اور عصری علوم کے ذریعہ طلباء نئے علوم وفنون سے روشناس ہوتے ہیں انھیں بے دینی کے جدید رجحانات کا پتہ چلتا ہے، قدیم تعلیم کی معرفت دین سے جدید رجحانات کا رد سوچنے میں مدد ملتی ہے، ان کے خیال میں دونوں کو جدا کرنا ادھوری تعلیم اور محدود واقفیت کا پیش خیمہ ہوگا۔ (۸)

جدید تعلیم

مولانا شبلی نعمانی نے نہ صرف مسلمانوں میں جدید کا احساس پیدا کیا بلکہ ان کی غیرت وحمیت کو جھنجھوڑا، اسلاف کے شاندار کارنامے یاد دلائے، علی گڑھ کی تعلیمی واصلاحی تحریک کو متعارف کروایا، شبلی کہیں شیراز واصفہان کے مناظر دکھاتے ہیں کہیں ایران، روم وشام کے عہد زریں کی تابانی کا ذکر کرتے ہیں کہیں مصر، غرناطہ اور بغداد کے درخشاں کارنامے بیان کرتے ہیں کہیں مغرب کے دانشورانہ انکشافات منصۂ شہود پر لاتے ہیں ساتھ ہی قومی وملی درد کا اظہار بھی کرتے ہیں، جس کا واحد مقصد جدید خیالات کو سرسید احمد خاں کی تیار کردہ نئی شاہراہوں پر چل کر قدیم ماحول اور طریقے پر ڈھالنا تھا۔

بورڈنگ سسٹم

مولانا شبلی نعمانی کے نزدیک تعلیم وتربیت کے معاملہ میں بورڈنگ سسٹم سب سے زیادہ قابل قدر اور موزوں ہے، انھوں نے اس طرز کو زیادہ موثر، فعال اور کارآمد بتایا، ترکی میں اس طرح کے تعلیمی نظام کی ستائش کی ہے، لکھتے ہیں: ’’تمام بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں اور ان میں

نہایت کثرت سے طلبہ رہتے ہیں لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس، وضع مکان، فرنیچر تمام چیزیں ایک سی ہیں، طالب علموں کی حالتوں میں فرق مراتب کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔'' شبلی کو علی گڑھ میں بورڈنگ کے اختلاف مراتب کا بڑا افسوس تھا، وہ یہاں کے تمام طلبا کو یکساں سطح پر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ یہ تمیز نہ کی جاسکے کہ کون کم مقدور اور غریب ہے، اس کا اہم مقصد یہ بتاتے ہیں کہ طالب علموں کی رہائش یکسانیت اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے اور غربا، کو اعلا درجہ کی معاشرت کا حصول ان میں جرأت، بلند نظری اور حوصلہ پیدا کرتا ہے، موجودہ عہد میں ان کا یہ نظریہ تقریباً تمام بورڈنگ اسکولوں میں نظر آتا ہے، اگر اس کا فقدان ہے تو صرف عربی مدارس اور کالجوں میں۔

وظیفہ اور تعاون

غریب، نادار اور غیر مستطیع طلبا کو وظیفہ دینے کے خواہش مند تھے، کسی زمانے میں یہ عربی مدارس میں جاری تھا، آج اس کا اہتمام حکومت پرائمری اسکولوں کے لیے کر رہی ہے، مولوی سمیع کے پاس نذر کی کچھ رقوم تھیں، علامہ شبلی نے اس کا مصرف یہ بتایا کہ ان کو ترقی قوم کے مصارف کے طور پر رکھا جائے یا نیشنل اسکول میں اس غرض سے بھیجا جائے کہ اس سے چھوٹے سے چھوٹا فرنیچر خرید لیا جائے، کیوں کہ اس کی بڑی کمی تھی یا پھر کسی غریب طالب علم کو وظیفہ میں دے دیا جائے۔

تعلیم نسواں

مولانا شبلی عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے، وہ بھی دینی نہیں بلکہ عصری، وہ عورتوں کو محض امور خانہ داری تک محصور رکھنے کے قائل نہیں تھے، اس کا اظہار انھوں نے عطیہ فیضی کو لکھے خط میں کیا ہے، وہ ایک عالم دین بھی تھے لہٰذا مولویوں کی بنائی ہوئی دقیانوسی فصیل جو اکثر علماء کو اپنے حصار میں رکھتی تھی توڑ نہ سکے لیکن عطیہ فیضی کو لکھے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سرسید احمد خاں، حالی اور اپنے دیگر ہم عصر دانشوروں سے قبل ہی تعلیم نسواں کی ضرورت محسوس کر لی تھی، جہاں حالی اور ڈپٹی نذیر احمد عورتوں کو گھر کی چہار دیواری کے حصار میں محض امور خانہ داری اور تربیت الاطفال کے قابل بنانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں وہاں مولانا شبلی نعمانی ان سے دوررس اور مستقبل شناس نظریہ رکھتے تھے، شبلی نعمانی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے ایک خط میں رقم طراز ہیں کہ '' بمبئی میں

عورتوں کے جلسے دیکھے ان کی تقریریں سنیں، ان کی قابلیت دیکھی لیکن چنداں خوشی نہ ہوئی کیوں کہ ان سرگرمیوں میں مسلمان عورتوں کا کہیں پتہ نہیں۔''

تعلیم نسواں کی حمایت کے باوجود عورتوں کی تعلیم وتربیت اور طریقۂ معاشرت میں یورپین اور ایشیا تک قوموں کے افراط وتفریط اور اختلاط کے قائل بھی نہ تھے، اس سلسلہ میں ترکوں کے طریقۂ تعلیم کو سب سے زیادہ قابل قدر اور قابل تقلید قرار دیا ہے، یہاں بھی وہ مذہبی بندشوں سے بے محابہ آزادی کو معاشرے کے لیے مہلک تصور کرتے ہیں، اپنے سفرنامۂ روم، مصر وشام میں تحریر کرتے ہیں کہ ''ترکوں نے ایسا معتدل طریقہ اختیار کیا ہے جو دونوں کی خوبیوں کا جامع اور دونوں کے عیوب سے خالی ہے، ٹرکش عورتیں تعلیم یافتہ ہیں لیکن بے شرمی، شوخی، بے جا آزادی، رقاصی کی (اور وہ بھی غیر مردوں کے ساتھ) ان کو تعلیم نہیں ہوئی ہے، وہ پردے کی پابند ہیں لیکن جاہل، دنیا سے بے خبر، مکان کے قفس میں بند حیوان انسان نما نہیں ہیں۔''(۹)

اتنا ہی نہیں تعلیم نسواں کے لیے ہر طرح کا تعاون کرتے تھے، والی بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کو جنھیں مسلم خواتین کی تعلیم وتربیت سے بڑی دلچسپی تھی، مولانا شبلی، محمد امین زبیری کے توسط سے اس سلسلہ میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ (''خودنوشت سوانح عمری'' از مولانا زبیری)

اردو کی خدمت

اردو زبان کے فروغ کے لیے ان کی خدمات اور ان کی شاعری سند کا درجہ رکھتی ہے، شبلی عالم ہونے کے ساتھ اردو کے ادیب اور شاعر بھی تھے اردو زبان وادب کے عناصر خمسہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری تھے، بحیثیت سکریٹری اردو زبان کے تحفظ، بقا اور اس کی ترویج وترقی کے لیے ان کی جامع تجاویز انتہائی اہم ہیں، ان کی سعی جمیلہ کا ثمرہ آج بھی جاری ہے۔(۱۰)

عربی زبان کی ترویج واشاعت

شبلی نعمانی کو عربی زبان کی ترویج واشاعت سے بھی کافی شغف تھا، چنانچہ پروفیسر شیخ عبدالقادر کی کوشش سے جب سید سلیمان ندوی کا پونہ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا تو انھیں بڑی مسرت ہوئی، سید صاحب کو ہدایت کی کہ وہ انھیں عربی پڑھائیں اور اپنی خواہش کا اظہار

کرتے ہوئے فرمایا ''کہ اگر پروفیسر صاحب کو عربی آجائے تو بڑی مسرت ہوگی۔'' (۱۱)

سن ۱۹۱۳-۱۹۱۲ء میں یورپ کی عربی نادر مطبوعات کا ایک عمدہ ذخیرہ فروخت ہو رہا تھا، شبلی نعمانی نے نواب حمید اللہ بھوپال کو اس کی جانب توجہ دلائی، مولانا ان کی کتابوں کی فہرست بھیج کر چاہتے تھے کہ ڈاکٹر ہارویز سے جو علی گڑھ میں پروفیسر تھے اس کی قیمت کا تخمینہ کروالیں کہ وہ گراں نہیں ہیں، امانت و دیانت کا بھی خیال تھا، قوم کے سرمایہ کو یوں ہی بے دریغ بہانا نہیں چاہتے تھے۔

شبلی نعمانی کو اپنے احباب اور شاگردوں کی ہمہ جہت ترقی اور تربیت کا ہمیشہ خیال رہا، جن سے وہ علمی، ادبی، تصنیفی اور تحقیقی کام لیتے رہتے تھے، ان کی تربیت بھی پیش نظر ہوتی تھی، مولانا دریابادی نے جب کچھ اجزا لکھ کر بھیجے تو ان کو لکھا کہ روزانہ دو ڈھائی گھنٹہ سے زیادہ کام نہ کریں، اور کتابوں کی فراہمی اور دیکھنا بھی انہیں دو گھنٹوں میں شامل رکھیں۔ (۱۲)

اپنے طلباء کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ان کی لغزشوں کی اصلاح بھی کرتے تھے، چنانچہ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں: ''دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا ہے، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا ہے، البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔'' (۱۳)

شبلی نعمانی علمی تحقیقات میں مسلمانوں کو یورپ کے مقابلے پر دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ سید سلیمان ندوی کے پونہ کالج میں پروفیسر بننے پر کافی خوش تھے کہ اس سے نہ صرف انہیں مالی تقویت ملے گی بلکہ ان کا حوصلہ بلند ہوگا اور وہ تعلیمی خدمات انجام دے سکیں گے۔

لندن میں خواجہ کمال الدین کی تعلیمی اور اسلامی خدمات کو وہ تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اب مسلمانوں میں علمی شعور اور اسلامی تحقیق اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے اور اگر صحیح تربیت رہی تو آئندہ نسلیں خم ٹھونک کر میدان میں آئیں گی اور ترکی بہ ترکی یوروپین کے الزامات اور موشگافیوں کا دندان شکن جواب دیں گی۔ (۱۴)

مولانا شبلی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں اسلام کے آئینے سے اس گرد و غبار کو صاف کیا جسے انگریزوں نے اس کے چہرے پر ڈالنے کی کوشش کی تھی اور مسلمانوں کے عہد زریں کے ان تمام پرانے مرقع کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔

بہ قول سید صباح الدین ''ان کی عظمت کا صحیح اندازہ وہ نہیں کر سکتا جو صرف ادیب ہے، یا صرف نقاد ہے، یا صرف شاعر ہے، یا صرف مورخ ہے، یا صرف متکلم ہے، یا صرف سیرت نگار ہے، یا صرف عالم ہے، ان کے علمی وادبی محاسن کا معترف صحیح معنوں میں وہی ہو سکتا ہے جو ان ہی کی طرح جامعیت رکھتا ہو۔'' (۱۵)

تعلیم سے رغبت دلانے کا ان کا منفرد انداز تھا، ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے احباب بڑے تعلیمی اداروں کو دیکھیں، وہاں کی تعلیمی سرگرمیوں کو دیکھ کر ان میں علمی مذاق پیدا ہوگا اور تعلیمی اداروں سے ان کی وابستگی سے تعلیمی رجحان فروغ پائے گا، یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کالج میں جب بھی کوئی جلسہ ہوتا کسی نہ کسی عزیز کو ضرور مدعو کرتے تھے۔

ان کے تعلیمی افکار نے نہ صرف سر سید احمد خاں کی تحریک کو تقویت بخشی بلکہ ایک نیا تعلیمی رجحان بھی پیدا کیا، جس میں جدید اور قدیم تعلیم کے امتزاج کو خالص دینی پس منظر میں فروغ دینے کی کوشش ملتی ہے، ان کا یہ تعلیمی نظریہ کس حد تک قابل قبول اور کامیاب رہا اس کا فیصلہ اہل علم ودانش بخوبی کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) اردو ادب، شبلی نمبر، ص ۱۲۱

(۲) ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، ص ۳۰ کا حاشیہ (اکتوبر ۱۹۰۴ء)

(۳) اردو ادب سہ ماہی، ص

(۴) شبلی کا ذہنی ارتقاء، یحییٰ ہاشمی۔ ص ۶۶۷

(۵) شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ ص ۱۲۵، بحوالہ سفرنامۂ روم ومصر وشام

(۶) شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ ص ۱۲۶

(۷) شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ ص ۶۵۹

(۸) شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ ص ۱۴۰

(۹) سفرنامہ روم ومصر وشام

(۱۰) سہ ماہی اردو کراچی۔ ص ۵۳-۹۸

(۱۱) شبلی کا ذہنی ارتقاء، یحیٰ احمد ہاشمی۔ ص ۶۵۱

(۱۲) شبلی کا ذہنی ارتقاء، یحیٰ احمد ہاشمی۔ ص ۶۵۸

(۱۳) شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ ص ۶۵۸، الندوہ ج ۵، نمبر ۱۱-۱۲، مکاتیب دوم ص ۳۷ (۱۴ فروری ۱۹۰۹ء)

(۱۴) شبلی کا ذہنی ارتقاء۔ ص ۶۴۹

(۱۵) مقالات یومِ شبلی۔ ص ۱۳۲-۱۳۱

مراجعِ مقالہ

(۱) سید یحیٰ ہاشمی — شبلی کا ذہنی ارتقاء (تحقیقی مقالہ) المحزن پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی (۱۹۹۷ء)

(۲) شبلی نعمانی — سفرنامہ روم و مصر و شام

(۳) شبلی نعمانی — مقالات شبلی، جلد سوم (تعلیمی) دارالمصنفین، اعظم گڑھ

(۴) عبید اللہ خان — مقالات یوم شبلی، اردو مرکز لاہور (۱۹۶۱ء)

(۵) صباح الدین عبدالرحمٰن — مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، دارالمصنفین، اعظم گڑھ (۱۹۸۵ء)

(۶) ناز صدیق — شبلی نقادوں کی نظر میں، الیاس ٹریڈرس شاہ علی بنڈہ حیدرآباد (۱۹۷۶ء)

(۷) خلیق انجم — اردو ادب شبلی نمبر، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۴ء)

☆☆☆

دانش گاہِ شبلی

پروفیسر عبدالحق ☆

دانش دنیا کی تاریخ میں چند لوگ ہی شبلی کے برابر شمار کیے جاسکتے ہیں، وہ بہت خوش نصیب تھے کہ انھوں نے ستاون سال کی عمر میں علم وادب کے دامن کو گہر ہائے گراں بار کی ارزانی بخش دی، یہ ان کی بڑی خوش بختی تھی کہ ان کے ناتمام منصوبوں کو نیاز مندوں نے ان کے شایانِ شان مکمل کیا، جم و کے یا اسکندر و دارا کے نسب نامے ورق در ورق برباد ہو کر بکھر گئے، شبلی کی معجز نما شخصیت کی فیض رسانی دیکھیے کہ ان کا سلسلۂ نسب تازگی و توانائی کے ساتھ ابھی تک سرگرم سفر ہے، کشتۂ سلطانی وملائی و پیری کے خوگر بھی نام ونسب میں شبلی کے سایۂ شجر کی مثال پیش نہ کر سکے، شبلی کے نسب نامے کی علمی فتوحات کی اب تک نظیر نہیں مل سکی، خانوادہ پر فخر کرنے والے طریقت وتصوف کے نام ونیام بھی اس آب وتاب سے خالی ہیں، ایک طرف سیرتِ کائناتِ عالم کی تکمیل ہوئی ہے تو دوسری طرف قومی اسکول کے خاکے کو عظمت وجلال کی بلندی تک پہنچانے میں شبلی کے عاشقانِ پاک طینت آتشِ نمرود اور ابراہیمی ایمان کی آزمائش سے بھی گزرتے رہے ہیں۔

۱۹۵۸ء میں گورکھپور یونی ورسٹی قائم ہوئی تو مجلس عمل میں شبلی کالج کے جواں ہمت پرنسپل شوکت سلطان مرحوم بھی شامل ہوئے، مجلس کی مختلف نشستوں میں گورکھ ناتھ مندر کے پجاری سے تعلیمی مسائل میں ان کی اختلافی آواز در و دیوار میں گونجتی رہی۔ مہنت تعصبات کی عینک سے دیکھنے کے عادی تھے، اختلاف کی جرأت شوکت صاحب کرتے رہے، باقی اراکین ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق دم بخود بیٹھے رہتے۔ غرض شبلی کالج کی موجودگی موثر تھی اور محسوس بھی کی جاتی تھی، ان کے انتقال کے بعد ادارہ ایک عبوری دور سے دوچار ہوا، ترقی تعطل کا شکار ہو کر رہ گئی، تعلیمی

☆ وزیٹنگ پروفیسر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

نظام پر بھی اثر پڑا، لیکن فیضان شبلی کو دیکھیے کہ چند برسوں بعد کالج کے کشادہ سبزہ زاروں کی قوت نمو سے ایک مردکار بنام ڈاکٹر افتخار احمد اٹھتا ہے جو جنوں خیز جذبے سے سرشار رہتا ہے۔ جس نے:

دامنِ دشت کیا نقشِ قدم سے گلزار ☆ کس بہاراں کا یہ دیوانہ تماشائی ہے

آنکھیں حیرت زدہ ہوگئیں کہ علوم سفلی سے بے نیاز یہ انسان جنوں کے کارواں کی کمان کا مالک ہے، چشم زدن میں کالج کی کایا پلٹ گئی، تعلیم اور تنظیم کے امکان روشن ہوئے، توسیع و ترقی کے حدود پر کمندیں ڈالنے کی کامیاب کوشش نے اعظم گڑھ کو ہی نہیں پورے شیراز مشرق کو طلوع صبح کی بشارت بخشی، پاس پڑوس میں بھی اُس ادارے کی ادائیں انگڑائیاں لینے لگیں، الٰہ آباد میں حمیدیہ گرلس کالج، گورکھپور میں امام باڑہ گرلس کالج، جون پور میں ساجدہ گرلس کالج، مئو میں تعلیم نسواں گرلس کالج، بھدوہی میں فلاح دارین نسواں کالج کے ساتھ الٰہ آباد، جون پور، گورکھپور، دیوریا کے مختلف تعلیمی اداروں کے کوزہ وگل میں کاروان شبلی کے غبار رہ گزر کا فیض شامل ہوتا گیا۔ گویا:

آباد کتنے گھر ہیں جہانِ خراب میں

یہ عرض کرنے کی جسارت چاہتا ہوں کہ دیارِ مشرق میں تعلیمی نشاۃ ثانیہ کا ایک مصدر علامہ کی بصیرت کا آئینہ ادراک ہے، جس میں فردائے قیامت کی شفاف صورتیں نظر آرہی تھیں، غرناطہ وبغداد کے بعد نگارخانۂ مشرق کے اہلِ نظر سے نئی بستیاں آباد کرنے کی بشارت شبلی کے افکار میں تلاطم برپا کر رہی تھی، ریاست ہائے متحدہ کی مغربی سرحدوں پر سرسید علم کی قندیل روشن کر چکے تھے، شبلی مشرق کو اپنی آخری منزلِ مراد متعین کرنے میں حق بجانب تھے، کیوں کہ ان کے مشتِ خاک کو اپنے خمیر میں شامل ہونا ضروری تھا، خود شبلی اپنے خشت وخون سے نئی دنیا بسانے کی تاب کار توانائی کے مالک تھے، اسی سبب:

وہ جس زمیں پہ رہے آسماں رہے

۱۸۸۳ء میں انھوں نے قومی اسکول کی بنیاد رکھی، اسے رفعت کی بلندیوں تک پہنچانے میں ڈاکٹر افتخار احمد کے عزم وعرفان کو بڑا دخل ہے، وہ سیاسی تدبر اور علمی آگہی کے ساتھ فردا کو بے حجاب دیکھنے کی گہری بصیرت بھی رکھتے ہیں، قومی ایوان ہوں یا ادارے بلند دیواروں اور کشادہ

میدانوں سے سرفراز نہیں ہوتے، سربراہ کے ساتھ ان کے مددگاروں کے خلوص وخونِ جگر کی کارکشائی اور کارسازی نقشِ دوام حاصل کرتی ہے۔ اساتذہ اور انتظامیہ کے ہر رکن کو ہم دوشِ افتخار دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، مجھے ایک بھی شخص ان کی تنقید یا اختلاف میں شکوہ سنج نظر نہیں آیا، جو عام طور پر ہمارے معاشرے کے مزاج میں شامل ہے۔ نظم وضبط کے ساتھ تعلیم وتدریس کا یہ ارتباط ناچیز کو کسی دوسری جگہ دیکھنے کو نہیں ملا، خاص طور پر مسلم ادارے کشمیر سے لے کر کلکتہ تک افسوس ناک حد تک اپنے ہی حوادث کی زد میں ہیں، اجتماعی زندگی کا انتشار اداروں کو بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں شبلی کالج ایک جزیرہ نمائے نور ہے جس کے دانش ونور کی نوازشوں سے قوم کے ہزاروں نوجوانوں کی تقدیر بدلنے کے اسباب فراہم ہو رہے ہیں، ڈاکٹر افتخار احمد کی گفتگو میں ان کے منصوبوں کی اجمالی تصویر ملتی ہے اور ان کے ارادوں میں سنگِ خارہ کی سختی بھی، وہ پیکرِ عمل ہیں، گفتگو سے گریز کرتے ہیں، منصوبوں کی تکمیل اور خوابوں کی تعبیر پر ہی نظر رکھتے ہیں، وہ اپنے طریقۂ کار پر زور دے کر کہتے ہیں:

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآمد ☆ یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآمد

(میں جب تک کامران نہیں ہوتا پیچھے نہیں مڑتا۔ اس کے لئے جان ودل کی بازی سے گریز کرنا میرا شیوہ نہیں)

وہ طرح طرح کے خطرات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں مگر شکر ہے کہ خالق کائنات ان کی نگہبانی بھی فرماتا ہے تاکہ ادارے کی نگہداری ہو سکے، وہ خوش وضع ہیں اور خوش پوش بھی۔ بے باک وخوش گفتار بھی ہیں۔ ان کی دل آویز شخصیت میں دل لینے اور دل دینے کی دونوں ادائیں موجود ہیں، وہ اگر ہمارے قبیلے کے کشتگان میں نہ ہوتے تو اب تک انھیں ملک کا بڑا اعزاز پیش کیا جا چکا ہوتا۔

اب کالج تقریباً بیشتر علمی شعبوں سے معمور ہے اور جون پور یونیورسٹی کے تمام کالجوں کی قیادت میں پیش پیش ہے، تدریس کا نظام بھی قابلِ رشک ہے، طلباء تعلیم سے مطمئن اور ان کے سرپرست سرخرو ہیں کہ ان کی اولاد کلاسوں کی بہتر کارکردگی کے ساتھ کردار کی تربیت وتعمیر کے اصولوں پر بھی عمل پیرا ہے، موصوف نے بچیوں کے لئے تمام سہولتوں سے بھرپور شاندار ہاسٹل تعمیر

کر کے بلند نگہی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے وسائل ناکافی ہیں، پورے صوبے میں شاید ہی کسی کالج میں یہ سہولت موجود ہو، اس اعتبار سے دور دراز کے مضافات کی بچیاں بھی ہم نشین شہر رہ کر علم کی برکتوں سے مستفیض ہو رہی ہیں، اقامت گاہ کالج کیمپس کے قلب میں ہے، مغرب کی طرف مسجد اور مزار شبلی کی ہم سائیگی سے متصل ہے، بین الاقوامی اہمیت کا حامل دارالمصنفین کا کتب خانہ بھی مسجد کے قریب ہے، جس میں ذی علم مخلصین کی ایک جماعت نگرانی پر مامور ہے، مشرق کی طرف کالج کا کشادہ سبزہ زار ہے، جس میں صبح ہوتے ہی کالج اور شہر کے پیر و جواں میدان کو مسلتے، روندتے، گرتے، پھسلتے پا بہ جولاں نظر آتے ہیں، ان کے خرامِ ناز سے گل کترنے کی حسن کاری کا منظر بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ جیسے:

سیر کرنے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن

مہمان خانے کا کیا کہنا، ارضی بہشت کی آسائش سے معمور، اس ماحول میں لذتِ خوابِ سحر ترک کر کے دور و نزدیک سے آئے مہمان بھی اس منظر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں۔ روشنی تیز ہوتے ہی دو منزلہ تدریسی عمارت کی لمبی قطاریں طلباء کے ہجوم سے بارونق ہو جاتی ہیں، اس جلو میں علامہ کے خواب کی جلوہ سامانی کا منظر بڑا نظر فریب ہوتا ہے، اور اس تمام فضا کی تعمیر و تخلیق میں ڈاکٹر افتخار احمد کے ذوق وشوق کی مہر لگی ہوئی ہے، بہ قول اقبال:

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

کالج کے ایوان ہوں یا اقامت گاہیں، مسجد ہو یا میدان ہر جگہ ان کے لہو کی گردش نمایاں ہے، وہ جدید تر شعبوں کے قیام کے لئے بھی کوشاں ہیں، جو کالج سے زیادہ قوم کے لئے ضروری ہے، فروری کے آخری عشرے میں علامہ شبلی پر بین الاقوامی مذاکرے کا انعقاد کر کے انھوں نے برصغیر میں علمی محفل آرائی کی ایک بے نظیر مثال قائم کی ہے ملک کے علاوہ کئی بیرونی ممالک کے مذاکروں میں ناچیز بارہا شریک ہوا ہے مگر مقالوں کا معیار اور میزبانی کے اہتمام کا یہ انصرام میرے مشاہدے میں نہیں ہے، سارے مندوبین اس حسنِ انتظام پر حیرت زدہ تھے، باد و باراں کی سردی اور سرزنش کے باوجود سیمینار کے شائقین کا ہجوم ہمہ تن گوش بن کر لطف اندوز ہو رہا تھا، ملک کے منتخب

اکابرینِ علم کے ساتھ جواں سال اساتذہ بھی علامہ کے افکار واسالیب کی باز آفرینی میں نئے پہلوؤں کی نشاندہی کر رہے تھے، مباحث بھی معنی خیز تھے، پشاور یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور اقبالیات کے محرمِ راز پروفیسر صابر کلوروی، قرطبہ یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ لسانیات پروفیسر ریاض مجید، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر فیصل آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر رابعہ سرفراز کے فکر انگیز مقالات نے شرکاء کو بہت متاثر ومغلوب کیا، سامعین نے شکر وتحسین کے ساتھ آفریں باد کہا، سچ پوچھئے یہ چار یار ہی محفل کے محور بنے رہے، ڈاکٹر کلوروی کی خوش قامتی وفد کی قیادت کے لئے ہی نہیں پوری انجمن کے لئے بہ قول غالب ''قیامت قامتاں مژگاں درازاں'' کی مصداق تھی، وہ کسی گوشے میں ہوں یا گروہ میں، کھڑے ہوں یا بیٹھے سب کی نظر انھیں پر ٹھہرتی تھی، بعض وجوہ سے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر تحسین فراقی اور ڈاکٹر عبداللہ شاہ شریک نہ ہو سکے، ملک میں یہ پہلا سیمینار تھا جس میں پاکستانی عالموں کی اتنی بڑی تعداد مدعو تھی، ہندوستان کے بھی کئی مدعو کئے گئے بزرگ تشریف نہ لا سکے جیسے پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر مختار الدین احمد آرزو، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر ظفر الاسلام، پروفیسر فیروز احمد، پروفیسر عزیز حسین، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر عبیداللہ فراہی وغیرہ کہیں عذرِ صحت تو کہیں عذرِ شرعی اور کہیں عذرِ لنگ حائل رہا، یہ حضرات بھی جمع ہوتے تو مذاکرہ نہیں علمی میلے کا منظر روبرو ہوتا، منبر سے ڈاکٹر افتخار احمد بیادِ شبلی ۲۰۰۸ء میں عالمی علمی میلے کے انعقاد کا اعلان کر چکے ہیں، انھوں نے اس خاکے میں رنگ بھرنے کا کام بھی شروع کر دیا ہے، وہ شرکا سے دوبارہ تشریف آوری کا قول وقرار بھی حاصل کر چکے ہیں، محفل میں منبر سے میزبان کی حلف برداری کی انوکھی رسم بھی دیکھی، جاں نثاروں کا بے چون وچرا سرِ تسلیم خم کر لینا بھی عجیب تھا، خسرو کے لفظوں میں غزالان صحرائے شبلی سر بکف تھے، اس مذاکرے کے چند خاص امتیازات دیکھنے میں آئے، یہ علامہ شبلی پر پہلا بین الاقوامی مذاکرہ تھا، جس میں بیرونِ ملک کے علاوہ ہندوستان کی اہم دانش گاہوں کے اساتذہ نے شرکت کی، پہلا سیمینار تھا جس میں اردو، فارسی، عربی وانگریزی کے علاوہ تاریخ، سماجیات، صحافی، سفارت کے ذی علم حضرات نے شرکت کی۔ چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ دینی درس

گاہوں کے علماء نے بھی اپنی بھرپور موجودگی کا احساس دلایا، مختلف اشاعتی و تحقیقی اداروں کے ذی فکر حضرات نے بھی شرکت کی، نوجوان مقالہ نگاروں کی بڑی تعداد تھی، ساتواں امتیاز بھی بے حد اہم ہے کہ مقالات کا معیار مجموعی طور پر بہت ہی اچھا تھا، ان کے علاوہ مذاکرے میں کسی ایک شخص کی اجارہ داریت کا شائبہ بھی نہ تھا، جو عام طور پر مکروہ صورتوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ یہ اجتماعی کارکردگی کا مظہر تھا، پرنسپل، اساتذہ، طلبا کے ساتھ مقالہ نگار اور سامعین کے دوش بدوش والیان شہر و مضافات بھی ہم مشرب و ہم راز کے پیکر بنے تھے، داعین نے کسی خاص نظریہ کے حامل یا بزم ہم خیالاں منعقد نہیں کی تھی جس میں محمود کی مداحی اور خوشامد کی خاطر ہی ایازان وقت کو مدعو یا مامور کیا گیا ہو، جیسا کہ عام چلن ہے، دسواں پہلو بہت اہم ہے کہ یہ مذاکرہ کسی سرکاری عطیے یا امداد سے بے نیاز رہ کر منعقد کیا گیا۔ ہر طرح کی گداگری سے گریز کر کے ادارے نے صرف اپنے وسائل پر انحصار کیا، یہاں گل ہی نہیں ہر گوشہ زر بکف تھا تمام مقالہ نگار استقبال و احترام کے لئے ہی مسرور و مطمئن نہ تھے بلکہ جیب کی گراں باری اور کاسۂ زر کی ارزانی پر خوش و خرم تھے، یہ مقالے کا معاوضہ نہ تھا بلکہ ادارۂ شبلی میں آمد کا ایک ادنیٰ اعتراف تھا، وقفوں کے دوران لان میں درماندگی کو دور کرنے کے لئے چائے اور قہوہ کے لئے صلائے عام ہوتا، موسم بہار کی وجہ سے لان میں گلاب کے پھولوں سے بوجھل شاخیں جھک جھک کر استقبال کے آداب بجا لا رہی تھیں۔ ڈاکٹر افتخار احمد یہاں بھی ناسازیٔ طبیعت کے باوجود ہر ایک کی تواضع کے لئے تیار نظر آتے، ان کے رفیق کار ڈاکٹر شباب الدین بھی دن ورات کی محنت کی تکان سے مضمحل مگر انتظام کے ہر پہلو کے لئے مستعد اور مامور تھے، وہ علمی و ادبی سرگرمیوں کے انعقاد و اہتمام میں یکتائے روزگار ہیں اور پیکر خلوص و خدمت ہیں، وہ پرنسپل صاحب کے معتمد، اساتذہ کے محبوب و مرشد اور طلباء کے مخدوم و مربی ہیں اردو کے کسی استاذ کی یہ مقبولیت خاکسار کے مشاہدے میں نہیں ہے، ان کے گرد اساتذہ کے حلقۂ یاراں کا ایک ہجوم ہر وقت تعاون کے لئے تیار رہتا ہے، یہ دیکھ کر ان پر رشک آتا ہے، وہ بھی تمام شعبوں کے اساتذہ کی دل داری میں مصروف رہتے ہیں، شیروانی اور پاجامے کے ساتھ قامتِ زیبا پر کلاہِ خسروی ان کی پہچان ہے، یہ تن پوشی علی گڑھ کی آبرو ہو یا نہ ہو، اعظم گڑھ میں ان کی شبیہ اور شرافت کا امتیاز

ضرور ہے، اس آرام دہ لباس کی زیب تنی کے باوجود وہ بے حد متحرک ہیں، شبلی کالج سے کہیں زیادہ آج اردو کو ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے، جن کے تگ ودو سے زندگی جواں اور جولاں دکھائی دیتی ہو، وہ اکثر و بیشتر ڈاکٹر فخرالاسلام، ڈاکٹر علاء الدین، ڈاکٹر ظہور عالم، ڈاکٹر شمس عالم، ڈاکٹر حکیم الدین، ڈاکٹر کلیم احمد، ڈاکٹر الطاف احمد، ڈاکٹر محی الدین آزاد، ڈاکٹر محمد خالد، ڈاکٹر ظفر عالم، ڈاکٹر شفقت علاء الدین، ڈاکٹر سرفراز نواز، ڈاکٹر طاہر، ڈاکٹر حفیظ جیسے جواں سال اساتذہ کے درمیان ہوتے ہیں، ان کا یہ حلقۂ عزیزان مخلصین پر مشتمل ہے اور قابل رشک بھی ہے، مجھے محسوس ہوا کہ کالج میں شعبۂ اردو کو ایک مرکزیت حاصل ہے۔

مذاکرے کی کہکشاں کو دیکھ کر برصغیر میں فکر و نظر کے موجد و مبلغ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا قول یاد آرہا تھا کہ شیراز مشرق کی علم و دانش کی روح پرور ہوائیں چلتی ہیں تو قلب و نظر کو منور و معطر کرتی ہیں، ایک طرف سوادِ بمبئی کے سودائی شمیم طارق مقالہ نہیں جوشِ جنوں میں سب کچھ روا سمجھ کر سامعین کے ذہنوں کو زیروزبر کررہے تھے، دوسری طرف اُسی شہر دل نواز سے آئے، ڈاکٹر صاحب علی اور ڈاکٹر خورشید نعمانی سادہ بیانی میں دلآویزی کے رس گھول رہے تھے، قریب کے مہمان پروفیسر افغان اللہ برقی روشنی اور آواز سے بے نیاز ہوکر بڑی بے تکلفی سے سکوت شام کے پس منظر میں سامعین کو مسحور کرتے رہے، حاضرین پروفیسر محمد زاہد کے مقالے سے زیادہ شبلی کی فارسی غزلوں کو نئے آہنگ سے پڑھنے پر ان کے اسلوب و ادائیگی کی داد دیتے رہے، ڈاکٹر نسیم احمد کی سنجیدگی اور عالمانہ نظر ان کے مقالے سے نمایاں تھی، وہ تحقیق کے مرد میدان ہیں اور تقریر سے گریزاں رہتے ہیں، لیکن آج دونوں کا امتزاج عجب لطف دے رہا تھا، پروفیسر عبدالقادر جعفری سے توقع تھی کہ وہ شاید علامہ کی فارسی شاعری پر اظہار خیال کریں گے مگر امید کے برعکس انھوں نے شبلی کی تفکیر علمی ودینی کے روشن اسالیب پر انتہائی متانت واعتماد کے ساتھ مقالہ پڑھا، ڈاکٹر کمال الدین اور ڈاکٹر آفتاب کا مقالہ مطالعۂ شبلی کے نئے امکان کی رہنمائی کررہا تھا، پروفیسر عبدالباری کی سنجیدگی ان کے مقالے میں بھی بہت نمایاں تھی، دیارِ شبلی کے ایک ممتاز دانشور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی شبلی اور سرسید کے فکری مصادر پر اپنی مخصوص خوش بیانی کے جادو سے پورے مجمع کو اپنی طرف ملتفت کئے ہوئے تھے،

رثائی ادب کے معروف شناور پروفیسر فضل امام رضوی لازوال شعریات پرپُر جوش خطابت اور لفظوں کی خوش ادائیگی کا پیکر بن کر منبر سے جاایں جاست کا سماں پیش کررہے تھے، پروفیسر محسن عثمانی مقالے سے زیادہ معارضے پر متوجہ تھے، جس سے مجلس میں سوال وجواب کے درمیان تاپ وتپش کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں آیا، گرمیٔ گفتار سے بادوباراں کی پیدا کردہ برفیلی ہوائیں بھی بادۂ تند بن کر مزہ دے رہی تھیں، موقع کی مناسبت سے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر شباب الدین منبر سے چائے کے وقفے کا اعلان کرتے ہیں، ہال کی گرمی چمیلی کی خوشبو بن کر چائے کی پیالیوں میں ڈھل جاتی ہے۔

ڈاکٹر منور انجم، ڈاکٹر غضنفر علی، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر منظر حسین کے مقالے پیش کش کی دل کشی کے ساتھ منفرد اور بہت متوازن خیالات کے حامل تھے، ڈاکٹر عبدالباری فکر شبلی کے مختلف پہلوؤں پر خیال افروز مقالے کے ساتھ اپنے مطالعے کی دیدہ وری سے شبلی کو مسلم نشاۃ ثانیہ کا نقیب قرار دینے میں حق بجانب تھے، دارالمصنفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی متنوع گفتگو کے ساتھ ادارے کے رفیق محمد عمیر الصدیق ندوی نے شبلی کی فتوحاتِ علمیہ پر اسلوب کی دلکشی کے ساتھ خیال آفریں مقالہ پیش کیا، جو مختصر تھا مگر تاثرات کی بے کراں کیفیات کا حامل بھی تھا، ڈاکٹر الیاس اعظمی کا مقالہ قدرے طویل مگر ترتیب وارتباط میں جامعیت سے بھرپور تھا، ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی رضا لائبریری کی نمائندگی فرمارہے تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر محمد تعظیم اور جموں یونیورسٹی کے پروفیسر جگر نے علامہ کی تاریخی بصیرت پر تحقیقی نکات پیش کیے، جامعہ کے نوجوان اسکالر ڈاکٹر عمیر منظر علمی بازیافت میں بزرگوں کے دوش بدوش تھے، انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے علامہ کی خدمات کے اعتراف میں حاصل عمر کے مشاہدات پیش کیے، شبلی کے سلسلے میں ایک مخصوص نظریہ کے موقع پرستوں پر ان کی ناقدانہ گفتگو کی سامعین نے جی کھول کر داد دی، آج ان کے طرزِ بیان کی بے باکی وسنجیدگی کے ساتھ تلخی وتندی کو شدت سے محسوس کیا گیا، کالج کے کئی اساتذہ وقت کی تنگی کے سبب مقالہ نہ پیش کرسکے، برادرِ بزرگ پروفیسر کبیر احمد جائسی کی آمد سے مجلس ومقالے سب باوقار تھے، عاشقانِ شبلی کا ایک دوسرا حلقہ بھی ان کے ذکروفکر کی بازیافت میں سربلندی سے سرشار تھا، دینی درس گاہوں کے علماء واکابرین علامہ کی نکتہ رسی کی داد دینے میں پیش پیش تھے، بمبئی وبنارس

، کیرلا، علی گڑھ، لکھنؤ اور اعظم گڑھ وغیرہ کے علماء کی نظر افروز تحریریں سننے والوں کو تحیر اور تسکین کا سامان فراہم کر رہی تھیں، محسوس ہو رہا تھا کہ ایوانِ شبلی میں ایک طرف قمریاں گلستاں کا باب پنجم پڑھ رہی ہوں تو دوسری طرف شمسِ بازغہ کے مطالعہ سے محویت کا ایسا منظر کہ جنبشِ مژگاں کو بھی بار ہو رہا ہو، کبھی کبھی دفتری اور انتظامی معاملات سے فرصت پا کر ڈاکٹر افتخار احمد درمیان میں آجاتے تو مقالے اور محویت کی گراں باری محبت میں تبدیل ہو جاتی، درماندگی کو دور کرنے کے لئے نماز اور چائے کے وقفے کا اعلان ہوتا، چمن زار میں چائے کی پیالیاں سنبھالے کبھی شرکاء مختلف حلقوں اور گوشوں میں بکھر جاتے، اللہ کی عظمت کا اعلان ہوتا مزارِ شبلی سے ملحق مسجد کی طرف لوگ تیز قدم بڑھتے، سجدۂ شکر بجالاتے، سراپا ناز و نیاز کے ساتھ تازہ دم ہو کر ایوانِ شبلی میں آکر سلیقے سے نشستیں سنبھالتے، ہال کے در و دیوار سے آواز آتی:

شبلی نشود ویراں تا میکدہ آباد است

(جب تک دنیا آباد ہے ایوانِ شبلی کی رونق ختم ہونے کو نہیں)

دنیا کی ہر شے آنی و فانی ہے، گردش شام و سحر کے درمیاں کوئی چیز بھی محفوظ نہیں ہے، ہاں علامہ اقبال نے صرف ایک شے کو اس سے بے نیاز قرار دیا ہے:

ہاں مگر اس نقش میں ہے رنگِ ثبات دوام ☆ جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

یہ ادارہ بھی ایک مردِ کار کی محنت کا نقشِ دوام ہے۔

دبستانِ شبلی کے بلبلِ خوش نوا ڈاکٹر فخر الاسلام مجلس کے نئے نظام کے آئین کا اعلان کرتے ہیں ہر مقرر کو شعر سے متعارف کراتے ہیں، سامعین بھی ایسے سخن شناس ہیں کہ شعر سے مقرر کی شناخت کر لیتے، ان کی دل ربائی دیکھ کر راقم نے شکوہ کیا:

فخرِ اسلام ہو ناحق مجھے بدنام کرو ہو

ایک ایک کر کے آواز دی جاتی ہے موقر مہمانوں میں پروفیسر ریاض مجید، پروفیسر صابر کلوری وغیرہ کی جذب و شوق سے بھری تقریریں سرحدوں کا حجاب توڑتی تاثرات کے طوفان کی مانند تھیں، دوسرے بزرگوں کا بھی یہی حال تھا، رئیس علم جناب ڈاکٹر افتخار صدر نشینِ مجلس تھے، وہ

چاروں طرف بکھری علم ونور کی خوشبوؤں سے ریاضِ شبلی میں غنچے کی طرح سرمستی وسرشاری کے ساتھ سینہ شگافی کے مزے لے رہے تھے۔

سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے ☆ کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

وہ بڑی عاجزی کے ساتھ مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں، اور میزبانی کے آداب میں ہر کوتاہی کے لئے انکساری سے معذرت بھی کرتے ہیں ادھر مہمانوں کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ایسی تواضع اور طعام کے اہتمام پر رشک کررہے تھے، ناچیز نے بھی آج تک کسی مذاکرے یا محفل میں قیام وطعام کے ایسے منظم منظر کا مشاہدہ نہیں کیا، دوپہر اور رات کے کھانے پر تقریباً کئی سو افراد طعام گاہ میں دورویہ دسترخوان پر تناول فرماتے، ہر مہمان کے لئے ایک طالب علم اور استاذ خدمت پر مامور ہوتا، پرنسپل صاحب نے خوانِ نعمت کا خاص اہتمام کیا تھا جس میں ایک طرف شاہانِ شرقی کے آداب واہتمام کا خیال رکھا گیا تھا تو دوسری طرف مرغ وماہی اور نان ونمک میں نوابین اودھ کے خورد ونوش کے نفیس ذائقے شامل تھے، ان سے زیادہ خلوص وخدمت کا خاص خیال ملحوظ خاطر تھا، افتتاحی نشست کا ظہرانہ کشادہ سبزہ زار میں آم کے تناور درخت کے سایہ میں پیش کیا گیا، بور سے لدی شاخیں خوش آمدید کہہ کر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے پوری فضا کو مدہوش کررہی تھیں۔ حافظ شیرازی یاد آئے:

ہزار بادۂ ناخوردہ دررگِ آم ست

یعنی آم کی شاخوں میں شراب کے ہزاروں پیالے ابھی بھی محفوظ ہیں، غالباً شجرِ سایہ دار کا سمجھ بوجھ کر انتخاب کیا گیا تھا کھانے سے پہلے شرابِ فطرت کی اس ارزانی پر بھی نیم ہوش تھے، صبح کی افتتاحی تقریب میں جناب افتخار احمد اپنے فکر انگیز خطبۂ استقبالیہ میں شبلی شناسی پر اپنے منصوبوں سے آگاہ کرچکے تھے، جناب رجب نژاد کی طرح پروفیسر کبیر احمد جائسی نے شبلی کی پسندیدہ زبان فارسی میں خطاب کیا، پاکستان کے مقتدر پروفیسر ریاض مجید نے افتتاحی تقریب ادا کی، مذاکرے کے روحِ رواں ڈاکٹر شباب الدین ناظم تقریب ہی نہیں دانش گاہِ شبلی کے پیکرِ نیاز بنے رہے، ناچیز کو بھی اظہار خیال کے لئے طلب کیا گیا، جلوہ گاہِ شبلی میں آبروئے علم کی آزمائش سے گزرنا میرے

لئے آسان نہ تھا، کچھ کہہ سن کر صف سامعین میں بیٹھ گیا، یہاں بڑی عافیت تھی، دو دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، شہر کی سیاحت اور شبلی منزل کی زیارت کی سدھ بدھ نہ رہی، دارالمصنفین تیسرے دن حاضر ہوئے، آم کے درختوں کے درمیان یہ ایک منزلہ عمارت ہے، جو اسلاف کی علمی وراثت کا محافظ ہے، پیکرِ ہند میں اس کی حیثیت قلب کی ہے، ایک سرے پر رام پور ہے تو دوسری طرف عظیم آباد کا بے مثل ذخیرۂ کتب ہے، شاید ہی دنیا کے کسی مسلم ملک میں نوادرات کی یہ کثرت موجود ہو۔

مہمانوں کی آسائش کے لئے رضا کار طلبا و اساتذہ کی ایک جماعت ہمہ وقت موجود رہتی تھی شہر کے ذی علم سامعین اور شبلی کے نیازمندوں کے وفورِ شوق سے مہمان و مندوبین سبھی محوِ حیرت تھے، محسوس ہوا کہ پرنسپل صاحب نے ادارے کو اہالیانِ شہر سے وابستہ کر دیا ہے کیوں کہ ان کی نظر میں معاشرے سے گہری پیوستگی کے بغیر مدرسہ و خانقاہ ثمر بار نہیں ہو سکتے، انھوں نے دور دراز کے مضافات کے لئے بھی اس دانش گاہ کو ایک مرکز محسوس بنا دیا ہے، شبلی عرف عام میں فرد نہیں رہے بلکہ ادارے کی علامت بن چکے ہیں، یہ معمولی بات نہیں ہے، بہ قول شیخ عطار:

جاں نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں

علامہ شبلی کی بصیرت کو ڈاکٹر افتخار احمد نے محسوس کیا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے ان کی والہانہ وابستگی کافی ہے، بلادِ ہند کی جس سرزمین سے شبلی نے سروکار رکھا وہ ثقافت کے سرمایہ و ثروت سے گراں بار ہے، یہ سرزمین مذاہب عالم کے پنج گنج یعنی بدھ، اسلام، ہندو، جین، کبیر پنتھ کی وارث و امین ہے ان کے علاوہ دوسرے عقیدے بھی فروغ نظر حاصل کرتے رہے ہیں، یہ خطہ قدیم علم و ادب کا جولان گاہ رہا ہے۔ دین و دانش کے انسانی صحیفے بھی تخلیق کئے جاتے رہے ہیں، یہاں معبد و مسکن میں نور و سرور کی قندیلیں روشن ہوتی رہی ہیں، روحانی قافلوں کے قیام و وجود سے یہ زمین ہمیشہ دیدۂ انجم میں آسمان بنی رہی، شبلی کا انتخاب اعظم گڑھ بے سبب نہ تھا، آس پاس کی علمی خدمات کا مقابلہ برصغیر کا کوئی علاقہ نہیں کر سکتا، فصوالحکم کی شرح الٰہ آباد میں لکھی گئی، شمس بازغہ، تفسیر رشیدی، لطائفِ اشرفی، فتاوائے عالم گیری کے بیشتر مرتبین کسی نہ کسی عنوان جون پور سے تعلق رکھتے ہیں، گیتا کی شرح بنارس میں لکھی گئی، چندائن، کبیر گرنتھ، رامائن، پدماوت، اندراوت، رحیم خان خاناں کا

ہندوی کلام، سحر البیان، کلامِ حزیں و غالب کے ساتھ علمائے جون پور و مبارک پور کی خدمات کا محور یہی دیار ہے، مرثیہ کی رزمیہ شاعری بھی اسی جوار میں جواں ہوئی، مجلسوں میں ایک حلقے تک محدود اس صنف شاعری کو شبلی نے ہی تنقید کی تقدیس بخشی، اس شاعری کو محراب و منبر سے نکال کر شبلی نے اسے تخلیق کی بلندی و بزرگی سے آشنا کیا، اس صنف شناسی میں شبلی کا کوئی ہمسر نہ بن سکا سبقت نہ لے جانے کے لئے بزمِ شبلی میں اعتراف عجز کے ساتھ سرنگوں و سربہ سجود ہونا پڑے گا، اس علمی منظرنامے میں شبلی کے اپنے گھرانے کی علمی بازیافت ہی کیا کم ہے، مولانا فراہی اور مولانا فاروق، شبلی کی کشش کے لئے کافی تھے، ایک نظریے کے مطابق اردو ہندی کی ابتدا اسی دیار کی دین ہے، صوفیا کے سلسلوں کو دیکھئے کہ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، شطاریہ، مداریہ، رشد و ہدایت کے لئے مامور تھے، مولانا کرامت علی جونپوری کی دعوتی تحریک بنگال و برما تک پھیلی ہوئی تھی، یہ انگریزی اقتدار کے خلاف بھی نبرد آزما تھی، ادویت باد کے ویدانتی تصورات سے بھی فضا واقف تھی، مقلد و غیر مقلد کے ساتھ، بدھ مت، جین مت، رام بھگتی، کرشن بھگتی، آریہ سماج، برہمو سماج، کبیر پنتھ، مہدویت، شیعیت کو یہیں فروغ حاصل ہوا، عیسائیت کی تبلیغ و تبدیلی مذہب کی تحریک بھی جارحیت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، غالب نے مثنوی چراغِ دیر میں کاشی تا کاشاں کے سلسلے کا تذکرہ کیا ہے، اور ناقوسیوں کا مکہ کہا ہے پورے ملک کے جمہور باشندوں کی سب سے مبارک زیارت گاہ پریاگ و کاشی بھی اسی خطے میں آباد ہے، بدھوں کا بین الاقوامی مرکز سارناتھ یہیں ہے، سید سالار مسعود غازی کے طبل و علم کی داستانیں شہر و دیہات میں مہینوں دہرائی جاتی ہیں، نیز ملک کی بڑی آبادی کا مسکن بھی یہی علاقہ ہے، شبلی کی تصنیف و تخاطب کے لئے اس سے بہتر سازگار فضا نہیں ہو سکتی تھی، اس روشن ادارے کے لئے بھی امکانات کی یہ فضا میسر ہے، جس میں ممکنات کے جہانِ نو کی گنجائش ہے۔ اس مذاکرے نے اس امکان کو عملاً پیش کیا، ڈاکٹر عبد العزیز ساحر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے جواں سال استاذ اسلام آباد سے گرتے پڑتے آخری مجلس میں پہنچے، ناچیز نے اس مصرع کے ساتھ ان کا استقبال کیا: ؏ کعبہ میرے پیچھے ہے تو کاشی مرے آگے

ادارے کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے، جس کی جملہ ضرورتیں تقریباً

پوری ہو چکی ہیں، ضابطے کے مطابق شرائط کی تکمیل بھی ہو چکی ہے، انتظامیہ پوری جد جہد بھی کر رہی ہے، اسباب بھی پیدا ہو رہے ہیں، جمہوری سیاست کی نارسائیاں اور تنگ دلی نے رکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں، منصفانہ فیصلے کی ضرورت ہے، اقلیتوں کے آئینی حقوق کے تحت بھی اسے یونیورسٹی تسلیم کر لیا جانا چاہئے، جیسے کہ دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کو تسلیم کیا گیا ہے، علی گڑھ سے ڈھاکہ تک کوئی بھی قومی ادارہ اس کالج کا نہ حریف ہے اور نہ حلیف، تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کے درمیان یہی ایک ادارہ ہے جو آبروئے علم کے شان و شکوہ کا محافظ ہے اور مختار بھی، یہ افتخار کا اعجاز ہے اور ان کی حکمت و سعادت کا ثمر بھی، اس مرحلے پر صبر و شکر کر لینا بد توفیقی ہوگی تنگیِ داماں کو دور کرنے کے لئے مطالبے اور مجاہدے کی ضرورت ہے، فکر و عمل کے اختلاط سے ہی انقلاب آفریں نتائج پیدا ہوتے ہیں، یہی تاریخ و تمدن کا حاصل بھی ہے، اور ہم اسی ایثار و آزمائش کے لئے مبعوث بھی کئے گئے ہیں، اقبال نے الہامی آواز میں بشارت دی ہے:

تلاطم ہائے دریا سے ہے اس گوہر کی سیرابی

کانپور سے کلکتہ تک مسلم آبادی کا بڑا حصہ تقریباً پندرہ کروڑ انسانوں کی خواندگی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کم سے کم پانچ بڑی دانش گاہوں کی ضرورت ہے، دہلی میں تقریباً ایک کروڑ آبادی کے لئے چھ یونیورسٹیاں بنائی گئی ہیں، پندرہ کروڑ انسانوں کے لئے شبلی کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیئے جانے کا مطالبہ انتہائی معقول اور منصفانہ ہے، کالج کے سربراہ اور سرکردہ انتظامیہ کی آواز پر لبیک کہنا ہم سب کا فرض ہے، ایثار و اخلاص اور عزم کے ساتھ شریک ہونے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس ادارے کی نسبت علامہ شبلی سے ہے اور علامہ کی نسبت سیرتِ رسول ﷺ سے قائم ہے، جسے پڑھ کر ہمارے دماغ روشن اور قلب منور ہوتے ہیں۔

اس کالج کی تیز رفتار ترقی پر جتنی بھی تہنیت پیش کی جائے کم ہے اور سربراہ کو جتنی بھی دعا دی جائے وہ بھی کم ہوگی، اس شاندار عروج کے روبرو دوسرا منظر بہت توجہ طلب ہے، کالج کے احاطے سے ملحق شبلی کا شہرۂ آفاق ادارہ دارالمصنفین ہے جو کالج سے کہیں زیادہ معروف ہے، یہ شبلی کے منصوبوں کا دارالعمل ہے، اور حاصلِ عمر بھی ہے، یہ ادارہ فوری توجہ چاہتا ہے، انتظامی بصیرت کی سخت ضرورت ہے، نادر و نایاب ذخیرے کی حفاظت پہلی ترجیح چاہتی ہے۔ حیدر آباد اور لکھنؤ کے

بزرگ اس کی ترقی کے لئے موثر نہیں ہو سکتے، یہ شبلی کے ارمانوں کا مرکز ہے اور اب دیار غیر کا دست نگر بن گیا ہے، کیسا طرفہ تماشا ہے؟ اس کی حیثیت بس حاشیے پر رہ گئی ہے، نگہبانوں کی عدم توجہ سے علامہ کی پر شکوہ وراثت باقی نہیں رہ سکتی، انتظام وانصرام کے لئے انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے، نئے آئین اور نئی مجلس عمل کے بغیر تبدیلی ممکن نہیں ہے، مقامی طور پر اسے زیادہ سے زیادہ خود مختار بنانے کی ضرورت ہے جو احباب اس ادارے میں ہمہ تن مشغول ہیں انھیں بہتر سہولتیں فراہم کی جائیں، کالج کے سربراہ اور انتظامیہ کے ارکان کو اس کی بہبود کے لئے موثر طور پر پہل کرنی چاہئے تاکہ دونوں ادارے ایک ربط باہمی کے ساتھ فروغ پائیں، شبلی سے متعلق سبھی ادارے ایک مرکزی نظام کے زیر اہتمام ہوں، بعض جبینوں پر شکن پڑنے کے اندیشوں سے بالاتر ہو کر اعظم گڑھ کے شہر و مضافات کے تمام باشندوں کو اس کی حفاظت اور فروغ کے لئے مشترکہ جدو جہد میں شریک ہونا چاہئے تاکہ شہر شبلی کو طلوع صبح مشرق سے پرنور کیا جا سکے، علامہ کی نظر میں یہ سواد اعظم صرف ان کا مولد و مسکن ہی نہیں ان کے وسیع تر منصوبوں کا دائرۂ عمل یا نقطۂ پرکار ہے، اس کی حفاظت اور ترقی کے لئے ہر پرستار شبلی کو پورے عزم کے ساتھ آگے آنے کی ضرورت ہے:

یاراں صلائے عام است گرمی کنید کارے

☆☆☆

اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی

(علامہ شبلی مرحوم کی آخری نظم)

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا

گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح وشام تھا

آخر گئیں جناب رسولِ خداؐ کے پاس
یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذنِ عام تھا

محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض
واپس گئیں کہ پاس حیاء کا مقام تھا

پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے
کل کس لئے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا

غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منھ سے کہہ سکیں
(حیدر) نے اُن کے منھ سے کہا جو پیام تھا

ارشاد یہ ہوا کہ غریبان بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا

میں اُن کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا

جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں
میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا

کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا

خاموش ہو کے سیدۂ پاکؓ رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

☆☆☆

ALLAMA SHIBLI NOMANI

(MANVIYAT KI BAZYAFT)

By

Dr. Shababuddin

Head

Department of Urdu

SHIBLI NATIONAL P. G. COLLEGE

Azamgarh-276001, (U.P.)

PRINT ART Delhi Ph.: 23634222, Fax 23514266